شعبہ تعلیم بالغان دارالعرفان

ہشت روزہ
کورس

شعبہ نشر و اشاعت

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ دارالعرفان ○ منارہ ○ ضلع چکوال ○ پاکستان

www.QuranTafseer.net

الحمدللہ کوشش کی گئی ہے کہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے حوالے سے تمام کتابیں اور آڈیو ویڈیو بیانات کو آپکی سہولت کے لیے ایک جگہ پر اکٹھا کر دیا جائے اور تازہ جمعہ بیانات بھی آپ فوراً سن سکیں۔ ویب سائیٹ کی اینڈرائیڈ ایپلیکیشن بھی موجود ہے

آپ اپنے اینڈرائیڈ موبائل میں پلے سٹور سرچ میں جا کر نیچے دیئے گئے الفاظ لکھ کر آسانی سے یہ ایپلیکیشن سرچ کر کے انسٹال کر سکتے ہیں۔

اس ویب سائیٹ اور ایپلیکیشن سے آپ یہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

1- مفسّر، مترجم و مفکّرِ قرآن حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمۃ اللہ علیہ کی آڈیو، وڈیو اور تحریری تینوں طرح کی مکمل 30 پارہ اردو تفسیر اور مکمل 30 پارہ پنجابی تفسیر آڈیو وڈیو۔ 2- مشکوٰۃ شریف احادیث کی تشریح آسان ترین انداز میں آڈیو اور وڈیو بیانات۔ 3- اگر آپ کو قرآن ناظرہ پڑھنا نہی آتا یا آپ نے قرآن پڑھنا بہت پہلے سیکھا مگر اب صحیح تلفظ سے نہی پڑھ سکتے تو اب آپ دس دس منٹ کی کچھ وڈیوز دیکھ کر ناظرہ قرآن روانی سے پڑھنا سیکھ سکتے ہیں۔ 4- اس زمانہ کے سب سے مشہور 4 قاری صاحبان قاری مشری صاحب قاری السدیس صاحب قاری عبدالباسط صاحب اور قاری عادل الکلبانی صاحب کی آواز میں پورے قرآن کی آڈیوز سن سکتے ہیں۔ 5- حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمۃ اللہ علیہ کا نعتیہ کلام 6- ذکر کرنے کا ایسا طریقہ جس سے آپ کا دل اور جسم کا ہر ذرہ اللہ کا ذکر کرنے لگے مکمل تفصیلات موجود۔ 7- پچھلے دس سال کے سالانہ اور ماہانہ روحانی اجتماعات آڈیو وڈیو بیانات کا خزانہ 8- اسلامی سوال جواب ٹی وی پروگرام المرشد کی تمام آڈیوز وڈیوز۔

9- سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کی تمام کتابیں اور 1981 سے آج تک کے تقریباً تمام المرشد میگزین پی-ڈی-ایف میں ڈاؤن لوڈ کے لیے موجود۔ جلسوں، جمعہ بیان، سالانہ، ماہانہ اجتماعات کے بیانات کی تازہ آڈیوز فوراً ایپلیکیشن اور ویب سائیٹ پر آپ سن سکتے ہیں۔ آئی فون، ونڈوز موبائل اور کمپیوٹر والے حضرات یہ سب کچھ اوپر دی گئی ویب سائیٹ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

آپ کی سہولت کے لیے سلسلہ کی کوئی بھی کتاب یا کسی بھی پارہ کی تفسیر پی-ڈی-ایف میں آپ کو اپنے وٹس ایپ پر چاہیے ہو تو اس نمبر پر کتاب کا نام یا پارہ نمبر بتا کر اپنے وٹس ایپ سے میسج کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ 03235205255

شعبہ تعلیم بالغاں دارالعرفان

ہشت روزہ
کورس

شعبہ نشر و اشاعت

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ دارالعرفان ○ منارہ ○ ضلع چکوال ○ پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کافر دنیا میں محض اس لئے موج کر رہا ہے کہ مسلمان نہیں رہے نبی اکرم ﷺ کی غلامی کا حق ادا کرنے والے دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔ اللہ کو کیا ضرورت ہے کہ ایک بدکار کو دوسرے بدکار پر فتح دے۔

شعبہ تعلیم بالغان ..... دارالعرفان منارہ ..... ضلع چکوال ..... پاکستان

ہشت روزہ کورس

قرآن کریم	ایمانیات	۶
	عبادات	۴
	معاملات	۴
	اخلاق	۲
	کل	۱۶اسباق
احادیث	۴۰ احادیث مع ترجمہ اور تشریح۔	۱۶اسباق
فقہ	تعلیم اسلام حصہ اول اور فقہ اور ہماری زندگی	۱۶اسباق
عربی	از نصاب برائے صقارہ نظام تعلیم۔	۱۴اسباق
		۱۶۲اسباق

کتب حوالہ
۱۔ قرآن کریم اور اسرار التنزیل
۲۔ احادیث کے اسباق از معارف الحدیث۔ مشکوٰۃ شریف اور راہ عمل
۳۔ فقہ اور ہماری زندگی
۴۔ تعلیم اسلام حصہ اول
۵۔ عربی نصاب برائے صقارہ نظام تعلیم

اسباق قرآن کریم

سبق نمبر۱: سورۃ الفاتحہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان رحم کرنے والے ہیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴿۲﴾

تمام خوبیاں اللہ کے لیے ہیں جو سب عالموں کے پروردگار ہیں۔ بڑے مہربان نہایت رحم کرنے والے ہیں۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳﴾ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ﴿۴﴾

انصاف کے دن کے مالک ہیں۔ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی کی مدد چاہتے ہیں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴿۶﴾

ہم کو سیدھے راستے پر چلایئے۔ ان لوگوں کے راستے پر جن پر آپ نے انعام کیا۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴿۷﴾

سوائے ان لوگوں کی راہ کے جن پر آپ نے غضب کیا اور نہ گمراہیوں کی۔

سورۃ فاتحہ قرآن حکیم کی سب سے پہلی سورت ہے۔ یاد رہے نزول قرآن اور ترتیب قرآن، یہ دو چیزیں ہیں۔ قرآن کریم چونکہ اللہ پاک نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم اور محفوظ رکھنے کا وعدہ فرمایا تو اس کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ قرآن کی ساری آیات کسی نہ کسی خاص واقعہ کے صادر ہونے پر نازل ہوئیں۔ اس کا فائدہ دو طرح سے ہوا، اس کی دو حکمتیں ہماری سمجھ میں آتی ہیں اس میں اور کتنی حکمتیں ہیں یہ اللہ کریم کے علم میں ہے۔ ایک حکمت یہ ہے کہ جو بات کسی واقعہ کے ساتھ مربوط ہو جاتی ہے جب وہ واقعہ یاد آتا ہے وہ بات بھی یاد آ جاتی ہے تو اس طرح سے ہر واقعہ کے ساتھ آیات کی تعیین ہو گئی کہ فلاں واقعہ پر فلاں آیت اتری تھی۔ دوسرا یہ فائدہ ہوا کہ ہر واقعہ نے آیت کے معنی مقرر کر دیے کہ واقعہ یہ ہوا تھا، مسئلہ یہ پیدا ہوا تھا اس کا اس آیت کریمہ سے جواب دیا گیا اور اس کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان معنوں میں اپنے شاگردوں کو سمجھایا اور صحابہؓ نے اس پر کس طرح عمل کیا اور حفظ قرآن کا فائدہ بھی دے گیا۔ کسی واقعہ کے ساتھ آیت کے مربوط ہونے نے اس کے معنی کی تعیین کر دی۔ قرآن کا نزول الگ بات ہے اور ترتیب قرآن الگ بات ہے۔ نزول قرآن واقعات کے ساتھ مربوط ہے۔ اس کی بہت سی حکمتوں میں سے دو حکمتیں یہ ہیں کہ واقعہ کی یاد آیت کی یاد کا سبب بن گئی اور واقعہ کے واقعات آیت کے

معنی مقرر کرنے کا سبب بن گئے۔

دوسری حکمت ہے قرآن حکیم کی ترتیب۔ اس پر بڑے اعتراض ہوتے ہیں لیکن یہ یاد رکھیے کہ قرآن جب نازل ہونا شروع ہوا تب ہی لکھا جانا بھی شروع ہو گیا اور اس کی بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ آپ نے سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایمان کے واقعہ میں اکثر پڑھا بھی اور سنا بھی ہوگا کہ جب وہ اپنی بہن کے گھر تشریف لے گئے تو اندر سے قرآن پڑھنے کی آواز آرہی تھی۔ جو صحابیؓ انہیں پڑھا رہے تھے ان کے پاس لکھے ہوئے اوراق پر قرآن حکیم موجود تھا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن نزول کے ساتھ ہی ضبط تحریر میں لایا جانے لگا۔ تو جب نزول کے ساتھ ہی وہ لکھا جانے لگا تو یقیناً اس کی ترتیب بھی اسی اللہ کے حکم سے بنی جس نے اسے نازل کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لکھنے کا حکم دیا۔ جو آیت کسی واقعہ پر نازل ہوتی تھی اس کا ربط اس واقعہ کے ساتھ الگ سے ہے لیکن اسے کہاں لکھا جائے گا یہ بھی اللہ کے حکم سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ فرماتے تھے۔

کچھ آیات مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں جو قرآن کے آخر میں ملتی ہیں، کچھ مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں یہ شروع میں ملتی ہیں۔ کچھ سفر میں، کچھ حضر میں، تیئس برس مسلسل نازل ہوتا رہا لیکن قرآن جس ترتیب سے اللہ کے علم میں تھا، جس ترتیب سے لوح محفوظ میں ہے، جس ترتیب سے رب اسے بندوں تک پہنچانا چاہتا تھا اسی ترتیب سے اللہ کے حکم کے مطابق اسے لکھا گیا۔

سورہ فاتحہ، فاتحۃ الکتاب ہے یعنی کتاب اللہ کا دروازہ ہے۔ اسے کتاب اللہ میں سبعاً من المثانی کا نام بھی دیا گیا ہے۔ یعنی سات وہ آیات جو بہت زیادہ پڑھی جاتی ہیں، بار بار پڑھی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے جب اللہ جل شانہٗ نے اسے کتاب کا دروازہ قرار دیا ہے تو یقیناً دُروازہ کھولنے سے اندر کے سارے حقائق کی ایک جھلک آدمی کے سامنے آجاتی ہے۔ تو یہ ایک طرح سے قرآن حکیم کا پورا نچوڑ اور خلاصہ بھی ہے۔

حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ فرمایا کرتے تھے کہ سارے قرآن کا حاصل سورۃ فاتحہ میں موجود ہے، سورۃ فاتحہ کا سارا حاصل **بسم اللہ الرحمٰن الرحیم** میں موجود ہے، بسم اللہ شریف کا سارا حاصل پہلی ب کے ایک نقطے میں ہے۔ اصطلاح لغت میں اسے تلبس کہتے ہیں یعنی لپٹنا، چمٹنا، ساتھ لگ جانا۔ تو یہ "ب" جو ہے یہ اسم کے ساتھ مل کر اس میں مدغم ہو گئی، تلبس ہو گیا۔ اس میں "ب" کو اور اسم کے "الف" کو الگ کوئی نہیں کرتا اور "ب" اور "سین" مدغم ہو جاتے ہیں۔ یعنی یہ اس طرح ملتی ہے کہ اسی کا حصہ بن جاتی ہے تو اسے باتلبس کہتے ہیں یعنی اس کے ساتھ لپٹ جانے والی، اس کا لباس بن جانے والی، اس میں فنا ہو جانے والی۔ تو آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ قرآن حکیم کا حاصل یہ ہے کہ بندہ اللہ کی ذات میں ڈوب جائے، فنا ہو جائے باقی نہ رہے، اللہ رہے، بندہ نہ رہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ یہ وہ آیتِ مبارکہ ہے جو قرآن حکیم میں ہر سورت سے پہلے لکھی ہوئی ہے۔ اس

بات میں مفسرین کی دو آراء ہیں۔ بعض کے نزدیک ہر سورت میں بسم اللہ شریف باقاعدہ نازل ہوتی تھی اور بعض حضرات کے نزدیک نزول تو اس کا ایک ہی بار ہوا لیکن اللہ نے یہ فیصلہ دے دیا کہ ہر سورت اسی سے شروع کی جائے گی۔ سورۃ توبہ بسم اللہ شریف سے شروع نہیں کی گئی اس لیے کہ بسم اللہ رحمت الٰہی کی نوید ہے اور سورت توبہ کی ابتدا ہی اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بدکار کفار یا مشرکین سے برأت سے شروع ہوتی ہے، بیزاری سے شروع ہوتی ہے، علیحدہ ہونے سے شروع ہوتی ہے اس لئے اس کے شروع میں بسم اللہ شریف نہیں دی گئی۔ بعض تراجم میں کچھ کلمات لکھے ہوئے ملتے ہیں اور وہ اس طرح کہ **اعوذ باللّٰہ من النار. اعوذ باللّٰہ من العذاب اللّٰہ** کہ اللہ کے عذاب سے پناہ چاہتا ہوں اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بسم اللہ کے قائم مقام پڑھے جائیں لیکن مفسرین کے نزدیک اس کی کوئی سند نہیں۔ اگر کوئی اس طرح سے پڑھتا ہے تو ایسا پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہاں اگر اسے پڑھنا ضروری سمجھا جائے تو وہ درست نہیں ہوگا کہ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ جہاں بسم اللہ نہ پڑھنے کا حکم ہے وہاں نہ پڑھنا ہی بہتر ہے۔

دینی حکم پر عمل کے بارے ہمیں ایک بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ مثلاً سفر میں ہیں تو کوئی کہے کیا فرق پڑتا ہے کہ چار رکعت پڑھ لیں۔ تو چار رکعت پڑھنے سے دو بھی ادا نہیں ہوتیں اس لیے کہ اللہ کا حکم ہی دو رکعت پڑھنے کا ہے قصر کرنے کا ہے۔ آپ نہیں کریں گے تو فرض ادا نہیں ہوگا۔ جیسے فجر کی دو رکعتیں ہیں اور کوئی کہے میں بڑا فارغ ہوں میں چار پڑھ لوں تو چار پڑھنے سے دو بھی نہ ہوں گی۔ مقصد خواہ مخواہ پڑھنا نہیں ہے مقصد یہ ہے کہ جو کرنے کا رب کریم نے حکم دیا وہ کیا جائے، جیسے کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے ویسے کیا جائے۔

یہ سورت شروع ہوتی ہے **بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○** اللہ کے نام کے ساتھ جو رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی ہے رحمان اور رحیم کا مادہ تو ایک ہے لیکن دونوں کا مفہوم جدا ہے۔ عربی میں فعلان کے وزن پر آنے والے تمام الفاظ وقتی اور لحاتی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ رحمٰن وسیع تر معنوں میں آتا ہے لیکن وہ معنے وقتی اور لحاتی ہوتے ہیں رحیم میں وہ وسعت نہیں ہوتی لیکن اس میں دوام ہوتا ہے۔ جس طرح رحمٰن کے وزن پر عطشان بہت زیادہ پیاسا۔ عطش پیاس کو کہتے ہیں۔ عطشان اگر کہیں گے تو بہت بڑی مراد ہوگی کیونکہ یہ مبالغے کا صیغہ ہے لیکن پیاس ہمیشہ تو نہیں رہتی، مٹ جاتی ہے۔ لیکن رحیم، حکیم اور علیم فعیل کے وزن پر آتا ہے۔ اب اگر کوئی حکیم ہے تو یہ اس کی صفتِ دائمی ہے، اگر کوئی علیم ہے تو اس کی صفتِ دائمی ہے، اگر کوئی کریم ہے تو اس کی صفتِ دائمی ہے اسی طرح رحیم دوام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

تو اس میں مفسرین نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمایا وہ یہ ہے کہ رحمٰن وسیع تر معنوں میں ہے اور رحمانیت کا اظہار عالم دنیا میں ہوتا ہے۔ دنیا میں اگر کوئی اس کی اطاعت کرتا ہے تو بھی روزی پاتا ہے، نافرمانی کرتا ہے تو بھی روزی پاتا ہے، گناہ کرتا ہے تو مہلت پاتا ہے، توبہ کرتا ہے تو قبولیت کا دروازہ کھلا پاتا ہے۔ زندگی کی بے شمار نعمتیں آنکھیں،

کان، حواس خمسہ، بے شمار مال و دولت، حکومت و اقتدار، اولاد اہل وعیال، دوست، یہ ساری چیزیں بدکار بھی، نافرماں بھی، منکر بھی، مشرک اور کافر بھی پاتا ہے اس لیے کہ یہ دنیا رحمانیتِ باری کا مظہر ہے۔ لیکن چونکہ دنیا ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے اس لیے یہاں رحمانیت کا اظہار فرمایا گیا۔ یہ رحمتِ الٰہی کا ایک پہلو ہے جس میں بہت زیادہ وسعت ہے ۔جس سے مومن بھی فائدہ اٹھاتا ہے، کافر بھی فائدہ اٹھاتا ہے نیک بھی فائدہ اٹھاتا ہے، بدکار بھی فائدہ اٹھاتا ہے۔ سورج اگر کسی نبی کسی صحابیؓ، کسی بڑے ولی اللہ کو تپش بخشتا ہے، روشنی دیتا ہے تو کافر و بدکار، فرعون و نمرود وہامان کو بھی دیتا ہے۔ یہ وسعت ہے رحمانیت کی۔ یہ رحمت الٰہی کا وہ پہلو ہے جسے رحمٰن یا رحمانیت کہا جاتا ہے اور اسی لیے کہا جاتا ہے "**الرحمن فی الدنیا ورحیم فی الاخرۃ**"، آخرت میں رحمت الٰہی ایمان کے ساتھ متعلق ہو جائے گی، ایمان کے ساتھ مشروط ہو جائے گی۔ ایمان والوں کے لیے تو اس میں پہلے سے بھی زیادہ فراوانی ہوگی، پہلے سے بھی زیادہ وسعت ہوگی، پہلے سے بھی زیادہ انعامات ہوں گے لیکن بغیر ایمان کے دنیا سے جانے والا اس سے قطعاً محروم ہو جائے گا۔ تو ان معنوں میں وہ اتنی وسیع نہ رہی جتنا اسی رحمت الٰہی کا وہ وسیع تر پہلو جس سے کافر و بدکار بھی مستفید ہوتے تھے، دنیا کی روزی پاتے تھے لیکن آخرت، اللہ کی رضامندی، آخرت کی روزی، آخرت کے انعام ایمان کے ساتھ مقید و مشروط کر دیے گئے۔ تو فرمایا گیا "**رحمن فی الدنیا و الرحیم فی الاخرۃ**" دنیا کے لیے رحمانیت ہے اور آخرت کے لئے رحیمیت ہے۔

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ ابتدا ہوتی ہے فنائے تام سے۔ فناء کہتے ہیں اپنی ذات کی نفی کرنا۔ کسی بھی شے کی نفی اس کی فناء ہوتی ہے۔ فرمایا **اَلْحَمْدُلِلّٰہِ** سب خوبیاں، سب کمال، صرف اللہ کے لیے ہیں سورج میں روشنی ہے یا چاند میں چاندنی ہے، ہواؤں میں روانی ہے یا بارش میں آب رسانی ہے، زمین پر روئیدگی ہے یا پھلوں میں مٹھاس ہے، پھولوں کی خوشبو ہے یا دنیا و آخرت کا رنگ و بو ہے، کوئی بھی نعمت ہے، میں ہوں میرا وجود ہے، میرا علم ہے، میری طاقت ہے، میری حکومت ہے، میری سلطنت ہے، میرا اقتدار ہے، میری دولت ہے۔ فرمایا تیرا کچھ بھی نہیں۔ جسے بھی تو کمال سمجھتا ہے جسے بھی تو خوبی سمجھتا ہے، وہ تیری ہے نہ کسی اور کی، صرف اللہ کی ہے۔

پھر **رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** ① اس لیے کہ سارے جہانوں کو سب کچھ اسی نے دیا ہوا ہے۔ تیرے پاس ہے میرے پاس ہے یا سلطان و امیر کے پاس ہے۔ کسی کے پاس علم ہے یا طاقت، دولت ہے یا ورع و تقویٰ ہے یا نیکی اور پارسائی تمام کمال بندے کے نہیں ہیں۔ پھول کی خوشبو پھول کی نہیں ہے، نظر پھول میں آتی ہے، کمال اس کا ہے۔ طاقت سلطان کے ہاتھ میں ہے لیکن ہے اس کی۔ کوئی خوبی کسی کے پاس ہے کوئی کسی کے پاس لیکن درحقیقت وہ اللہ کی ہے۔ اس لیے کہ وہ رب العالمین ہے۔ رب ہوتا ہے ہر وقت ہر شے کی ہر ضرورت پوری کرنے والا۔ جیسے اولاد کی تربیت ہوتی ہے کہ بتدریج اس کی ضروریات کو بالطریق احسن پورا کر کے اسے پروان چڑھانا۔ اللہ سارے جہانوں کا رب ہے، ہر شے کی ہر ضرورت ہر وقت پوری کر

کے اسے کمال کی طرف لیے جارہا ہے۔ تو جب سارے جہان کو سارے کمال بھی وہاں سے بٹ رہے ہیں تو پھر سب کے پاس جو کچھ بھی ہے، ادھار ہوا، سب کے پاس امانت ہوئی، ذاتی تو کسی کا کچھ بھی نہ ہوا۔ ساری خوبیاں صرف اللہ کی ہیں کہ وہ رب ہے سارے جہانوں کا۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴿۲﴾ دنیا میں اگر منکر کے پاس کچھ ہے تو اس کی رحمانیت کی عطا ہے، آخرت میں اگر کسی نیک اور صالح کے پاس کچھ ہے تو وہ اس کی رحیمیت کی عطا ہے۔ **مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ** ﴿۳﴾ وہ نتائج پیدا کرنے میں خود مختار ہے۔ یہ وہ ترجمہ ہے جو کہیں لکھا ہوا نہیں ہوتا لیکن یہ آیہ کریمہ کا مفہوم ہے، یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے۔ **یَوْمِ الدِّیْنِ** سے مراد جزا و سزا کا معین دن۔ لیکن جزا اور سزا کے دو اور رخ ہیں۔ ایک وہ جو فوراً ملتی ہے جیسے پانی پیتے ہیں، پیاس بجھ جاتی ہے لیکن اس کٹورے کا حساب میدان حشر میں بھی ہوگا۔ ہم گرمی سے، جنگل سے، صحرا سے آتے ہیں، راستے میں درخت ہے سایے میں کھڑے ہو جاتے ہیں فوراً سکون مل جاتا ہے یہ فوری نتیجہ ہے۔ لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کسی نے اس طرح کھڑے ہو کر سایے سے استفادہ تو کیا لیکن **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ** نہیں کہا تو پوچھا جائے گا کہ سایے کا لطف تو لے لیا مگر میرا نام لینا بھول گئے۔ سایہ پیدا کرنے والے کو یاد کرنا بھول گئے اتنا تو کہہ دیتے کہ تیرا شکر ہے میرے لیے سایہ بھی پیدا کر دیا۔ تو جس دن وہ نتیجہ ہوگا اسے **یَوْمِ الدِّیْنِ** کہتے ہیں۔ اس دن کا مالک اس لیے کہا کہ دنیا میں تو عارضی اور وقتی طور پر حکومت و سلطنت کے دعوے دار انسان بھی ہیں۔ کسی کو فرشتوں میں بڑی طاقت نظر آتی ہے، کوئی دنیا کو بڑا طاقت ور مانتا ہے، کسی کو دیوی اور دیوتاؤں میں بڑی قوت نظر آتی ہے، کوئی دریاؤں کے پانیوں اور سمندروں کی گہرائیوں اور بجلی کی طاقتوں میں بڑی قوت مانتا ہے۔ لیکن وہ دن ایسا ہوگا کہ کوئی غلطی سے بھی کسی دوسرے میں کوئی طاقت نہیں مانے گا کہ ہر کافر و مومن کہے گا کہ ساری حکومت صرف اللہ کی ہے۔ یعنی سلطنتِ باری کا ایسا اظہار ہوگا کہ بڑے بڑے منکر، فرعون جیسے کافر بھی پکار اٹھیں گے کہ ہم غلطی پر تھے حکومت و سلطنت صرف تیری ہے۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ﴿۴﴾ یہاں سورۃ فاتحہ نے بڑا خوبصورت موڑ لیا ہے، بندہ اللہ سے بات کر رہا تھا۔ اللہ! میں تیرے نام سے شروع کرتا ہوں۔ تو رحمٰن بھی ہے رحیم بھی ہے، سارے جہانوں کا پالنے والا بھی تو ہی ہے، جزا و سزا اور نتائج پیدا کرنا یہ تیری قدرت کاملہ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ تنہا تھا واحد متکلم تھا پھر ایک دم جمع کے صیغے میں چلا گیا۔ **اِیَّاکَ نَعْبُدُ** ہم سب تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ ایک بندہ ان سب میں خود کو شامل کر لیتا ہے جنہوں نے ازل سے لے کر ابد تک اللہ کے حضور سر جھکانا ہے۔ اس میں فرشتے بھی ہیں، حاملین عرش بھی ہیں، اس میں اللہ کے نبیؑ اور رسولؐ بھی ہیں، اس میں اللہ کے

برگزیدہ بندے، صحابہؓ، تابعین اور اولیاء اللہ بھی ہیں۔ جس کسی کا سر اللہ کی بارگاہ میں جھکتا ہے اس جماعت میں شامل ہے۔ اکیلے کی کیا حیثیت بنتی ہے، اس کا سجدہ کس قابل ہوگا، اس کی عبادت میں کتنا خلوص ہوگا، اچھا ہوگا یا کمزور ہوگا، اس میں کتنی خامیاں ہیں۔ تو اللہ نے یہ سکھایا کہ خود کو تنہا نہ رکھ، اس جم غفیر میں شامل ہو جا جو کبھی اللہ کی رحمت سے محروم نہیں رہتا، تو بھی محروم نہیں رہے گا۔ برستی بارش میں نکل جا فرمایا، کہہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ ' ہم سب تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اس ہم میں ہر وہ ہستی شامل ہے جس نے اللہ کی عبادت کی ہے۔

وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ④ اور ہم سب کو تجھی سے مدد کی توقع اور امید ہے۔ ہم اپنی ساری ضرورتیں، ساری حاجات صرف اور صرف تیرے سامنے رکھتے ہیں اس لیے کہ دینا صرف تیرا کام ہے باقی سب تو خود لینے والے ہیں، ہمیں کیا دیں گے۔ اس لیے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ہمیشہ بندے کو اللہ کی معرفت دیتے آئے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے دال روٹی کا وعدہ نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ نعرہ نہیں تھا کہ میں تمہیں روٹی دوں گا، کپڑا دوں گا، مکان دوں گا۔ نہیں بلکہ تمہیں اللہ کے حضور پہنچا دوں گا۔ فرمایا جوتی کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اپنے رب سے مانگو۔ تو جب ہم سب تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد بھی چاہتے ہیں تو ہم سب کو وہ سیدھا راستہ دکھا جو سیدھا تیری بارگاہ تک آتا ہے جس میں کوئی اینچ پیچ نہیں ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ⑤ ہمیں بالکل کھرا اور سیدھا راستہ دکھا۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ⑥ ان لوگوں کا راستہ جن پر ہمیشہ تیرے انعامات ہوتے رہے۔ ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ ان جیسا عقیدہ عطا فرما، ان جیسا عمل عطا فرما، ان جیسے کام کرنے کی توفیق عطا فرما۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ ' ایسے لوگوں کی راہ پر نہ چلانا جن پر تیرے غضب نازل ہوئے۔ ان گناہوں سے، ان غلط عقائد سے، ان برے کاموں سے مجھے بچا لے جن کے کرنے والوں سے تو ناراض ہو جائے۔ جن سے تو ناراض ہو گیا، جن پر تیرا غضب ہوا ان کے پاس تو باقی کچھ نہیں بچا۔

وَلَا الضَّآلِّیْنَ ⑦ اور ایسے لوگوں کی راہ سے بھی مجھے بچا لے جو رستہ ہی بھول گئے۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہے لیکن صورتیں دو ہیں۔ غضب کو دعوت دینے والے وہ لوگ ہوتے ہیں جو احکامِ الٰہی کا انکار کرتے ہیں۔ جیسے کوئی کہتا ہے میں نبوت کو نہیں مانتا، میں آخرت کو نہیں مانتا، میں اللہ کی کتاب کو نہیں مانتا، یہ ہوتا ہے مغضوب، جس نے غضبِ الٰہی کو دعوت دی۔ اس کی مثال مفسرین کے نزدیک یہودی ہیں جنہوں نے صاف انکار کر دیا کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانیں گے۔ اگرچہ ہمیں پتہ ہے کہ نبی علیہ السلام سچے ہیں لیکن ہماری قوم میں سے نہیں آئے اس لیے ہم نہیں مانیں گے، یہ مغضوب ٹھہرے۔ عیسائی مثال بن گئے گمراہی کی کہ انہوں نے عظمتِ الٰہی کا، اللہ کی کتاب کا، اللہ کے نبی علیہ السلام کی نبوت کا اقرار کیا لیکن

اپنے انداز سے۔ جس طرح اللہ نے ماننے کا حکم دیا تھا اس طرح نہیں۔ اپنی طرز کے اس میں راستے پیدا کر لیے کہ ہم اللہ کو جیسا وہ منواتا ہے ویسا نہیں مانتے بلکہ اپنی پسند سے مانتے ہیں۔ اللہ کے نبیؐ کو مانتے ہیں لیکن اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔ یہ ان کی پسند تھی، اللہ نے ویسا ماننے کا حکم نہیں دیا تھا۔ تو دین میں احکام کا انکار، ضروریاتِ دین کا انکار، غضبِ الٰہی کو دعوت دینے کے برابر ہے کوئی یہ کہے کہ میں مانتا ہی نہیں کہ نماز پڑھنا ضروری ہے۔ یہ ہے غضب کو دعوت دینا۔ لیکن کوئی نماز تو پڑھے لیکن اپنے ڈھب سے پڑھنا چاہے، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ویسے نہ پڑھے اور اگر وہ سمجھے کہ اس طرح زیادہ ثواب ہے تو یہ گمراہی ہے۔ جس طرح ہم نے اپنے جینے اور مرنے کے بہت سارے کاموں میں بہت سے رواجوں کو اپنا رکھا ہے۔ شادی میں یا کسی کی وفات پر بے شمار ایسی رسومات نظر آتی ہیں جو دین کا حصہ نہیں ہیں لیکن انہیں دین بنا لیا گیا ہے۔ اگر کوئی ان رسومات کو ترک کرے تو سمجھا جاتا ہے یہ اچھا مسلمان نہیں ہے، تو یہ گمراہی ہے۔ ان سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اللہ سے دعا بھی کی جائے اور اس کے ساتھ کوشش بھی کی جائے۔ خود تلاش کریں کہ کون کون سی چیزیں سنت ہیں، مامور بہ ہیں، ان کو اپنائیں۔ کتنی سنتیں ایسی ہیں جو لاعلمی میں عدم توجہی کی بناء پر ہم سے چھوٹ جاتی ہیں اور کتنے رواج اور رسومات ہیں جو ہم نیکی سمجھ کر اپنا لیتے ہیں اور وہ گمراہی کا سبب بن جاتی ہیں۔

تو یہ وہ جامع اور بہترین دعا ہے کہ جو بندہ نماز کی ہر رکعت میں سب سے پہلے پڑھتا ہے۔ باقی قرآن پڑھنے میں اجازت ہے کہ کہیں سے تین آیات پڑھ لے لیکن اس کا پڑھنا ضروری ہے، اس کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی۔ اس کی اتنی تاکید کی گئی ہے کہ اس سورت کو ہر نماز کی ہر رکعت میں پڑھنا ضروری ہے۔ چار فرائض پڑھ رہے ہیں تو آخری دو رکعت میں صرف یہی سورت پڑھی جائے گی۔ دوسری سورتیں چھوڑی جاسکتی ہیں لیکن اگر یہ چھوٹ جائے گی تو نماز نہیں ہوگی۔ اگلا سارا قرآن حکیم اس کا جواب ہے، اسی دعا کا جو ہمیں سورت فاتحہ میں رب العزت نے سکھائی۔ اس کے فضائل میں حدیث شریف میں وارد ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تھی تو شیطان خاک پر، مٹی میں لوٹ رہا تھا اور سر پر بھی خاک ڈالتا تھا کہتا تھا کہ جو مسلمان یہ الفاظ اللہ کے حضور کھڑا ہو کر کہے گا بھلا میرے قابو کب آئے گا، میں اس کا کیا بگاڑ سکوں گا۔

مزید مطالعہ کے لیے تفسیر اسرار التنزیل اور اکرم التفاسیر ملاحظہ فرمائیں۔

☆ ☆ ☆

سبق نمبر۲: سورۃ البقرہ

آیات ۱تا۱۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والے ہیں

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ ۚۖۛ فِیۡہِ ۚۛ ہُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ۙ﴿۲﴾

الٓـمّٓ۔ یہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں پرہیز گاروں کی راہنمائی کرتی ہے۔

الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَیۡبِ وَ یُقِیۡمُوۡنَ الصَّلٰوۃَ وَ مِمَّا

وہ جو غائب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کو قائم رکھتے ہیں اور جو ہم نے ان کو

رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ۙ﴿۳﴾ وَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ بِمَاۤ

نعمتیں دی ہیں ان میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں اس پر

اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۚ وَ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ؕ﴿۴﴾

جو آپ پر نازل کی گئی اور جو آپ سے پہلے نازل کی گئی اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

اُولٰٓئِکَ عَلٰی ہُدًی مِّنۡ رَّبِّہِمۡ ٭ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۵﴾

وہ لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور وہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَوَآءٌ عَلَیۡہِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَہُمۡ

یقیناً جن لوگوں نے کفر اختیار کیا انہیں آپ متنبہ کریں

اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾ خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ

یا نہ کریں برابر ہے کہ وہ ایمان لانے والے نہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے

وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّ لَهُمْ

اور ان کے کانوں پر (بھی) اور ان کی آنکھوں پر پردہ (پڑا ہوا) ہے اور ان کے لیے

عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝٧ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ

بڑا عذاب (تیار) ہے۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں ہم اللہ پر

وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝٨ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ

اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ ایمان نہیں رکھتے۔ اللہ کو اور مومنوں

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا

کو دھوکا دینا چاہتے ہیں مگر (درحقیقت) وہ سوائے اپنے آپ کے کسی کو دھوکا نہیں دے رہے مگر وہ

يَشْعُرُوْنَ ۝٩ ؕ فِىْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ

اس بات کا شعور نہیں رکھتے۔ ان کے دلوں میں مرض ہے

اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا

جسے اللہ نے اور بڑھا دیا ہے اور جھوٹ بولنے کی وجہ سے انہیں

يَكْذِبُوْنَ ۝١٠

دردناک عذاب ہوگا۔

یہ آیاتِ مبارکہ سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات ہیں اور پہلا رکوع ہے۔

اس دعا کا جو سورۃ فاتحہ میں تعلیم فرمائی گئی، فوری جواب عطا فرمایا گیا۔ اس کی ابتداء بسم اللہ کے بعد حروف تہجی الم سے ہوتی ہے۔ بعض حضرات نے ان کے معنی لکھے ہیں اور بعض حضرات نے یہ لکھا ہے کہ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ انہی حروف تہجی الف ب ج د سے یہ کلام بھی بنایا گیا ہے۔ یہ قرآن حکیم کا کھلا اعلان ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اس جیسا کلام کوئی نہیں بنا سکتا۔ تو یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ بھی وہی حروف تہجی ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ یہ ایسے الفاظ ہیں جن کے پڑھنے سے ہر مومن کو ان کا فائدہ جو قلبی یا باطنی اور قرب الٰہی کے لحاظ سے پہنچنا چاہیے، اسے پہنچ جاتا ہے۔ ان سے مراد کیا ہے۔ وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان بھید ہے **انہا سر بین اللّٰہ و بین رسولہ** بعض محققین کے نزدیک **راسخین فی العلم** جنہیں اللہ راسخ علم عطا کرتا ہے، انہیں اس بھید سے آگاہ فرما دیتا ہے، باوجود اس کے وہ سرِ الٰہی ہی رہتا

والرٰسخون فی العلم جنہیں اللہ راسخ علم عطا کرتا ہے، انہیں اس بھید سے آگاہ فرما دیتا ہے، باوجود اس کے وہ سرِّ الٰہی ہی رہتا ہے کہ کسی خاص بندے کو رب چاہے تو اس کا مفہوم بتا دے۔ عامۃ الناس کے لیے اس کی ضرورت نہ سمجھی گئی اس لیے وہ بتایا نہ گیا۔ اور جو اس کا فائدہ ہے اس کی تلاوت میں اللہ کریم نے مقرر فرما دیا وہ تلاوت کرنے والے کو مل جاتا ہے۔

ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ۔ فرمایا، مانگنے والے دیکھ تو نے لائحہ عمل مانگا، تو نے خطاؤں سے معافی چاہی، تو نے میری مدد کی درخواست کی، تو نے گمراہی سے بچنا چاہا تو تیرے ان سب سوالوں کا جواب یہ کتاب ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے کسی بھی جملے حرف یا لفظ میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر اس نے آئندہ کی خبر دی ہے تو وہ حرف بحرف سچ ہے اور اگر اس نے گذشتہ واقعات بیان کیے تو حرف بحرف سچ ہیں۔ اگر کسی کام کو کرنے کا طریقہ بتایا تو وہ صحیح ترین طریقہ ہے اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ صحیح نہیں ہوسکتا، یہ اس کتاب کی خصوصیات میں سے ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے اور جیسا کہ عام طور پر کہا جا رہا ہے کہ اسلام اور اسلامی قوانین فی الوقت قابل عمل نہیں ہیں، ہاں کسی زمانے میں بہت مفید تھے۔ تو یہ جملہ اللہ کی اس کتاب کے اس دعوے کی کھلی تردید ہے۔ یعنی اگر قابل عمل نہیں ہیں تو پھر تو یہ بات صحیح نہ ہوئی کہ اس کے کسی جملے میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں، شبہ تو دور کی بات ہے وہ قابل عمل ہی نہ رہے۔ حق یہ ہے کہ قرآن حکیم نے انسانی مزاج کی اور انسانی ضرورت کی اور ان کی تکمیل کے ذرائع کی حد بندی کی ہے۔ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ زمانہ بدل گیا۔ زمانہ بدلا نہ زمانے والے بدلے۔ چند چیزیں تبدیل ہوگئیں، زمانہ بھی وہی ہے اہل زمانہ بھی وہی ہیں۔ انسان کو آج بھی بھوک لگتی ہے، انسان کو آج بھی کپڑے کی ضرورت ہے، انسان کو آج بھی پیاس لگتی ہے، انسان آج بھی دوستی اور دشمنی کرنے میں ویسا ہی ہے جیسا پہلے دن تھا، انسان آج بھی محبت و نفرت کے وہی جذبات رکھتا ہے جو پہلے تھے۔ انسانی سوچ بھی وہی ہے، انسان کی طلب اور ضرورت بھی وہی ہے اور ان کی تکمیل بھی انہی چیزوں سے ہوگی۔ کیا آج پانی پیئے بغیر پیاس بجھ جاتی ہے یا آج کھانے کے لیے کوئی آسمان سے تحفے آتے ہیں؟ زمین آج بھی فصلیں اگل رہی ہے جو پہلے تھیں۔ بات ان ضرورتوں کے احساس اور ان کی تکمیل کے ذرائع کے تعین کی ہے۔ اسلام نے وہ ضرورتیں بدلیں اور نہ ان کی تکمیل کی خواہش اور ضرورت بدلی تو اسلام ناقابل عمل کیسے ہوگیا؟ بدلا کیا ہے! صرف یہ کہ پہلے سفر گھوڑے پر ہوتا تھا اب جہاز پر ہوتا ہے۔ تو مسافر کے جو احکام گھوڑے کی پیٹھ پر تھے وہ احکام جہاز کی نشست پر بھی ہیں۔ تبدیلی کیا ہوئی یہ چند چیزیں ہی بدل گئیں ناں۔ قرآن جب نازل ہو رہا تھا تو جنگ تلوار، تیر اور نیزے سے دست بدست ہوتی تھی۔ اب اٹامک (atomic) دور آگیا تو کیا ایٹم بم سے ان کو مارنا جائز ہوگیا ہے جو مغربی اقوام بے گناہ عورتوں اور بچوں کا قتل عام کر رہی ہیں؟ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام ایٹم بم سے بھی انہی کو مارنے کی اجازت دے گا جو لڑائی کے لیے میدانِ جنگ میں آئیں گے، تو پھر ناقابل عمل کیسے ہوگیا؟ اسلام عین قابل عمل ہے۔ لوگوں کی جو سوچ ہے وہ بے لگام ہوگئی ہے، مجھے یہ بتایئے کہ جو مظلوم عورتیں افغانستان میں قتل کی گئیں، جو معصوم

بچے کھلونا بم دے کر قتل کیے گئے، ان کا کیا قصور ہے؟ لڑائی میں اسلام محدود کرتا ہے کہ جو لڑے، اس سے لڑنے کی اجازت دیتا ہے۔ تو اس لیے وہ نا قابل عمل ہو گیا؟ انسانی وجودوں کو درندگی دے کر اور ساری اخلاقی حدود و قیود پامال کر کے لوگ اسے جدید معاشرت کہہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں اسلام اس میں قابلِ عمل نہیں ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ اسلام تمام تر انسانوں کے لیے ہے، ہمیشہ کے لیے ہے، دائمی ہے، ہر عہد میں، ہر ملک میں، ہر قوم میں قابل عمل ہے۔ قوموں کے رنگ بدلتے ہیں، قوموں کے قد بدلتے ہیں، قوموں کی زبان بدلتی ہے، قوموں کی سوچ بدل سکتی ہے لیکن روح و بدن کی ضروریات نہیں بدلتیں۔ قرآن نے اس پہلو سے رہنمائی فرمائی اور فرمایا۔

یہ وہ کتاب ہے جس کی کسی بات میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اور جو نہیں مانتا وہ بھی پرکھ سکتا ہے کہ قرآن نے جو پیش گوئیاں کیں، وہ حرف بحرف درست ہوئیں۔ تو جس کی آئندہ کی بات حرف بحرف صحیح ہوتی ہے اس نے جو گزشتہ کی بات کی ہے وہ کیسے غلط ہو سکتی ہے۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ اس سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے تقویٰ چاہیے، اللہ سے رشتہ چاہیے۔ اس بات پر یقین چاہیے کہ میں بندہ ہوں، میرا ایک مالک ہے اور یہ کتاب اس مالک نے مجھے ایک نظام الاوقات یا ایک لائحہ عمل عطا فرمایا ہے اور مجھے اس کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اگر یہ کیفیت نصیب ہو تو یہ رہنمائی کا حق بھی ادا کر دیتی ہے۔ لیکن اگر اسے Just a book یعنی محض ایک کتاب سمجھ کر پڑھیں کہ چلو دیکھیں اس میں کیا ہے، تو آپ کو معلومات تو فراہم کرے گی لیکن رہنمائی نہیں کہ آپ رہنمائی کے طالب ہی نہیں ہیں۔ رہنمائی کی طلب اس بندے میں ہو گی جسے یہ یقین حاصل ہو جائے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم برحق ہیں سچے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جو بات اللہ کے بارے بتاتے ہیں وہ بھی سچ ہے جو کتاب کے بارے بتاتے ہیں وہ بھی سچ ہے۔ اور جو یہ دعا مانگے کہ اے اللہ! اب میں تیری عظمت کو قبول کر چکا اب تو میری رہنمائی فرما تو اس کے لیے قرآن کتاب ہدایت ہے، اس کی رہنمائی کا حق ادا کر دیتی ہے۔ زندگی کے ہر معاملے اور ہر سوال کا جواب عطا کرتی ہے۔ گدا سے لے کر شہنشاہ تک، سیاسیات ہوں یا اخلاقیات ہوں، ایمانیات ہوں یا اعمال، ہر پہلو پر رہنمائی کا حق ادا کرتی ہے لیکن لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲ صرف اس کے لیے جو اس سے رہنمائی چاہے۔

متقی کون ہوتے ہیں فرمایا: الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وہ لوگ جو برزخ اور آخرت کے کھل جانے سے پہلے اسے مان چکے ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب موت آتی ہے، آخرت واضح ہو جاتی ہے یا جب قیامت قائم ہو گی تو ہر چیز سامنے ہو گی پھر تو ماننا ہی پڑے گا، لیکن وہ سب ابھی تو انسانی عقل کی رسائی سے دور ہے۔ نبی علیہ السلام کی صداقت پر یقین کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے سے مان لینا غائبانہ ایمان ہے۔

پھر وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳ اور ماننے کا حق یہ ہے کہ مِمَّا جو کچھ رَزَقْنٰهُمْ ہم نے انہیں دیا ہے۔ رزق میں علم بھی ہے، اس میں طاقت بھی ہے، اس میں حکومت و اقتدار و اختیار بھی ہے، اختیارات بھی ہیں، اس میں مال و دولت بھی ہے۔

جو نعمتیں، اللہ فرماتا ہے، میں نے انہیں دی ہیں **ھُمْ یُنْفِقُوْنَ**، ان سے استفادہ تو کرتے ہیں لیکن ان حدود کے اندر جو میں نے متعین کر دیں۔ کسی شے کو اس حد کے اندر خرچ کرنا جو اللہ نے متعین کر دی ہے، انفاق ہے خواہ وہ اختیارات کا ہو، اقتدار کا ہو، مال و دولت کا ہو یا اپنے علم اور تعلیم و تعلم کا۔ تو فرمایا جس طرح کی دولت بھی میں نے انہیں دی ہے، اسے ان حدود کے اندر رہ کر خرچ کرتے ہیں جو میں نے متعین کی ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی یا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کتابیں نازل کی گئیں، ان کی حقانیت کو تسلیم کرتے ہیں **وَبِالْاٰخِرَةِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ** ان کتابوں کی حقانیت پر یقین، ہمیں حساب کتاب پر، بعثت پر، مرنے کے بعد جی اٹھنے پر اور اٹھ کر اللہ کی بارگاہ میں جواب دینے پر یقین عطا کرتا ہے اور قیامت پر جب تک یقین محکم نہ ہو، آدمی عمل نہیں کر سکتا۔

جہاں فائدے کی امید نہ ہو ہم وہاں سرمایہ نہیں لگاتے۔ کہیں پہنچنے کی امید نہ ہو تو ہم سفر نہیں کرتے۔ کسی کو یہ کہہ دیا جائے کہ یہ گاڑی فلاں شہر نہیں پہنچے گی اس سے پہلے فیل ہو جائے گی، اس میں کوئی بیٹھتا ہے؟ تو کیا پھر کسی کو کہہ دیا جائے کہ سرمایہ لگاؤ اور یہ فرم ڈوب جائے گی، کوئی لگاتا ہے؟ تو جب تک آخرت کا یقین نہ ہو زندگی کا سرمایہ کوئی نہیں لگاتا۔ فرمایا یہ وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں پہلے آخرت کے ساتھ یقین ہو اور یہ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں کہ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔

عَلٰی ھُدًی مِّنْ رَّبِّھِمْ۔ رب اس ہستی کو کہتے ہیں جو ہر ضرورت کو پورا کرے اور ہدایت کا پہنچانا اور ہدایت نصیب فرمانا یہ اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے۔ اس لیے اس نے ہر بندے کے لیے نبیؑ مبعوث فرمایا خواہ وہ بندہ فرعون تھا یا ہامان، وہ متکبر تھا یا ظالم، قاتل، کافر تھا یا مشرک، اس نے ہدایت کو اس تک پہنچا دیا۔ اس نے اپنی کتاب، اپنا نبیؑ، اپنا پیغام اس تک پہنچایا۔ اور جن لوگوں نے قبول کیا انہیں اللہ کی طرف سے وہ دولت نصیب ہوگئی اور یہ فلاح پا گئے۔ فلاح قرآن حکیم میں لامحدود کامیابی کے معنوں میں آتا ہے۔ ذاتی مسائل میں، خانگی زندگی میں، اجتماعی زندگی میں، قومی زندگی میں، موت میں، آخرت میں، ہر جگہ کی کامیابی اس لفظ فلاح کے اندر آ جاتی ہے کہ انہوں نے وہ سب کچھ پا لیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اتنے اہتمام کے باوجود بھی جو لوگ کفر پر جمے رہے، **سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ**۔ اے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم! برابر ہے کہ اب آپ انہیں ان کے انجام بد کی خبر دیں یا نہ دیں **لَا یُؤْمِنُوْنَ** وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ کیوں نہیں لائیں گے؟ اللہ نے مہر کر دی ہے ان کے دلوں پر، ان کے کانوں پر، ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا اور ان کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے، بہت بڑا عذاب۔ سوال یہ کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اللہ نے دلوں پر مہر کر دی، کانوں میں پردے ڈال دیے، آنکھیں بند کر دیں اور عذاب مقدر کر دیا تو ان کا کیا قصور ہے؟ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلسل نافرمانی ان کا قصور ہے۔ بندہ جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ

نقطہ پیدا ہوجاتا ہے۔اگر توبہ کرتا ہے تو وہ صاف ہوجاتا ہے۔توبہ نہیں کرتا اور مسلسل گناہ کرتا ہے تو سیاہی بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ ایک وقت آتا ہے کہ وہ سیاہی سارے دل کو گھیر لیتی ہے۔یہ وہ حالت ہوتی ہے کہ اللہ کریم خفا ہو کر، ناراض ہو کر، اس سیاہی کو وہاں دائمی کر دیتے ہیں کہ اگر تجھے یہی پسند ہے تو اب میں تجھے ہدایت کے قریب بھی نہیں آنے دوں گا۔یہ سزا ہوتی ہے ان گناہوں کی، ان جرائم کی، جنہیں وہ زندگی بھر کرتے رہے۔اللہ کی دی ہوئی ان نعمتوں کے غلط استعمال کی جو اس نے انہیں استعمال کرنے کے لیے دی تھیں، اپنے دوسرے بندوں کو تباہ کرنے کے لیے نہیں۔اللہ نے انہیں حق دیا تھا زندہ رہنے کا لیکن دوسروں کی زندگی چھیننے کا نہیں۔اللہ نے بندے کو حق دیا ہے نعمتیں حاصل کرنے کا لیکن دوسرے سے چھیننے کا نہیں۔تو جو لوگ اس طاقت سے، اللہ کی دی ہوئی قوت سے، اللہ کے دیے ہوئے اعضاء و جوارح سے دوسروں کے حقوق چھینتے ہیں یا حقوق اللہ کو ضائع کرتے ہیں یا اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں تو محققین کے مطابق پہلے عبادات سے لذت سلب ہوجاتی ہے، توبہ نہ کرے تو عبادات چھوٹنے لگتی ہیں، پھر عبادات کی مطلق توفیق چلی جاتی ہے۔اس پر بھی اگر توبہ نہ کرے تو ایمانیات سلب ہو جاتے ہیں۔اور یہی وجہ ہے کہ آج کے دور میں ایک گھر میں اگر دس بندے ہیں تو دس مذہب اور دس عقیدے بھی چل رہے ہیں۔ہر چوتھے دن ایک نیا عقیدہ کیوں پیدا ہوجاتا ہے؟ آپ نے دیکھا! جس پتنگ کی ڈور کٹ جاتی ہے وہ کسی بھی جھاڑی سے الجھ سکتی ہے، کسی بھی درخت پر ٹنگی جا سکتی ہے، کسی بھی بچے کے ہاتھ میں آسکتی ہے۔تو یہ کٹی ہوئی پتنگیں ہیں۔بداعمالی اور گناہ کی وجہ سے جب اسلامی عقائد سلب ہو گئے تو برابر ہے وہ کسی جھاڑی سے الجھ گیا، اسے کسی نے اچک لیا، کسی دوسری نبوت کے چکر میں پھنس گیا یا کسی کذاب مدعی ولایت کے چکر میں پھنس گیا۔کسی گمراہ اور بدعتی کے چکر میں کوئی تب پھنستا ہے جب گناہ کرتے کرتے اس کی ڈور کٹ جاتی ہے۔کیا آپ نے دیکھا کسی ایسے بندے کو جو ورع وتقویٰ کی وجہ سے گمراہ ہوا ہو کبھی نہیں۔ہمیشہ نفاق اور برائی گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔

دوسری بات اس آیت کریمہ میں بڑی عجیب ہے کیونکہ یہاں وسعت مطلوب نہیں، مطلب سبقاً پڑھانا ہے تو ایک حد کے اندر رہنا پڑتا ہے۔ہاں ایک بات میں ضرور عرض کرنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی رب نے کچھ لوگوں کے بارے میں بتایا کہ ان کے اور میرے تعلقات اتنے بگڑ چکے ہیں، تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا تھا۔اللہ نے بتایا کہ ان پر محنت نہ کیجیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواہ مخواہ کلفت ہوگی، میں نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے۔اس کا مطلب ہے کہ ہر بندے کا ایک رشتہ اپنے رب کے ساتھ ایسا ہے جس سے صرف رب ہی واقف ہے یا خود بندے کو پتہ ہے۔شیخ ہے یا پیر، وہ آپ کی رہنمائی تو کر سکتا ہے لیکن رب کے ساتھ معاملہ آپ نے کرنا ہے۔وہ جب نبی علیہ السلام کو نہیں پتہ اور تب پتہ چلتا ہے کہ جب اللہ بتاتے ہیں تو وہ کسی دوسرے کو کسی کے حال کی خبر نہیں دیتا۔وہ بڑا ستار العیوب ہے اور بڑا غیور ہے، اپنے بندوں کو رسوا کر کے کبھی راضی نہیں ہوتا۔بندہ جتنا بھی خطا کار ہو، اللہ اس کی رسوائی پسند نہیں فرماتا کہ آخر وہ اس کا بندہ ہے۔تو

بندے کو اپنا معاملہ لوگوں کے ساتھ نہیں، پیر کے ساتھ نہیں، استاد کے ساتھ نہیں، رب العالمین کے ساتھ صحیح رکھنا ہوگا تب وہ ہدایت پر قائم رہ سکے گا۔ کوئی دیکھ رہا ہو یا نہ دیکھ رہا ہو، کوئی مانے نہ مانے۔ ہم کہتے ہیں بڑی محنت کی، کوئی مانتا نہیں، کیا تم نے منوانے کے لیے کی؟ ارے! اللہ کی اطاعت کی، وہ جانتا ہے کہ تم نے کتنی محنت کی۔ ماننے نہ ماننے کا اس نے دوسرے کو حق دیا ہے۔ نہیں مانتا تو اس کے پاس اس کا حق ہے، نہ مانے۔ آپ اسے مجبور نہیں کر سکتے۔ اسے اللہ کے پاس جانا ہے، وہ جانے اس کا رب جانے۔ اس کا حساب وہاں ہوگا۔ آپ نے جو محنت کی اللہ دیکھ رہا ہے۔

یوں جس طرح ہر بندے کا معاملہ مختلف ہے تو ہر بندے کے ذکر پر، عبادت پر، مختلف انوارات وارد ہوتے ہیں اور اگر مل کر ذکر کیا جائے تو وہ بڑا باغ و بہار گلدستہ بن جاتا ہے۔ کسی کے انوارات کسی نسبت سے (ہر ایک کی الگ نسبت ہے) اگر دس بندے مل گئے تو دس رنگ ہو گئے، اگر دس ہزار مل گئے تو دس ہزار رنگ بن جائیں گے۔ اور ایک یہ حکمت بھی ہے نماز باجماعت میں کہ ایک بندہ پڑھتا ہے تو ایک ہی نسبت کی رحمت آتی ہے، اگر پچاس مل کر پڑھ رہے ہیں تو۔ اللہ کے ساتھ ہر بندے کا اپنی قسم کا الگ رابطہ ہے۔ تو پچاس قسم کی رحمتیں نازل ہو رہی ہیں۔ بندے کو اپنے رب کے ساتھ معاملہ کھرا رکھنا چاہیے۔ فرمایا انہوں نے بگاڑتے بگاڑتے مجھ سے اتنی بگاڑ لی کہ اب ان پر بڑا سخت عذاب وارد ہوگا۔ اب انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بھی فائدہ نہیں دے سکتی۔ فرمایا یہ دو قسمیں ہیں ایک ماننے والے اور دوسرے محروم۔ ایک تیسری قسم بھی ہے وہ اس دوسری قسم سے بھی گئی گذری ہے۔ وہ زبان سے کہتے ہیں ہم اللہ پر ایمان لائے، آخرت کو مانا، لیکن حق یہ ہے کہ انہوں نے مانا نہیں۔ ان کی زندگی ایسی ہوتی ہے کہ اللہ اور اس کے بندوں سے مذاق کرتے ہیں۔ ان کا عمل، ان کا کردار، مذاق ہے۔ کلمہ بھی پڑھتے ہیں۔ یہ دعویٰ بھی رکھتے ہیں کہ اللہ کو مانتے ہیں لیکن جب ان کا کردار آپ دیکھتے ہیں تو یوں پتہ لگتا ہے جیسے اسلام تو کوئی شے ہی نہیں اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں بزعمِ خویش یہ بڑی دانش مندی اور عقل مندی کا کام ہے۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔ مومنین کو دھوکا دے کر، اللہ کو دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں، دل سے نہیں مانا۔ حرام ملتا ہے کھا لیتے ہیں، کہتے ہیں ہم مانتے ہیں بھئی مانتے ہو تو حرام کیوں کھاتے ہو۔ جھوٹ بول لیتے ہیں، کہتے ہیں ہم مانتے ہیں۔ جھوٹ بولنا بری بات ہے، بری بات ہے تو کیوں بولتے ہو۔ چوری کر لیتے ہیں، کہتے ہیں ہم مانتے ہیں۔ بھئی مانتے ہو تو کیوں کرتے ہو؟ مانتے ہو کہ زہر خراب ہے، کبھی کھایا؟ مانتے ہو کہ آگ سے جل جائیں گے، کبھی اس میں پاؤں رکھا؟ ماننا تو اس کا نام ہے۔ یہ تو مذاق ہے دین کے ساتھ کہ کہتے ہیں ہم مانتے ہیں اور ہر برائی کرتے ہو اور ہر غلطی کرتے ہو۔ جہاں سے روکنا ہے، وہیں جاتے ہو۔ یہ کیا ماننا ہے؟ فرمایا یہ دھوکا دینا چاہتے ہیں اللہ کو کہ دنیا میں عیش بھی کریں۔

شب کو مئے خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

فرمایا اللہ کے ساتھ دھوکا نہیں چلتا یہ لوگ تو بے وقوف ہیں۔

مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ ۔انہیں اپنے کردار کے نتائج بھگتنے ہیں، دعوؤں کے نہیں۔ یہ ایسے بے وقوف ہیں کہ محض کہنے پر نتیجہ مرتب سمجھتے ہیں۔ایک آدمی کہتا ہے میں نے کھانا کھالیا،کبھی اس کا پیٹ بھرتا ہے؟ کھائے گا تو بھرے گا۔اسی طرح جو کہتا ہے میں مومن ہوں اور ایمان پر عمل نہیں کرتا، فرمایا آخرت کو اسے پتہ چلے گا کہ میرا ایمان تو تھا ہی نہیں۔ جب تک عمل نہیں کرتا اس کا نتیجہ تو مرتب نہیں ہوتا۔تو یہ اللہ کو دھوکا نہیں دے رہے، نہ اللہ کے بندوں کو، ایسے لوگ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں کہ جب نتیجے کا وقت آئے گا تو خالی ہاتھ رہ جائیں گے اور ان میں اتنا بھی شعور نہیں کہ یہ اپنے ساتھ دھوکا کر رہے ہیں۔

فرمایا اصل بات یہ ہے کہ۔**فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ** ۔ان کے دلوں کو مرض لگ گیا، بیمار ہو گئے۔ بیمار نہ غذا ہضم کرتا ہے اور نہ مشقت اور محنت کرتا ہے، نہ کام کر سکتا ہے۔ان کے دل بیمار ہو گئے، نہ انہیں اللہ کی بات ہضم ہوتی ہے نہ انہیں تعمیل ارشاد کی توفیق ہوتی ہے۔ جب تک دل صحت مند نہیں ہوگا نہ قرآن وحدیث کی بات اس پر اثر کرے گی اور نہ اسے توفیق عمل ہوگی۔تو پتہ چلا کہ اصل شے جس کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔کہ ہر وجود میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے ''**اذا صلحت صلح الجسد کله** '' اگر وہ صحت مند ہو جائے تو پورا جسم صحت مند ہو جاتا ہے اور اگر وہ بیمار پڑ جائے یا اس میں خرابی ہو جائے تو سارے جسم کو تباہ کر دیتا ہے۔''**الا وھی القلب**'' خوب غور سے سن لو! یہ قلب ہے۔قلب ایک ایسی شے بندے کے سینے میں اللہ نے رکھ دی ہے کہ ایک تو یہ پمپنگ سٹیشن ہے، بدن کے ہر ایک جزو کی زندگی کا مدار خون کے اس قطرے پر ہے جو دل پمپ کر کے اور صاف کر کے پہنچاتا ہے۔دوسرے، دل کے اندر کوئی ایسی کیفیت اللہ نے رکھ دی ہے کہ اس میں سے جذبات اٹھتے ہیں۔خوشی کے،غم کے، دکھ کے، محبت کے، خواہش اور طلب کے، نفرت اور حقارت کے، تو اگر اس میں سے جذبات ہی صحیح اٹھیں تو سارا عمل صحیح ہو جاتا ہے۔ اگر اس میں سے نفرت اٹھے تو آپ محبت کیسے کریں گے۔اگر اس میں سے چوری کی خواہش اٹھے تو آپ دیانت داری کہاں کریں گے۔اللہ کریم فرماتے ہیں کہ یہ اپنے لب وگفتار کو سجاتے رہے، ظاہری ٹیپ ٹاپ میں لگے رہے، انہوں نے اچھے کپڑے پہن لیے، اچھے عہدے لے لیے۔لیکن انہوں نے خیال ہی نہیں کیا کہ اندر جو دل ہے وہ بیمار ہے اس میں مرض ہے۔اس کی اصلاح کیا ہے؟ فرمایا۔**الا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب**۔ جب تک دل خود اللہ کا نام لینا نہیں سیکھ جائے گا اسے صحت نصیب نہیں ہوگی اسے اطمینان نہیں آتا بے قرار ہی رہتا ہے تو فرمایا **فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ** ان کے دلوں میں مرض تھا اس مرض کی وجہ سے انہوں نے اور بد پرہیزی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا۔

فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۔جوں جوں بد پرہیزی کرتے گئے وہ مرض توں توں بڑھتا گیا۔**وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ** تو ان حقائق کے انکار کا بدلہ انہیں ایک دردناک عذاب کی صورت میں ملے گا جو بہت تکلیف دہ ہوگا۔کافر

سے زیادہ تکلیف دہ عذاب اس بندے کو ہوگا جو دعویٰ ایمان رکھتا ہے لیکن اسلام پر عمل کرنے کو تیار نہیں۔ یہ منافق ہے، دھوکا دینا چاہتا ہے احکام الٰہی کو، اللہ کے بندوں کو، اور یہ مذاق کرتا ہے دین کے ساتھ۔ کیا یہ مذاق نہیں ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ میں مانتا ہوں دین برحق ہے اور ہم اس پر عمل نہیں کرتے۔ تو اگر ایسا کیا جائے تو کیا یہ صورت مذاق کی نہیں ہے۔ یہ دھوکا دینے کی نیت نہیں ہے؟ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دھوکا اللہ سے نہیں، یہ دھوکا بندہ اپنے آپ سے کرتا ہے۔

دیکھیں معاشرے میں ہمارے روزمرہ ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ ہم سمجھ رہے ہوتے ہیں یہ بات ناجائز ہے۔ کوئی کہہ دے جائز ہے تو ہم کر لیتے ہیں۔ تو آپ سے کسی نے حساب بھی لینا ہے۔ میں نے کتنے معاملات نکاح وطلاق کے دیکھے ہیں۔ ایک آدمی طلاق دیتا ہے، اسے خود علم ہوتا ہے طلاق ہوگئی، میں نے دے دی۔ وہ کہتا ہے کوئی کہہ دے کہ طلاق واقع نہیں ہوئی تو ہماری صلح ہو جائے۔ کوئی کیوں کہہ دے۔ کل کس کے سامنے حساب دوگے۔ اللہ کے حضور تمہیں حساب دینا ہے، معاملہ رب سے رکھو۔ یہی حال اعمال کا ہے اور نماز روزے کا بھی۔ کوئی دیکھتا ہے، اچھا کہتا ہے، کوئی برا کہتا ہے۔ یہی حال تبلیغ کا ہے۔ کوئی مانتا ہے یا نہیں مانتا، ان نتائج سے بالاتر ہو کر اپنی ذمہ داری محسوس کر کے، دیانت داری سے اللہ کے حکم کی تعمیل کی جائے۔ نتیجہ کیا ہے یہ اس کا کام ہے، ہمارا کام نتائج مرتب کرنا نہیں ہے۔

مزید مطالعہ کے لئے سورت بقرہ آیات 8 تا 10 تفسیر اسرار التنزیل اور تفسیر اکرم التفاسیر ملاحظہ فرمائیں۔

☆ ☆ ☆

سبق نمبر۳: سورۃ البقرۃ

آیت الکرسی

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ

اللہ (ایسا ہے) کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ زندہ ہے ہمیشہ قائم رہنے والا ہے نہ اس کو اونگھ آتی ہے

وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ

اور نہ نیند۔ اسی کا ہے سب جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون

ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ

ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے ہاں سفارش کرے وہ جانتا ہے جو کچھ اس کے سامنے ہے

اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ

اور جو کچھ اس کے بعد ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی چیز کو احاطہ

عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ

علمی میں نہیں لا سکتے مگر جس قدر وہ چاہے۔ اس کی کرسی نے سب آسمانوں اور

الْاَرْضَ ۚ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

زمین کو اندر لے رکھا ہے اور اس پر ان دونوں کی حفاظت گراں نہیں گزرتی اور وہ عالی شان، عظیم الشان ہے۔

ہمارے اس سبق میں سورۃ البقرۃ کا وہ حصہ ہے جسے آیت الکرسی کہتے ہیں۔ کرسی کا ایک وجود بھی ہے بالائے عرش اور عموماً جو کرسی کا مفہوم ہوتا ہے اس سے مراد اختیار واقتدار ہوتا ہے۔ جس طرح عرفاً استعمال کیا جاتا ہے کہ فلاں شخص کرسی کا طالب ہے یا کرسی کے لیے محنت کر رہا ہے۔ تو اس سے مراد کوئی ایک خاص کرسی Chair نہیں ہوتی بلکہ اس سے مراد اختیارات اور اقتدار ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اللہ، ایسی عظیم ہستی ہے کہ اس کے علاوہ کسی بھی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کی عبادت کی جائے۔ عبادت صرف اور صرف اللہ کا حق ہے اس لیے کہ وہ اَلْحَیُّ ہے، مصدر حیات ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ زندہ ہے بلکہ وہ مصدر حیات بھی

ہے۔ ساری حیات اس کی ذات سے ہے، اس کی محتاج ہے، وہ کسی دوسرے کا محتاج نہیں۔ اور قیوم ہے، **الْقَیُّوْمُ** ہے یعنی ہر شے اس کے قائم رکھنے سے قائم ہے۔ کوئی بھی چیز، کوئی بھی وجود جو نظر آتا ہے، کائنات میں دوسرا نہیں ہے جو بغیر اس کی مدد سے اپنے آپ کو قائم رکھ سکے۔ وہ قائم رکھنے والا ہے۔ کوئی دوسرا وجود ایسا نہیں جو اپنا وجود ہی ثابت کر سکے کہ اس کے ثبوت کے لیے حیات چاہیے، تو اس کی حیات مستعار ہے۔ اور اصل مخزنِ حیات اللہ کی ذات ہے۔ تو جب حیات کا مقصد بھی وہ ہے اور ساری کائنات کا باعث قیام بھی وہ ہے تو پھر جو اس کے آسرے پر قائم ہے اس کے آسرے پر زندہ ہے، وہ عبادت کا مستحق نہیں بلکہ اس کی عبادت کا مستحق وہ ہے جو سب کو آسرا دیے ہوئے ہے۔ **لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ** ہر طرح کی کمزوری سے پاک ہے حتیٰ کہ تھکاوٹ، اونگھ یا نینداس پر غلبہ نہیں کرتی، اس کا گذر وہاں نہیں ہے۔ انسان کی کمزوری کے لیے اس کی ایک نیند ہی کافی ہے۔ اس کی احتیاج کے لئے نیند کا ایک لمحہ ہی کافی ہے جو اسے دوست، دشمن، بھلے، برے اور امیر غریب کی تمیز سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ ساری کائنات کو چھوڑ کر نیند میں ڈوب جاتا ہے۔ اللہ کو تھکاوٹ ہوتی ہے نہ اونگھ آتی ہے۔ کسی خامی، کسی کمزوری، کسی کمی کا اس کی بارگاہ میں گذر نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ارض وسماء میں، زمینوں آسمانوں میں جو کچھ ہے اس نے عدم سے پیدا کیا ہے۔ کسی کا اس میں کوئی ذرہ برابر حصہ نہیں۔ انسانی ایجادات اس کی پیدا کی ہوئی مختلف چیزوں کو مختلف نسبت سے جوڑنے کا نام ہے۔ کوئی نئی چیز انسان پیدا نہیں کر سکتا۔ گیسیں ہیں یا مادے ہیں، ایٹم ہیں یا ذرات ہیں، پیدا اس نے کی ہیں اور انسان کو یہ شعور دیا ہے کہ وہ مختلف چیزوں کو مختلف نسبت سے جوڑتا ہے تو ایک نئی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ نئی شے پیدا کوئی نہیں کرتا جو کچھ آپ کو کائنات میں نظر آتا ہے سب کا اکیلا مالک وہی ہے۔ تو جب سب مخلوق ہیں تو پھر کس کی جرأت ہے کہ وہ دوسرے کے حق میں سفارش کرے یا بولے یا زبان کھولے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ کون ہے جو اس کی بارگاہ میں کسی دوسرے کی سفارش کر سکے۔

اِلَّا بِاِذْنِہٖ ۔ سوائے ان ہستیوں کے جنہیں اس نے جس کے حق میں بولنے کی اجازت دی ہے۔ یعنی جو اس کا انکار کرتے ہیں، جن کی شفاعت اور سفارش نہ کرنے کا حکم اس نے دے دیا ہے، پھر بھلا کس کو جرأت ہے کہ ان کی سفارش کرے۔ سفارش بھی انہیں کی ہوگی جن کے لیے سفارش کرنے کی اس نے اجازت دی ہے اور وہی کر سکیں گے جن کو سفارش کرنے کی اجازت دی۔ اس کے ہاں سفارش بھی خود اس کی رضامندی کا نام ہے۔ اس لیے کہتے ہیں دعا بھی تقدیر ہے۔ یہ بھی اس نے فیصلہ کر دیا ہے کہ میرا فلاں بندہ فلاں کے حق میں ہاتھ اٹھائے گا تو میں اس کی خطا معاف کر دوں گا، اس کی بیماری دور کر دوں گا، اس کی تکلیف ہٹا دوں گا۔ کسی کی اس پر حکومت نہیں ہے۔ بندہ بندہ ہی ہے، کوئی اسے حکم نہیں دے سکتا۔ یہ اسی کے اپنے فیصلے ہیں اور اس کے قبضہ قدرت میں ہر شے ہے۔ اور لوگوں کو علم پر ناز ہے لیکن اللہ کے دیے ہوئے جو علوم ہیں ہر

ایک کے پاس ان کا ایک جزو ہوتا ہے۔ جس نسبت سے شہد کی مکھی پھولوں کا رس لے کر شہد بناتی ہے، انسانی علم اس کا متبادل پیش نہیں کر سکتا۔ آپ ایک سائنس کی لیبارٹری میں اسی شہد کا تجزیہ کرتے ہیں آپ سارے وہی وٹامنز اور سارے وہی اجزا اس میں پورے کر دیتے ہیں اور آپ شہد بناتے ہیں۔ (میں بھی لیتا ہوں کہ وہ ذیابیطس کے مریض کے لیے آتا ہے کہ اس میں شوگر نہیں ہوتی) مگر شہد کے سارے اجزاء ہوتے ہیں۔ لیکن ایمان سے کہیے کہ مکھی کا اور مشین کا شہد ایک جیسا ہوتا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ اس میں ساری چیزیں ہوتی ہیں۔ کسی بچے کو بھی چکھا دو تو وہ کہے گا نہیں! یہ تو آپ نے کوئی دوائی کھلا دی۔ تو فرمایا جتنا ایک مکھی کے پاس اختیار ہے تمہاری سائنس کے پاس تو ابھی وہ بھی نہیں ہے۔

آج کل کے لوگ بڑا زور لگاتے ہیں کہ جی سائنس نے پتہ لگا لیا ہے ماں کے پیٹ میں بچہ ہے یا بچی ہے۔ ارے اگر کتنے کروڑ انسان ایک دن میں پیدا ہونے تھے اور ان میں سے ایک کا ایکسرے کر کے آپ نے پتہ لگا لیا تو کیا کمال کیا۔ کیا آپ کو پتہ لگ گیا اس کی عمر کتنی ہوگی؟ آپ کو پتہ لگ گیا اس کی عقل کیسی ہوگی؟ آپ کو پتہ لگ گیا اس کی شکل کیسی ہوگی؟ آپ کو پتہ چل گیا وہ مومن ہوگا یا کافر؟ ارے کتنا کچھ باقی ہے۔ کیا پتہ لگ گیا۔

وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ۔ اس کے علوم کا تم احاطہ نہیں کر سکتے۔ کوئی ذرہ کسی ایک کو دے دیتا ہے، کوئی قطرہ دوسرے کو دے دیتا ہے۔ تو ان سمندروں میں سے اگر تمہیں کوئی قطرہ ملتا ہے تو اس پر کھڑے ہو کر اسی کے سامنے اکڑنا شروع نہ کر دو۔ تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ۔ وہ بہت بلند شان کا مالک ہے۔ اللہ بہت بڑا ہے تمہاری عقل و خرد اور تمہارے علوم کی رسائی سے بھی بڑا۔ تمہارے اندازوں اور تمہارے تخمینوں سے بھی بڑا۔ جسے نہ تمہارے اندازے سما سکتے ہیں اور نہ تمہارے تخمینے۔ یہاں ایک ہی بات ہے کہ تمہاری اطاعت اور تمہاری طلب اس کی بارگاہ میں شرف قبولیت پا لے۔

مزید مطالعہ کے لیے البقرہ آیت 255 تفسیر اسرار التنزیل اور اکرم التفاسیر ملاحظہ فرمائیں۔

☆ ☆ ☆

سبق نمبر ۴: سورۃ البقرۃ

آیت ۲۸۵ تا ۲۸۶

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ

رسول اللہ (ﷺ) اسی (کتاب) پر ایمان رکھتے ہیں جو ان کے پروردگار کی طرف سے ان پر اتاری گئی

وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ

اور ایمان والے بھی۔ سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر

وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا

اور اس کے رسولوں پر (اور کہتے ہیں) ہم اس کے رسولوں کے درمیان کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے اور عرض کرتے ہیں

سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

کہ ہم نے (آپ کا حکم) سنا اور ہم نے قبول کیا۔ اے ہمارے پروردگار! ہم آپ کی بخشش مانگتے ہیں اور آپ کی طرف ہی لوٹ کر جانا ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ

اللہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے جو (اچھا) کرے گا وہ اس کے لیے ہے

وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ

اور جو برا کرے گا اسی کو نقصان ہوگا اے ہمارے پروردگار! اگر ہم بھول گئے یا ہم سے خطا ہوئی تو

اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا

اس پر ہماری گرفت نہ کیجیے۔ اے ہمارے پروردگار! اور ہم پر بوجھ نہ ڈالیے جیسا آپ نے

حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا

ہم سے پہلوں پر ڈالا اے ہمارے پروردگار! اور جتنا بوجھ اٹھانے کی ہم میں

لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟

طاقت نہیں وہ ہم پر نہ ڈالیے اور ہمارے گناہوں سے درگزر فرمائیے اور ہمیں بخش دیجیے اور ہم پر رحم فرمائیے

اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

آپ ہی ہمارے مالک ہیں پس ہم کو کافروں کی قوم پر غالب فرمایئے۔

ان آیات مبارکہ پر،سورۃ البقرۃ کا اختتام ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔فرمایا کوئی مانے نہ مانے، میں نے بندے کو اس کا اختیار دیا ہے۔ دو اختیار رب العلمین نے دیے ہیں زندہ رہنے کا (اس لیے قتل کرنا سب سے بڑا جرم ہے کہ زندگی اس نے دی کسی کی زندگی چلی جائے تو ہم اس کا ایک لحہ بھی لوٹا نہیں سکتے تو پھر ہمیں کسی کی زندگی کا کوئی لحہ چھیننے کا بھی کوئی حق نہیں ۔قتل صرف اللہ کے حکم سے کیا جائے گا بندہ کسی کو قتل کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا) اور عقیدہ رکھنے کا اختیار وہ جو بندہ اپنی پسند سے اپنائے کوئی کسی دوسرے پر کوئی عقیدہ مسلط نہیں کر سکتا کہ اللہ نے پسند کا عقیدہ رکھنے کا اختیار دے دیا ہے۔اللہ نے انسان کو عقل دی، شعور دیا، دنیا کو درس عبرت بنایا، ہر شے میں اپنی عظمت کی نشانیاں رکھیں۔اس کے باوجود نبی مبعوث فرمائے، لائحہ عمل دیا، اپنی کتاب دی،اب اگر کوئی نہیں مانتا تو نبی علیہ السلام کو فرمادیا۔**لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ**''آپ کو ان پر داروغہ نہیں لگایا کہ ڈنڈے سے منوائیں۔''**اِنَّ اِلَيْنَآ اِيَابَهُمْ**'' میری مخلوق ہے اسے پلٹ کر میرے پاس آنا ہے **ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ** (سورت الغاشیہ 26-25) میں ان سے اپنا حساب کرلوں گا۔

تو فرمایا **اٰمَنَ الرَّسُوْلُ** اگر کائنات میں ایک بندہ بھی نہ مانے ،تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یقین ہی کافی ہے۔ رسول کا ایمان اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ کائنات کا ہر بندہ اگر ایمان سے محروم رہ جائے تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ دنیا پر ایمان نہیں ہے۔پھر وہ لوگ جنہیں رسول علیہ السلام کا اتباع اور تعلق اور نسبت نصیب ہوئی اور جنہوں نے میرے رسول علیہ السلام کے ساتھ میری عظمت کو مانا۔فرمایا مجھے سب سے منوانے کا شوق نہیں ہے اگر منوانا چاہوں، تو جو بنتے میرے حکم سے ہیں، جو پیدا میرے حکم سے ہوتے ہیں، جو مرتے میرے حکم سے ہیں، جو دیکھتے میری دی ہوئی نگاہ سے ہیں، چھین لیتا ہوں تو اندھے ہو جاتے ہیں، جو بولتے میری دی ہوئی گویائی سے ہیں، روک دیتا ہوں تو زبان رک جاتی ہے۔ان کا دل میری اجازت سے دھڑکتا ہے، روک دیتا ہوں تو رک جاتا ہے۔تو ان سے اگر میں حکماً منوانا چاہوں تو کیسے نہیں مانیں گے۔فرمایا!نہیں زبردستی کی ضرورت نہیں، میرا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کافی ہے یا میرے وہ بندے جنہوں نے میرے نبی علیہ السلام کا اتباع کیا۔اور یہ ماننے والے بندے ایسے ہیں کہ سارے کے سارے اللہ کو مانتے ہیں، اللہ کے فرشتوں کو مانتے ہیں، اللہ کی کتابوں کو مانتے ہیں، اللہ کے تمام نبیوں کی نبوت کو، رسولوں کی رسالت کو مانتے ہیں اور کہتے ہیں اے اللہ! ۔**لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ** ہم تیرے رسولوں میں سے کسی کی تفریق نہیں کرتے کہ یہودیوں کی طرح ان میں سے نصف کو مان لیں اور باقی نصف کا انکار کر

دیں یا عیسائیوں کی طرح کہ کچھ رسولوں کو اللہ کے بیٹے بنا دیں اور باقی کا انکار کر دیں۔ نہیں! تیرے سارے ہی انبیاءؑ جنہیں ہم جانتے ہیں وہ بھی سچے، جنہیں ہم نہیں جان سکتے وہ بھی سچے ہیں۔ جسے بھی تو نے مبعوث فرمایا وہ برحق تھا، جو کچھ انہوں نے کہا وہ بھی حق تھا۔ اور وہ سب سچے اور خالص اور کھرے تھے اور یہ کہتے ہیں اے اللہ۔

سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ہم نے سنا اور ہمارا عمل گواہ ہے کہ ہم نے مانا۔ یہ قابل توجہ ہے **سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا** (النساء:۴۶) نہیں کہا **سمعنا و اطعنا** فرمایا، ہم نے سنا اور ہم نے اس کی اطاعت کی۔ اسی سے محققین فرماتے ہیں کہ ایمان عمل کا نام ہے، ایمان ایک دعویٰ ہے، عمل اس کا گواہ ہے۔ اگر عمل غلط ہے تو اس دعویٰ کی صحت مشکوک ہو جائے گی۔ گواہ جھوٹا ہے تو دعویٰ ثابت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اسی لیے ارشاد ہوا **سمعنا** اے اللہ ہم نے سنا و **اطعنا** اور ہم نے اپنی کوشش کی اس کی اطاعت کرنے کی۔

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا ۔ ہاں انسانی کمزوریوں کی وجہ سے ماننے میں کمی رہ گئی، اطاعت کا حق ادا نہ ہوا، جس خشوع وخضوع سے کرنی چاہیے تھی وہ ہم حق ادا نہ کر سکے اور بہت سی کمزوریاں اور کمیاں، ہماری انسانی کمزوری کے سبب رہ گئیں، اس لیے ہم تیری ہی بخشش کے امیدوار ہیں۔ ''**غفرانک**'' ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما۔

وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۔ اس لیے کہ پلٹ کر تو تیرے ہی پاس آنا ہے۔ کہاں جائیں ہم، اپنی کمزوری کس کے پاس لے کر جائیں، ہم اپنی حاجت کہاں بیان کریں، ہم اپنے آپ کو کس بارگاہ میں پیش کریں۔ زندگی میں بھی موت میں بھی ہر چیز نے بھی تیرے پاس ہی آنا ہے اور اپنی امیدیں بھی تیرے پاس ہی لائی ہیں۔ دعائیں بھی تجھی سے مانگی ہیں، کمزوریوں پر پردہ بھی تو ہی ڈالے گا، خطاؤں کا بخشنا بھی تیرا ہی کام ہے۔ فرمایا اگر تم اس یقین کے ساتھ آؤ تو تم دیکھو گے جس بندے سے جو کام ہو نہیں سکتا میں اس سے کروانا ہی نہیں چاہتا۔ ہم نے بندوں کو خود پیدا کیا ہے، جس کو جس کام کرنے کی طاقت دی ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس کام میں وہ میری اطاعت کرے۔ میں نے ایک آدمی کو نظر ہی نہیں دی، میں اس سے نظر کا حساب نہیں لوں گا۔ ایک آدمی کو میں نے اٹھنے کے لیے ٹانگیں ہی نہیں دیں، تو میں اسے یہ نہیں کہوں گا کہ تو نے قیام کیوں نہیں کیا؟ نماز میں ایک آدمی کی استعداد سے ایک کام باہر ہے، اس کا محاسبہ نہیں۔ تم میری بارگاہ میں آئے ہو تو تمہیں یہ بتا دوں۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۔ میں بندے کو وہ بات، وہ کام، کرنے کا حکم دیتا ہوں جو وہ کر سکتا ہے۔ جب کر سکتا ہے، کرتا ہے تو پھر میرے حکم کے مطابق کرے۔ اور جو کر ہی نہیں سکتا، اس کے بارے میں پوچھوں گا ہی نہیں۔ دوسری بات یہ کہ میں کسی کے لیے کسی کو الزام نہ دوں گا۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ ۔ جو کوئی (اچھا) عمل کرے گا، اس کا صلہ پائے گا۔

وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۔ اگر غلطی کرے گا اس کا نقصان خود اس کو پہنچے گا۔ ہاں تمہارا کام یہ ہے کہ یہ بات دہراتے رہا کرو کہ ہم بہت اپنی طرف سے نیکیاں کرتے ہو، ان میں بھی بعض اوقات گستاخی ہو جاتی ہے۔ اپنی طرف سے بھلائی کرتے

ہوتو تمہاری عقل کے مطابق بھلائی ہوتی ہے جبکہ اس میں ہوتا نقصان ہے۔ کئی بندوں کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ ایک ڈاکٹر مریض کو صحت کے لیے ٹیکہ لگاتا ہے، صحت کے لیے گولی دیتا ہے، ٹیکہ سے Reaction ہو جاتا ہے، گولی کا اثر الٹ جاتا ہے۔ اس نے زندگی کے لیے دی، وہ مر جاتا ہے۔ یہ ڈاکٹر کے ساتھ نہیں ہوتا، یہ تمہاری زندگی میں بے شمار مس ہیپ (mishaps) ہوتے ہیں۔ اپنی طرف سے تم اسے نیکی سمجھ رہے ہوتے ہو، ہوتی خطا ہے۔ تو یہ کہتے رہا کرو کہ اے اللہ! تو تو واقف ہے۔

لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا ۔ اگر ہم سے بھول ہوتی ہے "**اَوْ اَخْطَاْنَا**" اگر ہم سے خطا ہوتی ہے، اگر ہم اپنے کم علم اور جہالت کی وجہ سے غلط کام کر بیٹھتے ہیں تو تو ہم سے درگزر فرما۔ ہر کوتاہی پر ہمیں پکڑ نہ لے، ہماری ہر غلطی پر روٹھ نہ جانا، ہمارے ساتھ وہ معاملہ نہ کرنا جو ہماری حیثیت ہے، وہ کرنا جو تیری شان کے لائق ہے کہ تو بھولتا بھی نہیں ہے تو غلط بھی نہیں کرتا، تجھ سے خطا کا بھی کوئی تعلق نہیں، تجھ سے بھول چوک کا بھی کوئی تعلق نہیں، تو ہمارے ساتھ معاملہ اپنی شان کے مطابق کر، ہماری حیثیت کے مطابق نہ کر۔ **رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا** اور اللہ! ہم کمزور ہیں ہم پر بوجھ مت ڈال۔ ہمارے لیے آسانیاں پیدا فرما۔ ہم نے اپنے آپ کو تیری بارگاہ میں پیش کر دیا، ہمیں توفیق عمل بھی تو ہی دے۔ ہم میں کچھ نہیں ہے اور ہماری خطاؤں سے درگزر بھی فرما اور پہلوں کی طرح پہلی امتوں کی طرح ہمیں سخت احکام نہ دے۔ پہلی امتوں میں بعض عام احکام بھی سخت تھے۔ مثلاً یہود کو کہہ دیا گیا کہ گوشت تو کھا سکتے ہو مذبح جانور کا لیکن چربی نہیں کھا سکتے۔ یا سینے کا گوشت کھا سکتے ہو پیٹھ کا نہیں کھا سکتے۔ عجیب عجیب باتیں ہو گئیں۔ اب دیکھیں ایک ہی جانور میں آدھے اجزاء حلال اور آدھے حرام ہو گئے تو یہ بہت سخت احکام تھے۔ فرمایا ان سے پناہ چاہو کہ بندے کی خطاؤں پر اس کے لیے احکام اس پر سخت کر دیے جاتے ہیں۔

اور تم پر اللہ نے یہ مہربانی کی کہ امت مرحومہ میں ہر کام میں آسانی پیدا فرما دی اور کلیہ ارشاد فرما دیا کہ تم سے جو نہیں ہو سکتا۔ میں تم کو اس کے کرنے کا حکم بھی نہیں دیتا۔ بات ہی ختم ہو گئی۔ اس کا حق ادا اس طرح سے ہوتا ہے کہ کم از کم اس کا شکر تو ادا کرتے رہو اور یہ کہتے رہو کہ اللہ ہم پر اس طرح سے بوجھ مت ڈالنا جس طرح ہم سے پہلی امتوں پر ڈالا گیا۔ مثلاً یہی رمضان کو لے لیجیے تو فرمایا ہر امت پر روزہ فرض تھا۔ آدم علیہ الصلوۃ والسلام سے لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پچھلی سب امتوں میں روزے کے اوقات یہ ہوتے تھے کہ مغرب کو افطار کیا، جب تک کوئی جاگتا رہا کھاتا پیتا رہا، جیسے سو گئے روزہ بند ہو گیا۔ خواہ آدھے گھنٹے بعد ہی سو گیا، خواہ آدھی رات کو جا کر سویا لیکن سونے کے بعد اٹھ کر نہیں کھا سکتا۔ عیسائی جو رکھتے ہیں، وہ اب بھی اسی طرح چوبیس گھنٹے کا روزہ ہوتا ہے۔ اسلام میں بھی ابتداً اسی طرح تھے۔

اللہ کروڑوں کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر۔ قرآن کے مثالی مسلمان۔ اللہ جل شانہ کے وہ بندے جنہیں سب سے پہلے رب العالمین نے خطاب فرمایا۔ اللہ کے وہ مقرب بندے، جنہیں براہ

راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شاگردی کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہ کوئی بڑے ہی عجیب لوگ تھے، بڑے خوش نصیب تھے اور ان کے صدقے تمام امت کے لیے بے شمار آسانیاں پیدا فرمائی گئیں۔ ان کا خلوص، ان کی جان نثاری، ان کی قربانیاں قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے آسانیاں پیدا کر گئیں۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ جو پیشے کے لحاظ سے مزدور تھے، دن بھر مزدوری کی شام کو گھر آئے۔ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں تھا، مزدوری کی اجرت نہیں ملی تھی۔ اہلیہ اس بات کی منتظر تھی کہ وہ لائیں گے تو سودا سلف آئے گا اور وہ لائے کچھ نہیں۔ فرمایا گھر کچھ کھانے کو ہے؟ نہیں تو پھر کچھ انتظام کرو۔ اس نے کہا میں کچھ کرتی ہوں، کہیں سے مانگ لیتی ہوں، کہیں سے لاتی ہوں۔ وہ چلی گئیں اور یہ لیٹے، اونگھ آئی ورآنکھ لگ گئی۔ جب وہ واپس آئی تو وہ سوئے ہوئے تھے۔ لہذا اب روزہ تو بند ہو گیا بغیر کھائے پیے۔ غریب آدمی تھے، اگلے دن پھر مزدوری پر چلے گئے۔ اجرت تو شام کو پھر نہ ملی۔ شائد یہ ہو کہ کام ختم ہو گا تو ملے گی۔ کام دو چار دن کا ہو گا ختم نہ ہوا ہو گا۔ بہر حال کسی وجہ سے کچھ بھی نہ لا سکے تو گھر آ کر پھر وہی صورت حال ان کی منتظر تھی۔ پھر بیچاری بھاگی دوڑی کہ کہیں سے کچھ پکڑ لاتی ہوں، آئی تو وہ سو چکے تھے۔ اگلے دن صبح کام پر گئے۔ تو بے ہوش ہو گئے دوپہر کو بات بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی، اللہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ۔

کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر ۔ یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی کہ سو جاؤ یا جاگتے رہو، اب فجر طلوع ہونے تک تمہیں کھانے پینے کی اجازت ہے۔ تمہارا روزہ قبول ہے۔ کیسے عجیب لوگ تھے، اور اللہ نے انہیں اتنا خلوص دیا تھا کہ انہوں نے جانیں دے دیں، تکلیفیں اٹھائیں، گھر بار لٹائے اور قیامت تک آنے والی امت مرحومہ کے لیے آسانیاں پیدا فرما گئے۔ تو فرمایا یہ دعا کرتے رہا کرو۔

یاد رکھیے! دین کو بوجھ نہیں بنانا چاہیے۔ دین میں جو پہلو رخصت کے اللہ نے دیے ہیں، جس طرح اللہ کے دیے ہوئے مشکل احکام کو ماننا سعادت مندی اور رضائے الٰہی کا سبب ہے، اسی طرح اللہ کی دی ہوئی رعایتوں سے فائدہ اٹھانا بھی سعادت مندی ہے۔ اور اگر ان سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو بعض اوقات بڑے تلخ نتائج سامنے آ جاتے ہیں۔ اگر ریاکاری ہو پھر تو ایمان تباہ ہو جاتا ہے۔ مخلصین پر دنیوی مصیبتیں ضرور آ جاتی ہیں۔ میں ایک دن حسین بن منصور ابن حلاجؒ کے حالات پڑھ رہا تھا۔ ایک عجیب واقعہ میری نظر سے گزرا کہ ایک دفعہ مکہ مکرمہ میں کوئی شیخ تشریف فرما تھے۔ انکے ساتھ ان کے شاگرد بھی تھے۔ ان کے کسی شاگرد نے عرض کی کہ حضرت یہاں کوئی صوفی ہے جو بہت مجاہدہ کرتا ہے۔ وہ حسین بن منصور ابن حلاجؒ تھے۔ جبل ابوقبیس پر مسجد بلال کے سامنے کی چٹانوں پر جا کر بیٹھ جاتے اور سارا سارا دن بیٹھے ذکر اور مراقبات کرتے رہتے اور اٹھ کر سایے تک جانے کا تکلف نہ کرتے۔ ان دنوں صحرائے عرب میں بہت سخت گرمی ہوتی تھی۔ سبزہ نام کو بھی نہیں تھا۔ آج کل وہ گرمی تو پچاس فیصد سے بھی کم رہ گئی ہے۔ جگہ جگہ پانی اور سبزہ ہو گیا ہے، وہ شدت نہیں رہی۔ اس وقت تو بہت شدید گرمی ہوتی تھی۔ شیخ نے کہا کہ چلیے زیارت تو کرتے ہیں، اور وہ اس کے ساتھ تشریف لے گئے۔ دوپہر کا وقت تھا، یہ چٹان پر بیٹھے ذکر میں مگن تھے، پسینہ ٹپک ٹپک کر چٹان میں جذب ہو رہا تھا، بخارات اڑ رہے تھے۔ شیخ نے فرمایا! یہاں سے بھاگ چلو! کیونکہ یہ شخص اللہ کی ابتلا کو دعوت دے رہا ہے۔ بھئی جب مسجد پاس ہے، سایہ موجود ہے تو یہ سائے میں کیوں نہیں بیٹھتا۔

دھوپ میں کیوں بیٹھا ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ یہ اللہ کی آزمائش کو دعوت دے رہا ہے، اپنی جرأت کا اظہار کر رہا ہے، اس پر کوئی بڑی سخت گرفت کی جائے گی یہاں سے بھاگ چلو۔ اور وہی ہوا، ان کی بات سچ نکلی کہ بالآخر حکومت نے ان کے قتل کا حکم دیا کہ پہلے ہاتھ اور پاؤں کاٹے جائیں، پھر سولی پر لٹکایا جائے جب مرجائے، تو اسے جلا کر دریا میں پھینکا جائے۔ چونکہ خلوص تھا، ایمان پر زد تو نہ آئی لیکن خواہ مخواہ رعایت سے روگردانی کی تو مشکلات بڑھا دی گئیں۔

اس لیے یہ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ ہم پر بوجھ نہ ڈال، نرمی کر، نرمی کا معاملہ فرما، ہم کمزور ہیں۔ ہم تیری رحمت کے امیدوار ہیں۔ ہم اپنی جرأت کا اظہار نہیں کرتے اور اس طرح کے مشکل احکام ہم پر نازل نہ فرما جس طرح کے پہلوں پر تھے۔

وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۔کوئی ایسی خدمت بھی ہم سے نہ لے جو ہم کر ہی نہ سکتے ہوں۔ ایسا بوجھ ہم پر نہ لاد جو ہم اٹھا نہ سکتے ہوں۔ **واعف عنا** ہم سے تو درگزر کا معاملہ فرما **وَاغْفِرْ لَنَا** اللہ ہمیں بخش دے۔ ہم تیری بخشش کے محتاج ہیں، ہمیں اپنے اعمال پر فخر نہیں ہے، ہمیں اپنے مجاہدے پر ناز نہیں ہے، ہمیں اپنی خوبیوں کا کوئی احساس نہیں ہے بلکہ ہمیں تیری بخشش کی امید ہے۔ ہماری کامیابی یہ ہے، ہماری ولایت یہ ہے، ہمارا علم یہ ہے، ہمارا جہاد یہ ہے، ہمارا سب کچھ یہ ہے کہ تو ہمیں بخش دے۔ ہمیں تیری بخشش چاہیے۔ **وَارْحَمْنَا** اور ہمیشہ ہم پر رحم فرما **اَنْتَ مَوْلٰنَا** سب کچھ تجھی سے اس لیے مانگ رہے ہیں کہ تو ہی ہمارا مالک ہے تیرے ساتھ ہی ہم نے عہد وفا باندھا ہے، تجھے نہیں چھوڑ سکتے۔ تیری ساری کائنات کو چھوڑ سکتے ہیں، تیری مخلوق سے منہ موڑ سکتے ہیں، تیرے بندوں کے سوا گزارا ہو سکتا ہے، حکومت و سلطنت چھوڑی جا سکتی ہے، گھر بار چھوڑا جا سکتا ہے لیکن تیری ذات سے منہ موڑنا یہ ممکن نہیں ہے۔ ہم تیرے ہی تو بندے ہیں تو ہی تو ہمارا مالک ہے۔ اور بار الٰہ جس طرح ہمیں اور مصیبتوں سے بچاتا ہے اسی طرح اپنے نہ ماننے والوں کو ہم پر مسلط نہ کر۔ ہمیشہ کفار کے مقابلے میں ہمیں فتح دے۔ ہمیں ان کے مقابلے میں رسوا نہ ہونے دینا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح دوسرے بہت سے اللہ کے عذاب ہیں، اسی طرح کفار سے شکست کھانا بھی مومن کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اگر بندے میں شعور ہو، احساس ہو تو کافر سے دب کر رہنا اور معاشرے میں کافر سے شکست خوردہ ہو کر رہنا اور کافر کا دست نگر ہو کر رہنا اور کافروں سے امیدوار کرم رہنا، یہ بات اسلام کے ساتھ زیب نہیں دیتی۔ لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ جہاں ہمارے سر جھکنے چاہیے تھے (اللہ کی چوکھٹ پر)، وہ چوکھٹ ہمارے سجدوں سے خالی ہے اور جہاں ہمارے سر بلند رہنے چاہیے، (کفار کے مقابلے میں) وہاں ہماری گردنیں جھکی ہوئی ہیں۔ عزیزو! قرآن حکیم ہمیں یہ درس دیتا ہے کہ اپنا ٹوٹا پھوٹا کمزور عمل بھی اللہ کے پاس لے جاؤ اے اللہ! تو میرا مالک ہے۔ یہ ٹوٹا پھوٹا بھی تو ہی قبول فرما۔ اس سے امیدوار کرم رہو اور اللہ کے نہ ماننے والوں کے سامنے اللہ کے بندے بن کر اور جرأت و ہمت سے زندگی گزارو۔ کافر سے دب کر رہنا عذاب الٰہی ہے، خلاف ایمان ہے، گناہوں کی سزا ہے۔ اپنے آپ کو اس جگہ لے جاؤ کہ کفر تم سے دبے نہ کہ تمہیں کفر سے دب کر جینا پڑے۔

مزید مطالعہ کے لیے البقرہ آیات 285 تا 286 تفسیر اسرار التنزیل اور تفسیر اکرم التفاسیر ملاحظہ فرمائیے۔

☆ ☆ ☆

سبق نمبر۵: سورۃ آل عمران

آیت ۱۹

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ

یقیناً اللہ کے نزدیک دین (حق) صرف اسلام ہے اور جن لوگوں کو

أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا

کتاب دی گئی انہوں نے اپنے پاس حقیقی علم آنے کے بعد آپس میں سرکشی کرتے ہوئے

بَيْنَهُمْ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ

اختلاف کیا اور جو اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرے تو یقیناً اللہ جلد

الْحِسَابِ ﴿١٩﴾

حساب لینے والے ہیں۔

اس آیت مبارکہ میں جو دوسرے پارے کے نصف سے شروع ہوتی ہے اللہ کریم نے پورا یقین دلاتے ہوئے حالانکہ اللہ کا ارشاد فرمادینا ہی یقینی ہے اس پر مزید تاکید کرتے ہوئے کہ انسان کا اپنا مزاج ہے کہ یہ سوچتا رہتا ہے کہ شاید یہی آخری بات ہے یا اس میں کوئی گنجائش ہے، اللہ کریم نے فرمایا۔

اِنَّ۔ پکی بات ہے۔ **الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ** زندگی کا وہ طریقہ وہ عمل وہ طرز حیات جس میں عبادت کے ساتھ مالک کی رضامندی کا تصور بھی شامل ہو اللہ کے نزدیک اسلام ہے اور صرف اسلام۔ اب ان لوگوں میں بھی اختلافات ہیں جن کی طرف نبیؑ مبعوث ہوئے جن کے پاس آسمانی کتابیں تھیں۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کی امت، یہود اور عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے کے دعوے دار نصاریٰ کہتے ہیں ہمارے پاس یہ آسمانی کتاب ہے اور وہ اختلاف بھی کرتے ہیں اور ان احکام سے بھی، ان نظریات سے بھی، ان عقائد سے بھی، جن کی طرف اسلام دعوت دیتا ہے۔ تو فرمایا بات دراصل یہ ہے کہ جہاں تک عقائد و نظریات کا تعلق ہے تو پہلے نبیؑ سے لے کر آخری نبی علیہ السلام تک اور پہلے نازل ہونے والے دین سے لے کر اس آخری دین تک سارے دین اسلام ہی ہیں سب کے عقائد ایک تھے، توحید باری پر سب متفق تھے، حشر و نشر پر سب متفق تھے۔ عذاب و ثواب سب کا عقیدہ تھا۔ فرشتوں کا وجود، آسمان، زمینیں، جنت و دوزخ، جتنے ضروریاتِ دین عقائد سے تعلق رکھتے ہیں وہ سب

میں ایک تھے اس لیے سارے ہی اسلام تھے جہاں تک احکام کا تعلق ہے تو وہ ہر قوم کے مزاج اس کے زمانے اس کے عہد اس کی استعداد کے مطابق اور اللہ اپنی پسند کے مطابق تبدیل فرماتا رہا تو اسے آپ اختلاف نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے کہ جو پہلی شریعتیں تھیں ان میں جو چیزیں حرام تھیں، اس وقت ان کا کھانا حرام تھا۔ اگر اسلام میں وہ چیز حلال ہوگئی تو مسلمان کے لیے اس کا کھانا حلال ہو گیا۔ اگر پہلی امتوں میں کوئی چیز مباح تھی، اس کا کرنا درست تھا اسلام نے اُس سے روک دیا تو اُس وقت وہ کام کرنا صحیح تھا، اور آج اس کا کرنا صحیح نہ رہا ہمیں ثابت کرنا ہے عقائد کو اوامر و نواہی کو، کرنے اور نہ کرنے کو، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت کرنا ہے کہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، وہ دین جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا۔

اب اختلافات کی بات ہو رہی تھی تو اس آیت کریمہ میں بھی وہ آ گئی۔ مسلمانوں میں جو اختلاف ہے وہ صرف یہ ہے کہ اپنی علمی استعداد کے مطابق کسی نے بہتر سمجھا اور اس نے دوسرے کا انکار نہیں کیا۔ جیسے میں عرض کر رہا تھا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے آدھے لوگوں نے راستے میں نماز ادا کر لی کچھ دوسروں نے بنی قریظہ پہنچ کر پڑھی اور دونوں نے معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا۔ دونوں نے ٹھیک کیا وہاں پہنچ کر نماز پڑھنے میں انہیں اتنا وقت لگ گیا کہ دوسرا گروہ اتنے میں نماز پڑھ کر پہنچ گیا اور دونوں اکٹھے مقابلے کے لیے صف آرا ہو گئے۔ مقصد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جو تھا وہ پورا ہو گیا۔ اسی طرح جو اختلاف ہے مجتہدین کا وہ اختلاف نہیں ہے، اسے اصطلاح میں اختلاف کہہ دیا جاتا ہے۔ مثلاً آمین کہنے پر سارے آئمہ متفق ہیں کہ جب نماز ہو رہی ہوتی ہے تو ولا الضالین کے بعد آمین کہا جائے اب بعض کے نزدیک یہ ہے کہ اگر زور سے مقتدی بھی آمین کہیں تو اس میں زیادہ ثواب اور زیادہ خوبی ہے اگر زور سے نہ کہیں تو بھی کوئی حرج نہیں دوسرے کے نزدیک آرام سے کہنا زیادہ بہتر ہے، لیکن اگر اس نے زور سے کہہ لیا تو غلط نہیں ہے، نہ وہ اُسے غلط کہتا ہے، نہ وہ اسے غلط کہتا ہے۔ معاملہ ہے ترجیح کا، زیادہ بہتر ہونے کا۔ حنفی یہ کہتے ہیں، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فتویٰ ہے کہ خاموشی سے دل میں آمین کہی جائے تو وہ زیادہ بہتر طریقہ ہے لیکن زور سے کہنا منع نہیں ہے۔ اور جو زور سے کہتے ہیں ان کے امام کا فیصلہ یہ ہے کہ زور سے کہنا بہتر ہے آہستہ کہنا منع نہیں ہے۔ یہی حال رفع یدین یعنی ہاتھ اٹھانے کا ہے کہ اہل حدیث حضرات یا بعض مالکی حضرات یا بعض دوسرے آئمہ کے مقلدین بھی ہر تکبیر پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ حنفی یہ کہتے ہیں کہ تکبیر اولیٰ پر ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں باقی تکبیروں پر ضروری نہیں ہے لیکن اگر کوئی اٹھاتا ہے تو گناہ نہیں کرتا۔ دوسرے آئمہ بھی یہ کہتے ہیں کہ وہ تکبیر اولیٰ پر بھی اٹھانے اور دوسروں پر بھی اٹھانے چاہیے لیکن اگر حنفی نہیں اٹھاتے تو کوئی حرج نہیں۔ یعنی فرق ترجیح کا ہے، کہ یہ طریقہ بہتر ہے، صحیح وہ بھی ہے۔ آئمہ میں صرف اتنا اختلاف ہے۔ آگے جو لڑائی پڑ گئی اللہ کریم فرماتے ہیں وہ ذاتی اغراض کی وجہ سے ہے۔ یہ نہیں کہ وہ نہیں جانتے تھے تو لڑ گئے نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔

یہاں جو باطل فرقے اسلام کے نام پر وجود میں آئے، بعض نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر تنقید کرنا شعار

بنالیا، بعض نے کتاب اللہ کا انکار کر دیا، بعض نے نئی نبوت کا اعلان کر دیا، بعض نے حدیث کی اہمیت کا انکار کر دیا اور بڑے بڑے علماء کی عمریں کھپ گئیں ان کا جواب دیتے دیتے۔ یہ تو ضروری تھا کہ جواب دیا جاتا لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ جواب ان لوگوں کو نہیں دیا گیا جنہوں نے یہ دعوے کیے یہ جواب سادے لوگوں کو بچانے کے لیے تھا کہ وہ ان کے دعوؤں میں پھنس نہ جائیں۔ مرزا کو آپ کتنے بھی جواب دے لیں، اس نے تو نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ یہ تو وہ بھی جان رہا تھا کہ وہ نبی نہیں ہے۔ آپ اور میں اسے نہیں سمجھا سکتے تھے کہ تم نبی نہیں ہو۔ یہ بات وہ بھی جانتا تھا لیکن اس کے نبی نہ ہونے کے دلائل لوگوں کے لیے دیے گئے کہ وہ اس کے اس جھوٹے دعوے میں پھنس نہ جائیں۔

علماء جو محنت کرتے ہیں اس کا محور بھی یہی ہے اور یہی بات اللہ کریم نے ارشاد فرمائی **وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ** یہ یہود و نصاریٰ نے جو اختلاف کھڑے کر دیے ہیں یہ اس لیے نہیں کہ وہ نہیں جانتے انہوں نے اس کے بعد یہ اختلاف پیدا کیے۔ **مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ** کہ جب ان تک حقائق پہنچ چکے۔ کیوں کیے **بَغْيًا بَيْنَهُمْ** بغاوت کر کے، اللہ کی نافرمانی کر کے، اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے اپنا پیٹ بھرنے کے لیے اپنے اقتدار کے لیے اپنی شہرت کے لیے اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنے کے لیے انہوں نے دین میں یہ ایجادات کیں۔

یہ جو ہم میں فرقہ بندی کی وبا پیدا ہو گئی ہے اس کی سمجھ یہاں سے آتی ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ نے بہت اچھی، بہت خوبصورت بات لکھی ہے کہ علماء کی پہچان اگر کرنی ہو کہ یہ اللہ کے لیے کام کر رہا ہے تو اس بات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب وہی کام کوئی دوسرا کرنے لگے تو اسے خوشی ہو۔ یعنی ایک آدمی کہتا ہے کہ میں جو کام کر رہا ہوں، یہ اللہ کے لیے کر رہا ہوں، میں کہتا ہوں میں ذکر کرا رہا ہوں اللہ کے لیے کرا رہا ہوں۔ اب کوئی دوسرا آدمی ایک طریقے سے ذکر کہیں کرا رہا ہے، مجھے پتہ چلے تو مجھے خوشی ہو کہ کچھ لوگ اگر مجھ تک نہیں پہنچے تو وہ انہیں اللہ اللہ تو بتا رہا ہے، اپنے طریقے سے سہی، لیکن اگر مجھے حسد پیدا ہو جائے تو اس کا مطلب ہے میں اللہ کے لیے نہیں کر رہا، اللہ کے نام کو اپنی شہرت کے لیے استعمال کر رہا ہوں۔ فرمایا علماء کی پہچان یہ ہے کہ جو کام دین کا وہ کر رہے ہیں، اگر دوسرا بھی کرنے لگے تو انہیں خوشی ہو تو پھر پتہ چلتا ہے کہ اللہ کے لیے کر رہے ہیں لیکن اگر اس کے ساتھ لڑ پڑے اور کہے ہمارا ہی حصہ ہے تو اس کا مطلب ہے وہ اللہ کے لیے نہیں اپنی شہرت کے لیے اللہ کے نام کو ذریعہ بنا رہا ہے۔ یہ یہود و نصاریٰ نے جو اختلاف کیا، یہ اللہ کے لیے نہیں تھا۔ ان کی کتابوں میں بھی دین اسلام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پیش گوئی موجود تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذاتی طور پر ان کے علماء جانتے تھے اور اتنا جانتے تھے کہ قرآن فرماتا ہے، اتنا جانتے تھے جتنا باپ بیٹے کو پہچانتا ہے۔

يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (الانعام:20) یعنی بھولنے کی کوئی بات ہی نہیں تھی اتنے، واضح اتنے روشن دلائل اور حلیہ مبارک تک۔ آپ کو یاد ہے، بیت المقدس کی فتح کے وقت نصرانیوں کے علماء نے شرط لگائی تھی کہ آپ اپنے امیر

کو لے آئیں، ہم دیکھ کر سمجھ لیں گے کہ یہ خلیفۂ دوم ہے اور اس کے ہاتھ پر شہر فتح ہونا ہماری کتاب میں بھی لکھا ہوا ہے۔ ہم لڑیں گے نہیں اور اگر وہ بندہ نہیں ہے تو ہم لڑیں گے۔ اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جب تشریف لے گئے اور انہوں نے دیکھا تو شہر خالی کر دیا کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات تو بہت بلند ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدام کے بارے بھی ان کے پاس حلیے، قد، عادات و خصائل اور لباس تک کی پیش گوئیاں موجود تھیں۔ پھر کیوں اس پر اختلاف کیا؟ فرمایا بغاوت کر کے، بدمعاشی کر کے، بے ایمانی کر کے۔

مسلمانوں میں بھی جو تفرقہ بازی ہے، ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگ رہے ہیں اور بات بات پر ایک دوسرے پر گولی چل رہی ہے، میں یہ سمجھتا ہوں اس میں للہیت نہیں ہے، اگر ہم میں للہیت ہوتی تو ایک بندہ اگر ایک کام غلط ہی کر رہا ہے اور خلوص سے کر رہا ہے تو دوسرا اسے پیار سے سمجھا بھی سکتا تھا۔ اور اگر وہ خلوص سے کر رہا ہے تو وہ اس کی بات سن بھی سکتا تھا۔ یعنی آپ اندازہ کریں کہ مسلمانوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے پر لڑائی ہوتی ہے، صلح کس بات پر ہوگی؟ یعنی اگر مسلمان قوم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے پر لڑتی ہے تو پھر بتائیے اس کے پاس اتفاق اور صلح کا موقع کونسا ہے اگر ایک بلند آواز سے پڑھ رہا ہے، آپ سمجھتے ہیں یہ صحیح نہیں ہے تو کم از کم درود تو پڑھ رہا ہے، لڑنے کی اور اسے کافر کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ سمجھا سکتے ہیں تو پیار سے سمجھائیں نہیں سمجھا سکتے تو پڑھنے دیں۔ درود ہی پڑھ رہا ہے برداشت کریں۔ دعا کریں اللہ اسے خوبصورت سا طریقہ سکھائیں۔ دوسرا ایک گوشے میں بیٹھا محبت سے، آرام سے سکون، سے پڑھ رہا ہے تو اس کو لٹھ کیوں مارتے ہو؟ اسے آرام سے پڑھنے دیں۔ اس میں کفر اور اسلام کی، اس میں جنگ کرنے کی، اس میں ایک دوسرے پر بہتان تراشی کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے لیے مناظرے اور تفرقہ بازی کی کیا تک بنتی ہے۔

میرے ایک رشتہ دار ہوتے تھے، تو وہ بڑے زور زور سے درود پڑھتے۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے فوت ہو گئے۔ ایک اور ہمارے عزیز ہیں اور وہ بھی ضعیف ہو چکے ہیں وہ اس کے بڑا خلاف ہوا کرتے تھے۔ اور ان کی بڑی جھڑپیں ہوتی تھیں۔ مسجد میں وہ فجر کی نماز کے بعد زور زور سے پڑھتے تھے "**الصلوۃ والسلام علیک یا رسول اللہ**" اس پر دونوں بہت شدت سے لڑتے تھے۔ تو میں نے انہیں اکیلے میں پکڑ لیا۔ میں نے کہا چچا یہ تم کیوں کرتے ہو؟ اگر تم آرام سے سکون سے بیٹھ کر اپنے دل میں بھی درود پڑھو، تمہیں بڑا مزا آئے گا۔ کہنے لگا یار یہ تو مجھے بھی پتہ ہے میں اس کو جلانے کے لیے کرتا ہوں، اللہ اس پر رحم فرمائے اللہ اسے بخش دے، بہت اچھا بندہ تھا، کھرا آدمی تھا، میں سمجھتا ہوں یہ بھی اس کے کھرے پن کی دلیل ہے۔ سادہ آدمی تھا دیہاتی تھا، ان پڑھ تھا، تو وہ کہنے لگا کہ یار پتہ تو مجھے بھی ہے، اس طرح مزا بہت آتا ہے، لیکن اسے بھی تو جلانے کے لیے کرتا ہوں۔ یہ مجھے کیوں منع کرتا ہے۔ اگر وہ اس پر تنقید نہ کرتا تو غالباً وہ بھی اتنی کھپ نہ ڈالتا۔ یعنی للہیت اگر ہو اور ایک آدمی دین کا کام کر ہی رہا ہے بہت اچھے طریقے سے نہ سہی، اس سے کم تر طریقے سے سہی کر تو رہا ہے۔

اسے کیوں روکتے ہو، چھوڑ کر بیٹھ جائے گا اس میں کیا فائدہ ہوگا۔

تو ارشاد ہوتا ہے، اختلاف اسلام میں نہیں ہے ۔ پہلے اہل کتاب نے بھی تو اختلاف پیدا کیا۔ بغاوت کر کے، دین سے سرکشی کر کے، اپنی خواہشات کی پیروی کے لیے۔ اب اگر کوئی کرتا ہے تو وہ بھی بغاوت کرتا ہے اور وہ بھی سرکشی کرتا ہے، اور اللہ کے حکم پر اپنی خواہشات کو مقدم رکھتا ہے لیکن فرمایا ایک بات یاد رکھ لو! یہ کام آسان نہیں ہے۔ اللہ کریم بہت جلد اس معاملے کا حساب لینے والے ہیں۔ آسان بات نہیں ہے کہ کسی نے کہہ دیا اور بات ختم ہوگئی۔ پیسے کما لیے، چندہ جمع کر لیا یا مرید بہت سے بنا لیے اور اپنا ایک طبقہ الگ کر لیا اور اس پر حکومت وسلطنت کرتے رہے یا بہت سے ووٹ جھوٹ بول کر لے لیے اور اس پر وزیر بن گئے یا حکمران بن گئے۔ یہ سارا آسان نہیں ہے۔ اللہ کے بندوں میں تفریق پیدا کرنا اور پھر بالخصوص ان کے عقائد میں تفریق پیدا کرنا اور ان کے عقائد میں فساد ڈالنا، فرمایا یہ بہت بڑی جسارت ہے، یہ بہت بڑی دیدہ دلیری ہے۔ یہ ایسے ہے کہ جیسے آپ دریا کے پانی میں زہر گھول دیں۔ جو اللہ نے لوگوں کی حیات کے لیے چلایا ہے تو وہ چشمہ جسے لوگوں کی زندگی کے لیے بنایا ہے، جس نے لوگوں کو فصلیں دینا ہے، لوگوں کے پھل پکانا ہے، لوگوں کی پیاس بجھانا ہے، آپ اس میں زہر گھول دیں تو کیا یہ معمولی جرم ہے؟ یہ دین وہ چشمہ صافی ہے جس پر انسان کی انسانیت سیراب ہوتی ہے۔ اس کی جو بھی فصل ماری جائے جرم ہے اور اگر اس کے انسانیت کے پودے مرجھا جائیں تو یہ کتنا بڑا جرم ہوگا۔ یہ آسان نہیں ہے کہ ہم کہہ دیں کہ فلاں مسجد والے کافر ہیں۔ خدا کا خوف کرو! کبھی کسی سینما والے کو کسی نے کافر نہیں کہا، کبھی کسی کلب والے کو آپ نے کافر نہیں کہا، کبھی کسی گانے بجانے والے کو کافر نہیں کہا، تو مسجد والوں کو کہنے میں اتنی دلیری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر مسجد میں ہی ہیں، یہی کلمہ پڑھتے ہیں **لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ** یہی نماز پڑھتے ہیں، یہی وضو کرتے ہیں، اگر کوئی تھوڑا سا اختلاف بھی ہے تو کچھ تو برداشت بھی کر لیا جائے، اس میں لڑنے کی تو کوئی تک نہیں بنتی۔ اور میرے خیال میں سوائے ان فرقوں کے جو تخریبی طور پر بنائے گئے ہیں میں انہیں مذہب نہیں کہتا۔ میرے نظریے کے مطابق وہ اینٹی اسلامک موومنٹ ہیں اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے تحریکیں چلائی گئیں۔ جیسے شیعہ ازم ہے یا مرزائیت ہے۔ یہ ایک ہی پودے کے مختلف روپ ہیں اور پھل ہیں۔ یہ یہودیوں کے لگائے ہوئے پودے ہیں۔ شیعیت اسلام کی بنیاد پر وار تھا کہ صحابہ اکرم رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مقام کو مجروح کیا جائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا کوئی گواہ ہی دنیا میں نہ ہو۔ کوئی ایسا بندہ ہی نہ ملے جو کہہ دے کہ اسلام کا ایک نبی علیہ السلام بھی تھا اس لیے کہ ماننے والے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہو گئے اور انکار کرنے والے کافر۔ تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی اگر غلط کہہ دیا تو پھر تو ماننے والا دنیا میں رہا ہی کوئی نہیں۔ بتائے گا کون۔ یہ اتنا زہریلا وار تھا کہ ایک ہی وار سے کتاب اللہ کی عظمت بھی کٹ جائے نبی علیہ السلام کی صداقت بھی مجروح ہو جائے اور دین کے پودے کی ساری جڑ کٹ جائے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ، کتنی وسیع تھی اور علوم کتنے وسیع تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں فرمایا کہ جب دنیا کے حالات بگڑیں گے، دنیا پر تاریکی پھیلے گی تو مجھے اس زمانے کے ہندوستان کی طرف سے ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ آج اگر آپ پوری دنیا پھر کے دیکھیں تو آپ کو دینی علم اور دین پر عمل ان گنہگاروں میں ساری دنیا سے زیادہ نظر آئے گا۔ اس خطے میں جو مسلمان بستے ہیں، یہ جاپان سے لے کر مغربی امریکہ تک اور افریقہ سے لے کر چین تک ان سارے مسلمانوں میں علم کے اعتبار سے بھی اور عمل کے اعتبار سے بھی بہت اچھے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ یہاں کی حکومتیں غنڈوں کے ہاتھوں میں ہیں ورنہ یہاں کے لوگ بڑے دین دار ہیں۔ یہ بھی ایک سازش ہے کہ جاتے جاتے کافر حکومت ایسے ہاتھوں میں دے گئے جو ان کی ہی بات سنیں اور ابھی تک انہی کی کوشش سے اس طرح کے عناصر ہم پر مسلط ہیں۔ اگر لوگ ہوش میں آجائیں تو یہ مشکل کام نہیں کہ یہ بے دین ماتحت ہوں اور دین دار حاکم ہوں۔ اللہ کرے گا ایسا ہی ہوگا ان شاء اللہ۔

دیوبندی، بریلوی، مقلد، غیر مقلد یہ سارے مذہبی فرقے ہیں اور میں نہیں سمجھتا کہ ایک غیر مقلد کو مقلد کے ساتھ لڑنا چاہیے۔ وہ بھی اسی دین کا پیروکار ہے، یہ بھی اسی دین کا۔ ایک بریلوی کا دیوبندی کی داڑھی کھینچنا یا دیوبندی کا بریلوی کو کافر کہنا صحیح نہیں ہے۔ چونکہ یہ سارے اسلامی فرقے ہیں، ان کے پاس حقائق ہیں ان کی اپروچ اپنی اپنی ہے۔ اس میں تھوڑا سا اختلاف ہے تو یارا اتنا تو برداشت بھی کرلو۔ اگر ہم ان اکائیوں میں تقسیم نہ ہوں اور ایک متحدہ وجود بن جائیں تو کوئی بدمعاش مسلمانوں پر حکومت نہیں کرسکتا۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹتے بٹتے محلوں میں آکر بھی تین چار گروہ بن گئے، تو پھر قوت کہاں رہے گی۔ اب آپ دیکھیں کہ اس ملک کے ۹۹.۹ فیصد لوگ دین دار ہیں وہ سارے ووٹ دیتے ہیں لیکن حکومت بدمعاش کرتے ہیں جو 0.01 فیصد بھی نہیں۔ اس لیے کہ بدمعاش ہزار اختلاف کے باوجود مل بیٹھتے ہیں، اور دین دار سارے ہزار یک رنگی کے باوجود لڑتے رہتے ہیں۔ کیا فائدہ اس سے کیا حاصل؟ اس لیے یہ آیہ کریمہ اس اختلاف سے منع فرماتی ہے۔ فرماتی ہے کہ اگر تمہیں ایک اللہ کی اطاعت کرنی ہے، ایک کعبے کے سامنے جا کر عبادت کرنی ہے، ایک کتاب پڑھنی ہے، ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہو تو اللہ کے لیے خلوص سے عمل کرو۔ اللہ سب کو قبول کرلے گا۔ ہمارے عمل سے کوئی اس کی دیواریں تو نہیں بلند ہو رہیں۔ اطاعت کے جذبے اور خلوص سے ان حدود کے اندر کام کرو جو سنت نے متعین کردیے ہیں۔ ان کو مت روندو جو اللہ نے معین کردیے ہیں۔ ان سے باہر مت جاؤ، ان کے اندر اگر کسی میں سمجھنے میں اختلاف ہے تو برداشت کرو۔ یہ اختلاف اسلام کی خدمت نہیں ہے۔

اور یہ بھی یاد رکھو **وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ** اگر کسی نے اللہ کے احکام سے انکار کیا، کفر کیا **فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ** تو وہ موج میں نہیں رہنے دے گا کہ اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے۔ کسی بھی لمحے تمہیں جواب دہی کے لیے طلب کیا جاسکتا ہے۔ کوئی بھی لمحہ آخری لمحہ ہوسکتا ہے اور ایک ایک بات کا حساب دینا ہوگا کہ آپ نے یہ نعرہ کیوں لگایا۔ اگر صرف ووٹ لینے

کے لیے، صرف مرید بنانے کے لیے، صرف اپنی طاقت بڑی کرنے کے لیے صرف چندہ لینے کے لیے آپ لوگوں کو آپس میں لڑا رہے ہیں تو یہ دین کی خدمت نہیں ہے، یہ دین کے خلاف کام ہو رہا ہے۔ دین کی خدمت یہ ہے کہ اللہ کے لیے خود بھی کام کریں اور دوسرے کو بھی اللہ کے لیے کام کرنے کی تلقین کریں۔ اختلافات میں نہ پڑیں تو دین صرف اسلام ہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

مزید مطالعہ کے لیے انہی آیات کی تفسیر اسرار التنزیل اور اکرم التفاسیر سے ملاحظہ فرمائیں۔

☆ ☆ ☆

سبق نمبر ۶: سورۃ المائدہ

آیت: ۳ تا ۴

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ

حرام کیا گیا تم پر مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت

وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهِۦ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ

اور جس پر بوقت ذبح اللہ کے سوا کسی کا نام لیا گیا ہو اور جو گلا گھٹنے سے مرا ہو اور جو ضرب لگنے سے مر جائے

وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَآ أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا

اور جو گر کر مر جائے اور جو ٹکر لگنے سے مر جائے اور جسے درندہ کھا گیا ہو سوائے اس کے

ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا

کہ جس کو تم ذبح کر لو اور جو پرستش گاہوں پر ذبح کیے جائیں اور یہ کہ قرعہ کے تیروں کے ذریعے

بِالْأَزْلَامِ ۚ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ ۗ الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُوا

تقسیم کرو یہ سب گناہ ہیں آج کے دن کافر تمہارے دین سے

مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ۚ الْيَوْمَ

ناامید ہو گئے پس ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔ آج کے دن

أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي

میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی

وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ فِي

اور اسلام کو تمہارا دین پسند فرما لیا سو جو شخص بھوک سے

مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

بے تاب ہو جائے کسی گناہ کی طرف اس کا رجحان نہ ہو تو یقیناً اللہ بخشنے والے

رَّحِيْمٌ ﴿۳﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَاۤ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ

مہربان ہیں۔ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کون سی چیزیں حلال کی گئی ہیں فرما دیجیے کہ تمہارے

لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ

لیے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں اور جو تمہارے سکھلائے ہوئے شکاری جانوروں نے پکڑا ہو تو

تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّاۤ اَمْسَكْنَ

جس طرح اللہ نے تم کو سکھایا ہے (شکار کرنا) اس طرح تم نے ان کو سکھایا ہو۔ جس شکار کو وہ تمہارے واسطے

عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ

پکڑ رکھیں پس وہ کھاؤ اور اس پر (بوقت ذبح) اللہ کا نام لو اور اللہ سے ڈرتے رہو یقیناً

اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۴﴾

اللہ بہت جلدی حساب لینے والے ہیں۔

ان آیات مبارکہ میں بنیادی طور پر جانوروں کی حلت وحرمت کے احکامات ہیں۔ ذبیحہ کے احکام ہیں۔ چونکہ معاشرے میں جہاں اور بہت سی ضروریات ہیں جیسے بیع وشرع کی، خرید وفروخت کی، وہاں جانوروں کا ذبیحہ اور گوشت کا لینا ایک ایسا کام ہے کہ ہم ایک آدمی پر بھروسہ کرتے ہیں جو جانور کا گوشت بیچتا ہے۔ اگر وہ گوشت حلال نہیں ہے اور ہمیں یہ گمان ہے کہ بیچنے والا چونکہ مسلمان ہے گوشت حلال ہوگا تو اس کا فائدہ صرف یہ ہوگا کہ گناہ نہیں ہوگا لیکن حرام کھانے سے جو ظلمت باطن میں پیدا ہوتی ہے یا جو کیفیات کا نقصان ہوتا ہے وہ تو ہوگا۔ اب کسی نے غلطی سے زہر کھالیا تو خودکشی کا مجرم نہیں ہوگا لیکن زہر کا اثر تو زائل نہیں ہوگا۔ وہ تو ہوگا۔ ایک تو یہ بات ہے کہ ہم اعتماد کرتے ہیں دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں اس کا علم ہی نہیں ہوتا کہ کونسا ذبیحہ حلال ہے اور کونسا حرام ہے۔ جس کسی نے گوشت کاٹ کر رکھ لیا، جو بیچنے بیٹھ گیا، ہم نے کھالیا۔ تو اسلام نے کسی ایک فرد کے لیے دین کو مخصوص نہیں کیا بلکہ ہر مسلمان کا دین ذاتی ہے اور ضروریات دین کے متعلق جاننا ہر مسلمان کی ضرورت ہے۔ سکالر ہر موضوع پر زندگی لگا دیتا ہے۔ جس طرح دین کے مختلف موضوعات پر بعض لوگوں نے عمریں لگا دیں۔ جو محدث

کہلائے، ان کی ساری تحقیق حدیث پر رہی۔ بعض نے تفسیر میں تحقیق کی، وہ مفسر کہلائے۔ بعض نے دوسرے موضوعات پر اپنی اپنی تحقیقات کیں۔ بعض کی عمر صرف گرائمر اور صرف ونحو سے بحث کرتے بسر ہو گئی۔ بعض نے اسماء الرجال میں عمریں کھپا دیں۔ تو سکالر بننا یا ماہر فن بننا یہ تو چند لوگوں کی خوبی ہوتی ہے لیکن ضروریات کے متعلق جاننا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

یہاں یہ جاننا کہ کونسا جانور حلال ہے، جس کا گوشت ہم کھا سکتے ہیں، اس کی تفصیل دی گئی ہے۔ سب سے پہلے فرمایا **حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ**۔ جو از خود مر جائے جسے ذبح نہ کیا جائے وہ حرام ہے۔ بڑی سادہ سی بات ہے کہ اگر کوئی جانور ہے ہی حرام جن کی تفصیل فقہ میں بھی اور احادیث مبارکہ میں بھی ملتی ہے، جیسے گدھا ہے، کتا ہے، تو اس کے مرنے یا زندہ ہونے کا سوال ہی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ حلال جانور، حلال پرندہ، جو طبعی موت مر جائے، کسی بیماری سے یا زندگی پوری کر کے اس پر تکبیر نہ پڑھی جائے۔ تو وہ مردار ہے اور اس کا کھانا جائز نہیں، حرام ہے۔

وَالدَّمُ۔ خون حرام ہے۔ اسی لیے ذبح کے وقت حکم ہے کہ اس طرح سے ذبح کیا جائے کہ زیادہ سے زیادہ خون نکل جائے۔ اگر کوئی جانور اس طرح سے مارا جائے جس طرح کافر جھٹکا کرتے ہیں تو اس میں خون رہ جائے گا۔ تکبیر پڑھ کر بھی ماریں تو بھی خون اس میں رہ جائے گا۔ جھٹکا میں گردن پیچھے سے کاٹ دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا جو سلب کا تسمہ ہے، دماغ اور وجود کا تعلق جسے حرام مغز کہتے ہیں وہ پہلے کٹ جاتا ہے۔ اس کے کٹنے کے ساتھ ہی دل کی دھڑکن بند ہو جاتی ہے، دماغ اور دل کا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ رگیں بعد میں کٹتی ہیں، بہت تھوڑا خون نکلتا ہے، باقی سارا خون جس جس رگ میں گوشت کے جس حصے میں ہے وہیں جم جاتا ہے۔ ہمارے جو بھائی جنگی قیدی رہے ہیں، انہیں تجربہ ہوا ہوگا کہ پکا ہوا گوشت بھی اگر جھٹکے کا ہو تو ہانڈی سے نکال کر اس گوشت کو نچوڑیں یا پانی میں ڈال دیں تو خون سامنے آ جاتا ہے۔ پکنے کے بعد بھی ان میں خون باقی ہوتا ہے۔ اس لیے کہ حرام مغز کا وہ تسمہ پہلے کٹ گیا دل کا دماغ کا رشتہ کٹ گیا، تو خون وہیں جم گیا وہ خون بھی حرام ہے۔ اسی طرح اگر جانور کو بے ہوش کر دیا جائے پھر ذبح کیا جائے اس سے بھی پورا خون نہیں نکلتا۔ وہ صحیح طریقہ ذبح کا نہیں ہے کہ حرام ہونے کا شبہہ ہے۔ اب مغرب میں بھی یہ ایک طریقہ نکالا ہے کہ بجلی کی ایک چھوٹی سی مشین ہے جسے سٹن گن کہتے ہیں تو جیسے ہی اس کا بٹن دبائیں گے جانور پر ایک شعاع پڑتی ہے وہ گر جاتا ہے، اسے پکڑنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ خیر وہ تو کرتے ہی جھٹکا ہیں۔ اوپر سے بٹن دبایا تو ایک بلیڈ گرا اس نے کاٹ دیا۔ لیکن اگر اس بے ہوش جانور کو چھری سے بھی ذبح کیا جائے، جو میں نے یہاں بعض قصابوں کو بھی کرتے دیکھا ہے کہ وہ پتھر یا لاٹھی یا کوئی بھاری چیز جانور کے سر میں مار کر اسے بے ہوش کر دیتے ہیں، پھر ذبح کرتے ہیں۔ اس سے ان کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ سیر ڈیڑھ سیر خون جو ہے وہ گوشت میں جما رہ جاتا ہے، گوشت زیادہ نکل آتا ہے۔ اگر بکرا تھا، اس سے دس سیر گوشت نکلنا تھا، بارہ نکل آئے گا۔ تو یہ سارے طریقے ناجائز ہیں۔ وقتِ ذبح جو خون نکلتا ہے، وہ حرام ہے۔

اور ذبح کا طریقہ یہ ہے، یاد رکھ لیجیے! ایک تو جانور کا حلق کٹنا چاہیے، نرخرہ کٹنا چاہیے، اس کا کچھ حصہ اوپر رہنا چاہیے، یعنی اسے وہاں سے نہ کاٹا جائے کہ سارا نرخرہ نیچے رہ گیا اور گردن اوپر، ایسا ہوا تو مکروہ ہوگیا۔ نرخرے کا کچھ حصہ اوپر ہو کچھ نیچے ہو، خواہ ایک دو کڑیاں ہی اس کی اوپر چلی گئیں، لیکن نرخرہ کاٹ دیا جائے گا۔ دوسرا یہ ہے کہ یہ دونوں رگیں اس طرف کی بھی اور اس طرف کی بھی کاٹی جائیں۔ اور یہ جو گردن مروڑ کر پرندہ یا مرغ ذبح کرتے ہیں گردن مروڑ کے تسمے کو کاٹ دیا یا قصاب جانور کو ذبح کرتے ہیں، بھیڑ بکری گائے کو اور گردن مروڑ کے درمیان سے تسمہ حرام مغز کا کاٹتے ہیں، وہ بھی جائز نہیں مکروہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس تسمے کا رابطہ دل اور دماغ کے ساتھ ہوتا ہے اور اگر وہ تسمہ کٹ گیا تو دل دھڑکنا بند کر دیتا ہے اور خون کم نکلتا ہے۔ لہٰذا یہ مکروہ ہوگا۔ اس لیے حلقوم کو کاٹا جائے اور دونوں رگیں تسلی سے کاٹ دی جائیں۔ رگ میں کوئی رشتہ باقی نہ رہے، اس کا خون بہنے دیا جائے۔ وہ خون سارا نکل جائے گا اور جانور ذبح ہو جائے گا۔

اور خنزیر حرام ہے۔ **وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ** قرآن میں خنزیر کے گوشت کا حوالہ دیا گیا ہے لیکن اس کی تشریحات حدیث شریف میں اور فقہ کی کتابوں میں ہیں۔ ان میں یہ حکم ہے کہ اس میں حرمتِ اصلی ہے۔ حرمتِ اصلی جس چیز میں ہوتی ہے، اس کے سارے متعلقات حرام ہو جاتے ہیں۔ یعنی اگر خون حرام ہے تو محض خون کا نکالنا بھی حرام ہے۔ اس کے لیے جو اوزار استعمال کیے جائیں گے ان کا حاصل کرنا، اوزار دوسرے کو پہنچانا، یہ سب حرام ہے اس کے متعلقات حرام ہوتے چلے جائیں گے اس لیے کہ اس میں حرمتِ اصلی ہے۔ یعنی خنزیر کے گوشت میں جب حرمتِ اصلی ہے تو اس کے سارے لوازمات، خنزیر کو پالنا، خنزیر کو پکڑنا، خنزیر کو دوسرے کو کھلانا، خنزیر کو بیچنا، خنزیر کو خریدنا، خنزیر پر مزدوری کرنا، یہ سارے لوازمات اس حرمتِ اصلی کی وجہ سے حرام ہوتے چلے جائیں گے۔ یعنی خنزیر سے گوشت یا کسی قسم کا نفع حاصل کرنے کے تمام ذرائع حرام ہیں۔

وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ۔ اور وہ جانور حرام ہوگا جس پر بوقتِ ذبح بجائے اللہ اکبر کہنے کے کسی دوسرے کا نام لیا جائے۔ اس میں بہت سا غلو کر دیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ عادت ہے کہ ہم انتہا پر چلے جاتے ہیں۔ یا اِس انتہا پر یا اُس انتہا پر۔ یہ کہہ دیا گیا ہے کہ کسی کے نام بھی لگا دو، یہ بکرا فلاں افسر کے آنے پر ذبح کروں گا، یا یہ بکرا فلاں بزرگ کے ایصالِ ثواب کے لیے پالا ہوا ہے تو حرام ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ حرام وہ ہوگا جس پر بوقتِ ذبح اللہ کی بجائے کسی دوسرے کا نام لیا جائے۔ کیونکہ عرب میں یہ رواج تھا کہ جن بتوں کی یا جن ناموں کی وہ نذر مانتے تھے، ذبح کے وقت انہیں کے نام پر چھری چلاتے تھے، تکبیر نہیں پڑھا کرتے تھے۔ بلکہ جب ذبح کرتے تھے تو چھری چلاتے وقت اسی کا نام بلند کرتے تھے۔ اُھِلَّ کے معنی ہے پکارا جانا۔ بلند کرنا۔ زور سے کہنا۔ بزرگوں کے نام پر دینا جائز ہے یا نہیں، یہ الگ مسئلہ ہے۔ اس کا جانور کی حلت و حرمت سے تعلق نہیں ہے۔ تو نذر کے بارے میں تھوڑا سا عرض کر دوں کہ نذر یہ ہے کہ از قسم فرائض ہو اور فرض نہ ہو۔

نذر کی بنیادی شرط یہ ہے کہ از قسم فرائض ہو۔ مثلاً نماز فرض ہے تو آپ نوافل نذر مان سکتے ہیں۔ روزہ فرض ہے تو

نفلی روزے آپ نذر مان سکتے ہیں۔ زکوۃ فرض ہے تو نفلی صدقہ۔ حج فرض ہے تو آپ نفلی حج نذر مان سکتے ہیں۔ جب نذر کے لیے از قسم فرض ہونا ضروری ہے تو ظاہر ہے نذر اللہ کے لیے ہی ہوگی۔ غیر اللہ کے لیے تو کوئی نذر ہے ہی نہیں۔ اگر ہم کہیں کہ میں فلاں بزرگ کی نذر مانتا ہوں تو وہ بات ہی سرے سے باطل ہے۔ اور فضول ہے کہ نذر منعقد ہی تب ہوگی جب از قسم فرائض ہو اور خود فرض نہ ہو۔ یہ نذر نہیں مانی جاسکتی کہ میں آج ظہر کی نماز پڑھوں گا کیونکہ وہ فرض ہے۔ ہاں یہ مانی جاسکتی ہے کہ اللہ مجھ سے یہ مصیبت دور کردے تو ظہر کی نماز کے ساتھ میں دس رکعت نوافل بھی پڑھوں گا۔ اسی طرح زکوۃ فرض ہے، روزہ فرض ہے، حج فرض ہے، تو نذر از قسم فرائض ہوگی اور فرض نہیں ہوگی۔ تو یہاں حرمت اس جانور کی آئی ہے جس پر غیر اللہ کا نام ذبح کے وقت پکارا جائے۔ اور جو جانور **وَالْمُنْخَنِقَةُ** جو گلا گھونٹ کر مرجائے۔ **وَالْمَوْقُوْذَةُ** جو چوٹ لگ کر مر جائے۔ **والمعر دیتہ** جو گر کر مرجائے۔ گلا گھونٹ کر مرنا تو عام ہے۔ چوٹ لگنے میں یہ ہے کہ آپ نے پتھر سے مارا۔ چونکہ آپ اگر کاٹنے والی چیز سے مارتے ہیں تو وہ زخم لگتا ہوتا ہے۔ وہ چوٹ لگنا نہیں ہوتا۔ وہ کاٹنا ہوگا وہ زخم ہوگا۔ جانور کنویں میں گر گیا، اب اس کا نکالنا ممکن نہیں، زندہ بھی زیادہ دیر نہیں رہے گا، تو کسی نے تکبیر پڑھ کر اوپر سے چھری یا کوئی چیز پھینک دی جس سے وہ کٹ گیا خون بہنا شروع ہوگیا، پھر چاہے مر بھی جائے حلال ہوگا۔ چونکہ اس کے خون کے اجراء کا انتظام کاٹ کر کیا گیا۔ اسی طرح شکار کرتے ہیں تو کوئی تیز دھار چیز جو کاٹتی ہے جیسے تیر، کسی جگہ بھی لگ جائے (لیکن اس کا زخم مہلک ہونا چاہیے یعنی یہ نہ ہو کہ خراش آئے) کسی جگہ بھی لگ جائے لیکن زخم ایسا ہونا چاہیے کہ اس سے اس کی موت واقع ہو سکے۔ اور شکار میں آپ کے پاس تیر ہے یا خنجر ہے یا نیزہ ہے یا کاٹنے والی چیز ہے۔ وہ آپ جانور پر پھینکتے ہیں۔ جانور کٹ گیا۔ آپ نے اگر تکبیر پڑھ کر پھینکا ہے اور آپ کے ذبح کرنے سے پہلے مر گیا تو حلال ہے۔ اس میں ایک رواج ہوگیا ہے کہ لوگ بندوق کے فائر سے تکبیر پڑھ کر جانور مار لیتے ہیں اور کہتے ہیں حلال ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ چونکہ بندوق کی گولی کاٹتی نہیں ہے جبکہ حلال ہونے میں کاٹنا شرط ہے۔ بندوق کی گولی توڑتی ہے۔ یعنی بندوق کا مارا ہوا **وَالْمَوْقُوْذَةُ** کے تحت آئے گا جو چوٹ لگنے سے مرتا ہے جیسے میں نے پتھر مارا، اس سے جانور مر گیا۔ بندوق نے گولی ماری، اس میں اتنی طاقت تھی کہ اس نے صرف چوٹ نہیں لگائی، جسم توڑ کر دوسری طرف نکل گئی تو وہ کاٹنا تو نہیں کہلائے گا۔ صرف چوٹ اتنی زور کی پڑی کہ جسم ٹوٹ گیا۔ بندوق کاٹتی نہیں ہے، بندوق کی گولی گوشت کے بھی پرخچے اڑا دیتی ہے۔ ہڈی کو بھی پرزے پرزے کر دیتی ہے۔ وہ ایک پتھر ہوتی ہے، اور اس کے پیچھے بارود کی قوت ہوتی ہے۔ وہ توڑتی ہے اس لیے بندوق سے مارنا حلال نہیں ہوا۔ **اِلَّا** یہ کہ بندوق میں کوئی ایسی گولی ہو جو چاقو کی طرح کاٹتی ہو جو میرے علم میں نہیں ہے۔ کوئی ایسا بلٹ ایجاد نہیں ہوا جو کاٹتا ہو۔ میں گلگت میں تھا تو دوستوں نے بہت بڑے عالم کا فتویٰ پیش کیا کہ "بندوق سے بھی تکبیر پڑھ کر مارنا حلال ہے" تو میں نے انہیں یہی عرض کیا تھا کہ ہمارے علماء کو ان چیزوں کی جو تکنیک اور جو طریقہ کار اور بناوٹ ہے، اس کا پتہ نہیں ہوتا، انہوں نے اس پر فتویٰ

دے دیا ہوگا جیسے تیر سے نیزے سے مارنا۔ وہ تو کاٹتا ہے جبکہ بندوق توڑتی ہے، یہ چوٹ لگاتی ہے یہ **والموقوذۃ** میں آتا ہے۔ ضرب لگانے والی بات ہے۔ صرف یہ ہے کہ یہ زور سے لگاتی ہے تو وہ حلال نہیں ہوں گے۔ ہاں یہ ہے کہ بندوق سے جانور گر گیا بے ہوش ہے۔ اس میں ایک گنجائش ہوتی ہے۔ اکثر میں بھی دیکھا کرتا ہوں کہ گولی لگنے سے شکار بے حس ہو جاتا ہے۔ عموماً بے ہوش ہو جاتا ہے اگر اسے ذبح کیا جائے اس کی رگوں میں سے خون بہہ نکلے، اس کا مطلب ہے وہ زندہ تھا، ذبح ہو گیا زندہ نہ ہوتا تو رگوں سے خون نہ آتا دل کی دھڑکن بند ہو جائے تو رگیں خون نہیں دیتیں۔ پرندہ ہے تیتر ہے یا ہرن ہے، اڑیال ہے یا نیل گائے، چھوٹا جانور ہے یا بڑا، گولی بعض اوقات ایسے اعضاء پر لگتی ہے کہ بدن ساکت ہو جاتا ہے۔ جانور بے ہوش ہو جاتا ہے۔ دماغ میں لگ گئی اسی طرح دل میں یا پھیپھڑوں سے نکل گئی تو جانوروں کا ایک نظام رب العالمین نے ایسا بنایا ہے کہ ان کے پٹھوں (Muscles) میں اتنی آکسیجن سٹاک ہوتی ہے کہ وہ پھیپھڑے کے بیکار ہو جانے کے بعد، دل کے زخمی ہو جانے کے بعد بھی بڑی دیر تک سروائیو (Survive) کر جاتے ہیں۔

میں نے ایک بھاگتے ہوئے جنگلی اڑیال پر فائر کیے۔ تین گولیاں لگیں وہ پوری پہاڑی اوپر چڑھ کر گرا تو ہم نے ذبح کیا۔ پہلی گولی اس کے سینے میں لگی۔ دوسری اس کی ایک ٹانگ پر لگی تیسری گردن پر۔ تو پہلی گولی نے دونوں پھیپھڑے بھی بیکار کر دیے اور دل کے درمیان سے نکل گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ پہلی گولی لگنے سے تین چار سو گز پہاڑ کی چوٹی پر چڑھنے تک اس کا نہ دل دھڑک رہا تھا نہ پھیپھڑہ کام کر رہا تھا۔ وہ صرف اس آکسیجن پر زندہ تھا جو ان کے مسلز میں حیات کے لیے رکھی گئی ہے۔ (Survival Strength) یعنی زندہ رہنے کی جو طاقت ہے، قوت مدافعت ہے۔ جو جنگلی حیات میں اللہ نے خزانے کی طرح رکھ دی ہے۔

اسی لیے علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں کہ ''لوگوں کو شہری تہذیب سے آشنا کر کے تم نے زندوں کو قتل کر دیا انہیں بدویت میں رہنے دو کہ جفاکش ہوں''۔ مقدمہ ابن خلدون میں وہ بڑے درد سے لکھتے ہیں کہ ''ہماری قوم کی تباہی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ سارے شہری مزاج کے ہو گئے ان میں سے بدویت چلی گئی'' بدویت قدرتی طور پر بدن کو قوتِ مدافعت دیتی ہے جنگلی جانوروں میں پوری بدویت ہوتی ہے، شہریت کا تصور ہی نہیں ہوتا اس لیے ان میں زندہ رہنے کی قوت (Survival Strength) بہت زیادہ ہوتی ہے۔

تو شکار کا جانور اگر زخمی ہو کر بے ہوش ہو جائے تو اس کا گلا کاٹ کر دیکھنا چاہیے۔ اگر خون رگوں سے نکلتا ہے تو اس کا مطلب ہے زندہ تھا، ذبح ہو گیا۔ اگر رگیں خون نہیں دیتیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ گلا کٹنے سے پہلے مر چکا تھا، وہ حلال نہیں ہے۔ **وَالْمُتَرَدِّيَةُ** جو گر کر مر جائے **وَالنَّطِيحَةُ** یا جانور آپس میں لڑ پڑیں۔ جانور کے لڑنے سے یا چوٹ لگنے سے کوئی جانور مر جائے یا کسی جانور کو درندے مار دیں، یہ سب حرام ہو گئے۔ اِلا یہ کہ اس کے مرنے سے پہلے آپ نے ذبح کر لیا۔ جانور گر گیا تو

اس کے مرنے سے پہلے آپ نے ذبح کر لیا یا جانور کو جانور نے مارا اس کی جان نکلنے سے پہلے وہ ذبح ہو گیا یا درندوں نے چیڑ پھاڑ دیا تو مرنے سے پہلے **اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ** سوائے اس کے کہ جو اس حال میں آپ کو ملا اور آپ نے ذبح کر لیا تو وہ الگ بات ہے۔ وہ مردار نہیں ہو گا وہ ذبح میں آ جائے گا لیکن اگر اس چوٹ سے، گرنے سے یا جانور کے مارنے سے یا درندے کے زخم لگانے سے مر گیا تو حرام ہو جائے گا۔

وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ ۔اور وہ جانور جو چڑھاوے کے طور پر چڑھاوا چڑھانے کی جگہ ذبح کیا جائے۔ چونکہ ہر بت کا ایک تھان متعین ہوتا تھا اور اس بت کی نذر اس تھان پر جا کر ذبح کی جاتی تھی تو اس جگہ پر جا کر ذبح کرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس پر اگر آپ تکبیر بھی پڑھتے رہیں تو آپ اللہ کے لیے نہیں کر رہے، اس بات کے لیے ذبح کر رہے ہیں جس کے لیے قربانی کرنے کی وہ جگہ بنی ہوئی ہے۔ تو اس طرح جو چیز کسی تھان پر جا کر ذبح کی جائے وہ حرام ہو جائے گی۔

اور وہ چیز جو آپ قسمت کا حال معلوم کرنے کے لیے یا نذرانے کے طور پر لگاتے ہیں۔ عرب لوگ بعض اوقات تیر مار کے دیکھتے تھے مر گیا تو یہ ہو گا، نہیں مرا تو یہ ہو گا یا بعض اوقات اس کی اجرت مقرر کر دیتے تھے کہ وہ سارا اس اجرت میں آ جائے۔ علومِ غیبیہ پر واقفیت حاصل کرنے کے لیے یا اس کی خاطر ذبح کیا جائے تو وہ سارا حرام ہو جائے گا **ذٰلِكُمْ فِسْقٌ** یہ صرف حرام ہی نہیں ہو گا، یہ بہت بڑا جرم بھی ہو گا کہ ایک غیر شرعی امر کے لیے ایک جانور کی جان لی گئی۔ اس حلال جانور کو حرام بھی کیا گیا۔ اور عقیدے کے اعتبار سے بہت دیدہ دلیری کی گئی کہ اس نظام کے چلانے والے کو چھوڑ کر آپ کسی اور طاقت کے ساتھ امیدیں وابستہ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ میری تقدیر کو کوئی بدل دے گا یا اس طرح سے کوئی مصیبت ٹل جائے گی یا اس طرح سے میری بہتری ہو گی۔

اب جو لوگ اس میں بہت زیادہ شدت اختیار کرتے ہیں، وہ اس بات کو یہاں تک بھی لے جاتے ہیں کہ وہ نذرانے مزارات پر ان اغراض سے چڑھاتے ہیں کہ یہاں بکرا ذبح کرنے سے مجھے بیٹا ملے گا یا یہاں مرغا ذبح کرنے سے میری بیماری ٹھیک ہو جائے گی، وہ اسی ضمن میں آتے ہیں۔ یہ میرا فتویٰ نہیں ہے لیکن کافر اگر بت پر جا کر ذبح کرتا ہے تو اسی نظریے سے، اسی امید سے کرتا ہے کہ اس مخصوص جگہ پر خون بہانے سے یہ بت مجھ سے راضی ہو گا اور یہ میری تکلیف دور کرے گا یا مجھے کوئی نفع دے گا۔ ہم کسی اہل اللہ، کسی نیک، کسی نبیؑ، کسی ولی کے مزار پر جا کر ذبح کرتے ہیں۔ اس امید سے، اس عقیدہ سے کہ یہ ذبح کرنے سے، یہ خون گرنے سے، یہ بندہ میرے لیے دعا کرے گا۔ اس کا بھی کوئی جواز تو نہیں ملتا۔ یہ رواج تو اُسی کفر سے اخذ کیا ہوا ملتا ہے۔ تو اس میں دو باتیں آ جائیں گی۔ ایک عقیدے کی خرابی، اور دوسرا وہ حلال جانور ہم نے کاٹ کر حرام کر دیا، اگرچہ اس پر تکبیر پڑھی۔

ایک نہایت اہم بات میں اور عرض کرتا چلوں۔ حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے۔ یہ ایک قانون ہے فقہ کا کہ جسے شریعت

نے حلال قرار دیا ہے، اسے حرام، یا جسے حرام قرار دیا ہے، اسے حلال سمجھنا، کفر ہے۔ تو اگر چوری کا جانور ہے، جیسے چوری کی ایک مرغی کوئی کھانا چاہتا ہیں تو اس پر تکبیر پڑھ کر ذبح نہیں کی جائے گی، اس کا جھٹکا کر کے کھائے گا۔ کیونکہ تکبیر پڑھنے سے چور کافر ہو جائے گا۔ مرغی چرانے سے وہ چور ہوا۔ اسے مردار کر کے کھانے سے حرام خور ہوا۔ لیکن تکبیر پڑھنے سے کافر ہو جائے گا۔ اس لیے کہ تکبیر پڑھ کے حرام کو حلال کرنا چاہتا ہے کہ فی نفسہ چوری حرام ہے، تکبیر پڑھتا ہے اس نظریئے سے کہ تکبیر پڑھنے سے حلال ہو جائے گی، پھر اسے حلال سمجھتا ہے تو حرام کو حلال سمجھنا یہ کفر ہے۔ یہ معاملات بڑے نازک ہیں۔ اگر اتنی نزاکت ہے تو پھر کسی مزار پر، مخصوص جگہ پر جا کر ذبح کرنا، یا اس غرض سے بکرا پالنا کہ میں اسے فلاں جگہ ہی ذبح کروں گا، یہ تو صحیح نہیں ہے۔

ہاں بزرگان دین کے ایصال ثواب کے لیے آپ کہیں کوئی جانور ذبح کریں، اللہ سے دعا کریں کہ جو ثواب مجھے اس کے صدقہ کرنے کا ملا ہے، وہ میں والدین کو، اپنے شیخ کو، اپنے استاد کو، فلاں بزرگ کو، فلاں ولی اللہ کو دینا چاہتا ہوں، میرے اللہ تو پہنچا دے، یہ درست ہے۔ یہ جائز طریقہ ہے۔ اس کے لیے مرنا ضروری نہیں ہے۔ آپ کسی زندہ کو بھی دے سکتے ہیں اپنے نفلی اعمال کا ثواب، نفلی حج کا ثواب، نفلی روزے کا ثواب، نفلی صدقات کا ثواب، ہم کسی زندہ یا کسی دنیا سے گزرنے والے کو دے سکتے ہیں کہ ہمیں مرنے والے یا زندہ رہنے والے سے غرض نہیں ہے، ہمیں رب العالمین سے درخواست کرنی ہے کہ اس پر جو نیکی مرتب ہوئی، میرے اللہ یہ فلاں کے حساب میں داخل کر دے۔ اور اس کا ثبوت عہد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے تعامل صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ملتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک طویل حدیث کا ایک حصہ ہے جو سیدنا ابوبکرؓ کے فضائل کے بارے ہے۔ نے فرمایا، ایک لمبی حدیث ہے، جس کا ایک حصہ ہے فضائل کا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ان تین راتوں کے جو انہیں غارِ ثور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں نصیب ہوئی تھیں۔ جس میں کوئی ان کا شریک نہیں تھا۔ اس عرصۂ غار میں ایک ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے اور ایک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ تو پوری توجہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ہستی کو نصیب ہو رہی تھی۔ اس کے فضائل جب بیان ہوئے تو سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا کر عرض کی کہ یا صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ نے سنا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے بارے ارشاد فرمایا کہ عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) ایسا آدمی ہے کہ اس کی نیکیاں ایسی ہیں جیسے اندھیری رات میں تاروں بھرا آسمان ہوتا ہے اور کوئی گن نہیں پاتا۔ فرمایا، سنا۔ عمرؓ کہنے لگے، پھر ساری نیکیاں لے لیں اور غار کی تین راتوں میں سے ایک رات مجھے دے دیں۔ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا۔

یعنی آپ کے جو نفلی اعمال ہیں، آپ وہ ایک دوسرے کو دے سکتے ہیں۔ یہ آپ کا اپنا بینک بیلنس ہے۔ لیکن یہ نذر ماننا اور اس طرح سے ذبح کرنا یقیناً دوسری مد میں ہی جائے گا۔

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ ۔ اللہ کریم فرماتے ہیں، کافروں کے لیے (Loophole) نہیں

رکھا۔ کافرانہ رسومات کا اسلام میں داخل ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر کوئی کافروں سے رسم لیتا ہے تو وہ بدستور ناجائز اور نارواہ رہے گی۔ اس کی اسلامائزیشن نہیں ہوسکتی۔ یہ جو عادتیں ہم کافروں کی اپنا لیتے ہیں اور انہیں کوئی نام دے دیتے ہیں جیسے اسلامی سوشلزم، یہ دھوکا ہے۔ کفر کے لئے اسلام میں کوئی رتی برابر گنجائش نہیں ہے۔ **اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ** کافروں کو اسلام سے اب کوئی توقع نہیں رہی کہ ان کی بھی کسی بات پر اسلام میں عمل کرنے کی اجازت ہوگی۔ کسی غیر اسلامی رسم کسی رواج کو کوئی اسلام میں داخل نہیں کرسکتا۔ اسے اسلام کا لبادہ نہیں پہنا سکتا۔ آپ اس کو مسلمان نہیں کر سکتے۔ اسلام انہی احکام کا نام ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔ ان میں کافروں سے رواج ادھار لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

فَلَا تَخْشَوْهُمْ اور کافروں سے ڈرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ کافر تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ خود نہ صرف مخلوق اور محتاج ہیں بلکہ اللہ کے مغضوب اور اللہ سے دور اور اللہ کے غضب کی زد میں ہیں۔ جب کہ تمہارے ساتھ اللہ کا کرم ہے، اللہ کی رحمت ہے، اللہ کی مدد ہے۔ لیکن فرمایا بات یہ ہے، یہ حال تب ہوگا **وَاخْشَوْنِ** مجھ سے ڈرتے ہوگے۔ اگر تم نے مجھ سے بھی ڈرنا چھوڑ دیا تو پھر کافر سے ڈرنا پڑے گا کہ تم میری مدد سے میرے تعاون سے میری معیت سے میرے ساتھ سے محروم ہو جاؤ گے، تو شرط یہ ہے کہ مجھ سے ڈرتے رہو۔ میرا ڈر تمہیں ساری مخلوق کے ڈر سے اور کافروں کی بڑی بڑی طاقتوں کے ڈر سے آزاد کر دے گا۔ اور تم وہ خوش نصیب لوگ ہو جن کے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا گیا جس میں کوئی تبدیلی، کسی نئی ایجاد کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اس سے پہلے کوئی دین ایسا نہیں تھا جو ہمیشہ کے لیے مکمل کر دیا گیا ہو۔ وقتی ضرورت کے تحت، علاقائی ضرورت کے تحت، قومی مزاج کے مطابق، ادیان اور ان میں عبادات کا حکم دیا گیا، وہ مزاج بدلے، وہ قومیں گئیں، وہ ملک بدلے، تو نئے دین آ گئے۔ اللہ نے نبی بھیجے، نئی کتابیں بھیجیں، لیکن تم وہ خوش نصیب ہو۔ **اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ**۔ تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے مکمل کر دیا۔ تمہیں کبھی بھی کسی کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں اور تمہیں ایسا قابلِ عمل طرزِ حیات تمہیں دیا کہ جو ہر قوم میں، ہر ملک میں، ہر موسم میں، اور ہر حال میں جب تک دنیا قائم ہے، قابل عمل رہے گا۔

وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ۔ دین کا مکمل ہونا معمولی بات نہیں ہے۔ دین نام ہے ان ذرائع کا، جن سے بندہ اللہ سے انعامات حاصل کرتا ہے۔ تو اگر تم پر دین مکمل کر دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنی نعمتیں خالق کو اپنی انسانی مخلوق کو دینا منظور تھیں، وہ سب دروازے تم پر کھول دیے۔ ایسا کوئی انعام نہیں ہوگا جو امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو دیا جائے۔ یعنی دین کی تکمیل کا معنی یہ ہے کہ میں نے وہ نعمتیں، جو بندہ خالق سے حاصل کرسکتا ہے وہ ساری کی ساری تمہارے دین میں سمو دیں، مکمل کر دیں اور کوئی ایسا بندہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیدا نہیں ہوگا جو یہ دعویٰ کر سکے کہ مجھے یہ زیادہ انعام ملا ہے۔ جو اس امت کو حاصل نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں، تمام انعامات تم پر نچھاور کر دیے گئے۔ لیکن یہ یاد رکھو!

وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ یہ سارے انعامات اور میری رضا دینِ اسلام میں ہیں، کافرانہ رسومات کو اسلام

کے نام پر اپنانے میں نہیں۔یعنی اس کی ٹھوس ضمانت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں ہے۔یہ جو ہم کرتے ہیں، تھوڑا سا کچھ لو اور کچھ دو، جسے (Compromise) یا سمجھوتہ کہتے ہیں۔اسلام میں، اسلام پر، سمجھوتہ نہیں ہے۔کافر کے ساتھ بھی صلح ہے لیکن اسلام پر نہیں۔اگر وہ اپنا کفر محفوظ کرنے کے لیے صلح کرتا ہے تو مسلمان بھی اس حد تک جا سکتا ہے کہ جہاں تک اس کا اسلام محفوظ رہے۔سمجھوتہ یا صلح حالات پر ہے، اسلام پر یا اصولوں پر نہیں۔تو ہم جو سمجھوتے کرتے ہیں کہ جی کیا کریں دنیا میں رہنا ہے، سود کھائے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔تو اسلام نہیں رہے گا، گزارا ہوتا رہے گا۔اور اگر بحیثیت مسلمان رہنا ہے تو سادہ سی بات ہے، کوئی سمجھوتہ نہیں۔اس میں کوئی جواز کسی دلیل کی کوئی حیثیت نہیں۔جو اللہ نے حرام کر دیا وہ کسی دلیل سے حلال نہیں۔

ہاں ایک بات ہے۔**فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ** اگر کوئی کسی ویرانے میں ہے۔کہیں اسے کوئی غذا نہ مل رہی ہو پیٹ بھرنے کے لیے، مزہ لینے کے لیے نہیں، صرف (Survive) زندگی بچانے کے لیے، حلال غذا کے مواقع تک پہنچنے کے لیے حرام بھی کھالے تو اس پر گناہ نہیں ہوگا۔اس میں ایک بات عرض کرتا چلوں۔اس میں ایک بات داخل کر دی گئی ہے کہ جی بیماری میں علاج کے طور، پر دوا کے طور، مثلاً کسی مریض کو شراب دوا کے طور پر دے دی جائے، جائز ہے۔یاد رکھیں! اس کی کوئی گنجائش نہیں۔حرام میں کوئی شفا نہیں ہے اور حرام کوئی علاج نہیں۔یہ غلط ہے، ناروا ہے کہ جی وہ مر رہا تھا تو اسے ہم کیسے نہ دیتے۔تو مرنے والے کو حرام بھی کھلا دیں، وہ غریب مرتو پھر بھی جائے گا۔اسے آخری دفعہ حرام مت کھلائیے۔بیماری کے لیے دوا کے طور پر حرام جائز نہیں۔مجھے اس کی کوئی دلیل نہیں ملی، کسی کے پاس کوئی دلیل ہو تو الگ بات ہے۔جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، میرے علم میں یہ بات ہے کہ حرام میں سرے سے شفا ہے ہی نہیں۔اگر اس میں شفا ہوتی اللہ اسے حرام نہ کرتا۔اگر اس میں اصلاح کا پہلو ہوتا اللہ اسے اپنے بندوں سے روکتا ہی نہیں۔جن چیزوں کو حرام کیا گیا ہے ان میں ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ ان میں انسان کی صحت کے لیے خرابیاں ہیں۔مثلاً خنزیر کے گوشت پر ہمارے ایک ساتھی نے برطانیہ رہ کر ریسرچ کی اور اتنی بڑی کتاب لکھی، (اسلامی نقطہ نظر سے نہیں سائنس کے نقطہ نظر سے) اور اس میں ثابت کیا کہ خنزیر کے گوشت کو آپ کتنا بوائل کر لیں، کتنا ہی فریز کر لیں ساری بیماریاں، اور ان کے جو پیدا ہونے کے امکانات ہیں، اس میں ہر وقت موجود رہتے ہیں۔برطانیہ میں چونکہ کتابیں ہماری طرح نہیں چھپتیں کہ کتاب چھپ گئی، پھر ہم نے وزارت کو بھیج دی، انہوں نے دیکھی اور کہا کہ یہ بین (ban) کر و اور پھر دکانوں پر بھاگے۔نہیں! وہ کہتے ہیں پہلے مسودہ دکھاؤ، پھر چھاپنے کی اجازت ملے گی تب چھاپو۔وہ ساتھی متعلقہ وزارت کے پاس مسودہ لے گیا انہوں نے دیکھا اور کہا کہ آپ نہیں چھاپ سکتے۔تو اس نے انہیں لکھا کہ یہ ایک سائنٹیفک تجزیہ ہے اور میرے پاس اس کے دلائل ہیں۔یا آپ میری تحقیق غلط ثابت کریں یا مجھے چھاپنے کی اجازت دیں۔اور اگر میری یہ ریسرچ غلط ہے تو مجھے بتائیں کہ کہاں غلطی ہے۔

تو اس کا جواب جو انہوں نے دیا وہ یہ تھا کہ آپ کی ریسرچ کے ساتھ ہم متفق ہیں، لیکن اگر یہ کتاب چھپ جائے اور لوگ خنزیر کھانا چھوڑ دیں تو یورپ میں گوشت کا بحران پیدا ہو جائے گا۔ حکومت گوشت پورا نہیں کر سکتی، ہماری مجبوری ہے، لہذا ہم چھاپنے کی اجازت نہیں دیتے۔ تو میرا یہ عرض کرنے کا مطلب ہے کہ حرام میں شفا نہیں ہوتی۔ اس لیے شفا کا بہانہ نہیں بنے گا۔

یَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَآ اُحِلَّ لَھُمْ بات تو وہی آ گئی جو میں عرض کر رہا تھا کہ یہ پوچھتے ہیں کہ پھر حلال کیا ہے؟ انہیں فرما دیجیے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم۔ **اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ** جتنی پاکیزہ چیزیں تھیں، اللہ نے حلال کر دیں۔ جتنی تمہارے فائدے کی چیزیں تھیں، وہ حلال کر دیں۔ جتنی تمہارے لیے نافع تھیں، ان کے حلال کرنے کا طریقہ تمہیں بتا دیا۔ حرام میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کوئی طبی سائنٹیفک ریسرچ کسی طرح بھی اسے مفید ثابت نہیں کر سکتی۔ **اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ** ساری پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لیے حلال کر دی ہیں اور تم تو جانتے ہو کہ اللہ نے تمہارے ساتھ کتنی رعائتیں کی ہیں کہ تم کتے کو شکار پر سدھا لو تو وہ جو شکار پکڑ کر تمہیں دیتا ہے، اگر وہ اتنی دیر شکار کو روک کے رکھے کہ تم جا کر ذبح کر لو تو اللہ کتے کا پکڑا ہوا بھی تمہارے لیے حلال کر دیتا ہے۔ جہاں شکار کے دوسرے ذرائع نہیں ہیں اور کتوں سے شکار کیا جاتا ہے، تو شکار زندگی کی ضرورت ہے، وہاں شکاری کتے پالنے کی اجازت دے دی۔ اللہ نے تمہارے ساتھ کتنی رعائتیں کیں۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ جو محض تماشا دیکھنے کے لیے خرگوشوں کے پیچھے بھگانے کے لیے لاکھوں روپے کے کتے پالتے ہیں، اس کا کوئی جواز ہے۔ جواز اس بات کا ہے کہ کچھ قبائل ایسی جگہ رہتے ہیں جن کے پاس جدید ہتھیار نہیں ہیں، یا شکار ایسا ہے جو جدید ہتھیار (Weapon) سے نہیں ہوتا تو اس کے لیے شکاری کتے پالتے ہیں، یا ایک حد تک کہ شکار پر ان کا گزارا ہے یا وہ شکار کھانے کے لیے کرتے ہیں گزارے سے آگے بڑھ کر شکار کا ایک اور مقصد بھی ہے جس کا میں بڑا قائل ہوں۔

مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ شکار کر کے گوشت کھایا کرتے تھے۔ تو کسی نے ان سے سوال کیا کہ دہلی کے بازاروں میں ہرن کا گوشت تک بکتا ہے اور لوگ شکار بھی اتنا کر کے لاتے ہیں کہ شکار کا گوشت بازار میں ملتا ہے تو آپ پھر شکار کے لیے جاتے ہیں؟ فرمانے لگے کہ شکار کا گوشت **اطیب الرزق**، سب سے پاکیزہ رزق ہوتا ہے جو بندہ براہ راست اللہ سے لے لیتا ہے۔ میں منڈی ہی سے بچنے کے لئے تو شکار کرنے جاتا ہوں میں جو شکار کرتا ہوں اس لیے کرتا ہوں کہ وہ رزق جو براہ راست مل رہا ہے، جس میں کوئی کاروباری ادارہ شریک نہیں، کسی کا لین دین نہیں، کسی دکاندار کا کوئی شکوہ شکایت نہیں، کوئی آمیزش نہیں۔ اللہ کا جانور تھا، اللہ کے نام پر زخمی کیا، اللہ کے نام پر ذبح کیا، کھا لیا۔ یعنی بندہ جو رزق براہ راست اللہ سے لے لیتا ہے، سب سے پاکیزہ ہے **اطیب الرزق** ہے۔

تو اس غرض سے کوئی شکار کرتا ہے یا اس کا گزارا شکار پر ہے، تو یہ جواز کی صورتیں ہیں۔ شکار ورزش کا بہترین طریقہ ہے نشانہ بازی کا بہترین طریقہ ہے اور بہترین کھیل بھی ہے۔ حلال جانوروں کا شکار کرنا مسلمان کے لیے بہت سے فوائد کا

اور بہت سی چیزوں کا جامع ہے۔ یہ بری بات نہیں ہے۔ لیکن عیاشی کے لیے شکار کرنا محض کتے پالنا اور خرگوش بھگا کر تماشا دیکھنا اور شرطیں لگانا اور اپنے اپنے کتوں کے نام پر جھنڈے اٹھانا، اس کا کوئی جواز نہیں۔ یہ ساری چیزیں حرام ہیں۔

فرمایا **فَكُلُوا مِمَّا أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهِ** اگر شکاری کتا بھی شکار پکڑ کر رکھے تو وہ شکار کھاؤ جو اس نے تمہارے لیے پکڑ رکھا ہے۔ لیکن تم نے اسے ذبح اللہ کے نام پر کیا ہے۔ بعض حضرات فقہی اعتبار سے اس بات کے قائل ہیں کہ سدھایا ہوا شکاری کتا شکار پر چھوڑتے وقت اگر کسی نے تکبیر پڑھی ہے تو اس کتے کا شکار اس کے منہ میں مر گیا تو حلال ہے۔ لیکن میں اس مکتب فکر سے متفق نہیں ہوں۔ چونکہ قرآنی آیات سے جو استدلال ہوتا ہے اور فقہ میں جو دوسرا طبقہ ہے جو اس کے جواز کا قائل نہیں۔ ان کے دلائل زیادہ مضبوط ہیں کہ یہاں اللہ نے فرمادیا ''**فکلوا مما امسکن علیکم**'' وہ جانور کھاؤ جو شکاری کتے نے پکڑ کر تمہارے لئے روک لیا **واذکرو اسم اللہ علیہ** تم اس پر تکبیر پڑھو۔ تو جو یہاں سے سمجھ آتی ہے، جس فریق نے یہاں سے یہ حاصل کیا کہ شکاری سدھائے ہوئے کتے کا مرا ہوا نہیں بلکہ اس کا روکا ہوا زخمی جانور اگر ذبح کر لیا جائے تو حلال ہے۔ میرا اتفاق اس خیال سے ہے لیکن میں تردید نہیں کرتا۔ علماء کا ایک بہت بڑا طبقہ اس بات کا بھی قائل ہے کہ سدھایا ہوا کتا بھی اگر تکبیر پڑھ کر چھوڑا جائے اور شکار مر جائے تو وہ حلال ہے تو یہ دو پہلو ہیں، جس طرف کوئی چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اور اصل بات یہ ہے کہ شکار کیا ہوا گوشت کھانا ہو یا دال اور سبزی نصیب ہو، اصل نظریۂ حیات مسلمان کا ہے **وَاتَّقُوا اللَّهَ** اللہ سے اپنا تعلق اور رشتہ استوار رکھے، تو وہ پہلو اختیار کرو جس میں زیادہ رضائے الٰہی ہو، جس میں اللہ کی ناراضگی کا خوف نہ ہو۔

اس ضمن میں یاد رہے کہ اللہ کریم نے جو مرض پیدا کیا ہے، اس کا علاج بھی ہے۔ اور کسی ناجائز شئے کو محض آسان علاج سمجھ کر اختیار نہ کر لیا جائے بلکہ اس کے متبادل علاج کئے جائیں۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ کافر کا خون مومن کو دینا جائز ہے؟ تو اگرچہ وہ خون رگ میں دیا جاتا ہے اور اس میں کھانے پینے کے احکام نہیں ہوتے لیکن کفر تو بہت بری چیز ہے۔ بدکار کا خون بھی انسانی مزاج کو مسخ کر دیتا ہے۔ جس طرح نشہ کرنے والے لوگوں کا خون امراض پیدا کرتا ہے اور بندے کو خراب کرتا ہے، اسی طرح بدکار آدمی کا خون اپنے اثرات پیدا کرتا ہے۔ کافر کا دیا جائے گا تو اس کا مزاج مسخ کر دے گا اور اس کا ایمان خطرے میں ڈال دے گا۔ اس لیے ان چیزوں سے اللہ محفوظ رکھے پوری کوشش سے ان سے بچا جائے۔

مزید تفصیل کے لیے سورۃ المائدہ اسرار التنزیل جلد دوم صفحہ نمبر 150، 151، 152 پر پڑھ سکتے ہیں اس کے علاوہ اکرم التفاسیر بھی ملاحظہ فرمائیں۔

☆ ☆ ☆

سبق نمبر ۷: سورۃ الاعراف

آیت ۱۵۸

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا

آپ فرما دیجیے کہ اے لوگو! یقیناً میں تم سب کی طرف اللہ کا پیغمبر ہوں (وہ)

الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ

جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی (حقیقی) حکومت ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں

وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ

وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے پیغمبر نبی امی (حضرت محمد ﷺ) پر جو

يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

(خود) اللہ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی پیروی کرو تاکہ تم راہ راست پر آجاؤ۔

ظہورِ اسلام سے پہلے دنیا میں کسی بھی ایسے انسان کے لیے جو انسانی اقدار سے، یا انسانی تاریخ سے، یا اپنے پہلے گزرنے والے انسانوں سے، کچھ بھی واقفیت رکھتا تھا، یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی کہ اللہ کی طرف سے کوئی نبی مبعوث ہوا ہو۔ یہ اتنی معروف بات تھی کہ ماننا یا نہ ماننا یہ دوسرا پہلو ہے، لیکن جانتے سبھی لوگ تھے۔ اسلام میں جو بہت بڑی اور بالکل نئی بات آئی، وہ یہ تھی کہ ایسا نبی اور ایسا رسول صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوا جو بیک وقت ساری انسانیت کے لیے تھا۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ انبیاء علیہ الصلوۃ والسلام مخصوص علاقوں کے لیے مخصوص اقوام کے لیے، اور مخصوص اوقات کے لیے مبعوث ہوئے۔ اس لیے کہ ہر قوم کا مزاج اس کی علمی استعداد اس کا ماحول مختلف تھا۔ ان کے تقاضے مختلف تھے۔ رب کریم نے انسانوں پر رحم فرماتے ہوئے، ان کی استعداد، اور ان کے ماحول جو انہیں اللہ نے میسر فرمایا تھا، اس کے مطابق ان پر احکام نازل فرمائے۔ کیونکہ عقائد تو بنیادی چیز ہیں۔ آدم علیہ السلام سے لے کر خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء علیہ الصلوۃ والسلام نے ایک ہی عقیدے کی تعلیم دی۔ اللہ کی توحید کی تعلیم دی، آخرت کی خبر دی۔ فرشتوں کے وجود کی خبر دی۔ اپنے نبیؐ اور رسولؐ ہونے کی خبر دی اور کتاب یا احکام لائے جو بندوں تک پہنچائے۔ تو عقائد میں تبدیلی کا سوال ہی

پیدا نہیں ہوتا۔ ماحول اور معاشرے کے اعتبار سے احکام بدلتے رہتے۔ اور ایسا بھی ہوا کہ ایک ایک وقت میں، ایک ایک شہر، ایک ایک آبادی میں متعدد انبیاءؑ مبعوث ہوئے۔ اور ایسا بھی ہوا کہ ایک فاصلے ایک حد پر جا کر ایک نبیؑ کے احکام کی حد ختم ہو جاتی، دوسرے کی شروع ہو جاتی۔ جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام ہمعصر تھے درمیان میں ایک چھوٹا سا دریا پڑتا تھا۔ اس کے اِس کنارے دینِ ابراہیمی کا اتباع تھا اس سے اگلے کنارے لوط علیہ السلام کی لائی ہوئی شریعت نافذ تھی اور انؑ کا اتباع ضروری تھا تو جب اس طرح سے دین نازل ہوئے تو انسانوں کو اللہ نے اتنا علم نہیں دیا تھا۔ انسانیت اتنی باشعور نہیں ہوئی تھی، انسانیت اتنی بالغ نہیں ہوئی تھی اور ایسے زمانے تھے کہ لوگ ایک گاؤں میں ہی اپنی عمر پوری کر کے گزر جاتے اور ان کی ساری تگ وتاز وہیں تک محدود رہتی۔ پھر اپنے علاقوں سے باہر جانے والے لوگ تو بہت شاذ بہت کم اور نہ ہونے کے برابر ہوتے تھے۔ لیکن جوں جوں انسانی عقل بڑھی اور انسانیت بالغ ہوئی، لوگوں کی آنکھیں کھلیں اور لوگوں نے اپنی تگ وتاز کا دائرہ وسیع کیا، مختلف ذرائع آمد و رفت بن گئے نقل وحمل کے لیے اور بات کو دور تک پہنچانے کے ذرائع وجود میں آئے تو یہ ایک پیش خیمہ تھا اس بات کا کہ انسانیت اب اس سطح پر، اس مقام پر، پہنچنے والی ہے کہ سارے انسان ایک دوسرے کے حال سے باخبر ہوں اور ایک وقت میں ایک انسان سارے موسموں سے گزر جائے، سارے علاقوں سے گزر جائے، اس کا امکان پیدا ہو چلا تھا۔ تو رب کریم کی رحمت ایسی ہے کہ ضرورت پیدا ہونے سے پہلے اس کی تکمیل کے اسباب بھیج دیتے ہیں۔ تو اللہ نے انسانوں کو اس مقام پر پہنچنے سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے وہ نبوت اور وہ دستورِ حیات اور وہ فقہ اور طرزِ عمل عطا فرما دیا جو ساری انسانیت کے لیے بیک وقت قابل عمل تھا۔ سارے موسموں کے لیے، سارے زمانوں کے لیے، ساری زبانوں کے لیے، سارے ماحول کے لیے، قابلِ عمل لائحہ عمل بنا کر بھیج دیا۔ اس لیے کہ انسانی ضرورتیں نہیں بدلتیں۔ یعنی اگر لوگوں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا نہیں تھا تو کمی ان کے علم میں تھی، ضرورتوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ مغرب والوں کو بھی بھوک لگتی ہے، مشرق والوں کو بھی بھوک ستاتی ہے، اہل جنوب بھی پانی پیتے ہیں، اہل شمال کو بھی لباس اور کھانے پینے کی ضرورت ہے۔ معاشرے، گھر بار بنانا، بچے پالنا یا لوگوں سے خرید وفروخت کا تعلق قائم کرنا، معاشرے یا سوسائٹی سے یا حکومت اور ماتحتی کا ایک رشتہ قائم کرنا، یہ ہمیشہ سے انسان کی بنیادی ضرورتیں ہیں اور ہمیشہ کے لیے ہیں اور ہر ملک ہر خطے میں موجود ہیں۔ تو انسانی بنیادی ضرورتیں نہیں بدلتیں۔ تبدیلی کیا تھی؟ انسانی عقل میں، انسانی علم میں وہ چیزیں نہیں آتی تھیں کہ وہ دور دراز کے حالات سے واقف ہوتا، یا دوسروں کی ضرورتوں کو سمجھ سکتا، یا وہاں کے موسموں کو سمجھ سکتا، تو اللہ کریم نے انسان کو جب تک وہ استعداد نہیں دی، تب تک انسان علاقوں میں محصور رہے۔ تب تک مذہب بھی علاقائی رہے۔ مذہب کسی کو پریشان کرنے کے لئے نہیں ہوتا۔ اہل مذہب کی زندگی کو آسان اور آرام دہ اور خوبصورت بنانا، یہ مذہب کا کام ہے۔ تو جب انسانوں میں یہ استعداد پیدا ہونے لگی اور قافلے اونٹوں پر ایک دوسرے ممالک میں پہنچنے لگے، یا لوگ کشتیوں اور جہازوں میں بیٹھ کر سمندر

عبور کر کے دوسرے ممالک اور جزائر تک پہنچنے لگے، تو اللہ کریم نے آخری نبی اور آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر ساری انسانیت کے لیے قابل عمل اور بہترین دستورِ حیات بھی عطا فرما دیا۔ اور حکم دیا کہ فرما دیجیے کہ **یـٰٓـاَیُّھَا النَّاسُ** کہ اے اولادِ آدم! تم جہاں تک ہو اور جہاں کہیں ہو اور جب تک تمہاری نسل چلے گی **اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا** میں تم سب کے لیے اللہ کا رسول ہوں۔ یہاں بھی نئی نبوت اور رسالت کا امکان ختم کر دیا۔ جہاں تک اور جب **النَّاس** کا اطلاق کسی پر ہوگا، انسان کہیں بستا ہوگا، آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے کوئی نفوس کہیں ہوں گے، فرمایا **اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا** میں تم سب کے لیے اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں۔

ایک رسالت، ایک قانون، اور ساری انسانیت کے لیے کیسے قابل عمل ہوگا؟ اللہ کی توحید کو ماننا سب کے لیے ٹھیک بات ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لے آنا، آخرت پر یقین کرنا، یہ تو الگ بات ہے۔ لیکن دین تو نام ہے اس نظامِ حیات کا، اس طریقے اور طرزِ عمل کا، کہ انسان انسانوں کے ساتھ مل کر رہتے ہیں۔ تو جو عمل اپناتے ہیں، دین کہلاتا ہے، دین صرف عقیدے کا نام نہیں۔ عقیدہ اس عمل پر آمادہ کرنے کا بنیادی سبب ہے کہ جب اللہ کو مانتا ہے تو اللہ کے قانون کو بھی مانے گا۔ ویسے کرے گا جیسا کرنے کا اللہ نے حکم دیا۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ شمال والوں کے لیے وہی دستور قابل عمل ہو جو جنوب والوں کے لیے ہو اور مشرق والے بھی اس ضابطے پر عمل کریں جو مغرب والے اپنائیں۔ تو یہ کیسے ممکن ہے؟ فرمایا! یہ کسی بندے کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ میں کسی ایسے کی طرف سے مبعوث نہیں ہوا جو مغرب میں رہتا ہو۔ اور اہل مشرق کے مزاج کو یا اس کی ضروریات کو نہ سمجھتا ہو، یا جو شمال میں تو بستا ہو جنوب کے موسموں سے واقف نہ ہو یا جنوب میں رہتا ہو اور شمال والوں سے بے خبر ہو۔ میں اس اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں جو شمال والوں کو بھی پیدا کرتا ہے اور جنوب والے بھی اسی کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اہلِ مشرق کا دم بھی اسی کی اجازت سے چلتا ہے، اہلِ مغرب بھی اسی کی دی ہوئی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ میں اس اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں جس کی حکومت زمین پر ہی نہیں ہر شے پر، ساری کائنات پر، آسمانوں پر بھی ہے، جہاں سے کسی کے لیے بارش کا قطرہ چلتا ہے۔ جہاں سے کسی کے لیے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا نمو پاتا ہے۔ جہاں سے کسی تنفس کے لیے روزی کا سبب ہوتا ہے۔ جہاں سے کسی کے پیدا ہونے کے احکام صادر ہوتے ہیں۔ جہاں پر کسی کی موت کا فیصلہ ہوتا ہے۔ جہاں پر لوگوں کو رنگ بانٹے جاتے ہیں، شکلیں بانٹی جاتی ہیں، عقول تقسیم ہوتی ہیں، استعداد، سوچ، محبت و نفرت کے جذبات بانٹے جاتے ہیں۔ میں اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوں جو ان سب حکومتوں کا حاکم ہے۔ یعنی وہ ایک ایک بندے کی ادنیٰ سے ادنیٰ ضرورت کا خالق ہے۔ اس لیے اس نے سب انسانوں کے لیے اگر مجھے مبعوث فرمایا ہے، ایک قانون دیا ہے جو ساری انسانیت کے لیے قابلِ قبول ہے، یہ رسالت اگر ساری انسانیت کے لیے ہے تو اس کا اتباع ساری انسانیت کے لیے اس لیے آسان ہے کہ یہ اس کی دی ہوئی ہے۔ جس کے حکم سے ساری انسانیت پیدا ہوتی ہے۔ سارے لوگ اسی کے حکم

سے اسی کے بنائے ہوئے قواعد وضوابط کے مطابق پیدا ہوتے ہیں، سارے اسی سے زندگی اور صحت پاتے ہیں۔ سارے اسی کے حکم سے اسی کے بنائے ہوئے ضابطے اور قاعدے کے مطابق مرتے ہیں تو زندگی کے چند لمحات اس کی مرضی سے نہیں گزار سکتے؟ بھلا یہ کونسا ناممکن کام ہے! سارے لوگ بیمار اس کے فیصلے سے پڑتے ہیں۔ صحت اس کے فیصلے سے پاتے ہیں۔ روزی اس کے فیصلے سے پاتے ہیں۔ عقل وشعور اس کی عطا سے لیتے ہیں۔ رنگ، شکل، استعداد و قابلیت، عزت وذلت، سب کچھ اسی ایک سے لیتے ہیں تو پھر چند روزہ زندگی میں اس ایک کے بنائے ہوئے ضابطے میں کیا خلل آ گیا کہ کچھ لوگوں کے لیے قابل قبول ہے اور کچھ لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔ اگر ایسی بات ہے، تو ثابت کرو کہ جس ضابطے سے اہلِ مغرب پیدا ہوتے ہیں، اس ضابطے سے مشرق میں انسان پیدا نہیں ہوتے، کیا مشرق کا تقاضا کچھ اور ہے، مغرب کا تقاضا کچھ اور ہے۔ کوئی ہے فرق؟ جس طرح شمال کے بسنے والے سانس لیتے ہیں، کیا جنوب والے ویسے نہیں لیتے؟۔ وہاں کا ضابطہ اور ہے وہاں کے ماحول کا تقاضا اور ہے، کوئی فرق ہے؟ تو جب ساری تخلیق، ساری صنعت ایک صانع کی ہے۔ سب کو ایک ضابطے میں پرو دیا۔ سب ایک طرح سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے جیتے مرتے ہیں۔ ایک طرح سے بیمار وصحت یاب ہوتے ہیں تو سب کے لیے ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کر دے اور سب کے لیے ایک قانون بنا دے۔ جو ہمیشہ قابلِ عمل ہے۔ جو اسے قابلِ عمل نہیں سمجھتا، اس کی اپنی عقل وخرد میں فتور ہے، اس کی سمجھ میں کمی ہے۔ اس کے پاس ایمان کی طاقت نہیں ہے ورنہ اسلام اس ہستی کا بھیجا ہوا دستورِ حیات ہے جو مشرق، مغرب، شمال، جنوب ساری زمین ہی نہیں، بلکہ آسمانوں کی ساری مخلوق اور ہر زمانے کی، ہر جہاں کی، ساری مخلوق کی ساری حاجات، سارے ضابطے اس کے بنائے ہوئے ہیں، اس کے دیے ہوئے ہیں۔ انسانیت کو ایک کنبہ بنا دیا اور کتنی مزے کی بات ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی بات نہیں سمجھتے، ایک دوسرے سے واقف نہیں ہوتے، آپ کسی دور دراز کے ملک میں جاتے ہیں تو وہاں جو اذان ہو رہی ہوتی ہے، وہ وہی ہوتی ہے جو آپ کے محلے کی مسجد میں ہوتی ہے۔ آپ مسجد میں جاتے ہیں تو وضو کرنے میں کوئی پریشانی نہیں۔ زبان سمجھنے میں پریشانی ہے۔ واقف کوئی نہیں ہے لیکن ارکانِ دین میں سب ایک ہیں۔ جو وضو آپ گھر پر کرتے تھے، وہی وہاں بھی کرتے ہیں۔ جو وہاں کرتے ہیں وہی یہاں بھی کرتے ہیں۔ وہی تکبیر تحریمہ جو وہاں سنتے ہیں، وہی یہاں بھی ہوتی ہے۔ بلکہ اللہ کا احسان ہے کہ وضو تو یہاں کیا اور نماز کسی دوسرے ملک میں جا کر پڑھی۔ کتنی دفعہ اتفاق ہوا کہ میں یہاں سے نکلا باوضو تھا کہ کسی اور ملک میں نماز پڑھی۔ ہم دوبئی سے نکلے اور نماز لندن جا کر پڑھی۔ وضو وہاں ائیر پورٹ پر کیا۔ کہاں دوبئی کہاں لندن۔ وہ تعلیمات جو آپ یہاں سنتے ہیں، وہی وہاں سنتے ہیں۔ کتنا حسن دے دیا، کتنی یک رنگی دے دی، کتنی محبت اور کتنا انس اور کتنی یگانگت اور یکسانیت رب العزت نے انسان کو دے دی کہ وہاں کھڑے ہم وہ سنتے جو یہاں سنتے ہیں۔ وہی شے یہاں بھی حرام ہے، جو وہاں حرام ہے۔ وہی طرزِ عمل وہاں بھی جائز ہے جو یہاں جائز ہے۔ کھانے پینے کے، کسی کے گھر جانے، ملازمت کرنے کے،

خرید و فروخت کے، ہر ہر شعبے کے۔ زندگی کے ہر موڑ کے وہی قوانین وہاں موجود ہیں جو یہاں موجود ہیں۔ اس سے خوبصورت بھی بات کوئی اور ہوسکتی ہے۔ اور سوائے اللہ کے کوئی ایسا کر بھی سکتا ہے؟

ایک جگہ بیٹھ کر پوری روئے زمین کے لیے کوئی لائحہ عمل مرتب کر دے۔ اتنا کرنا کسی کے بس میں نہیں، یہ اسی کا کام ہے جو سارے انسانوں کا خالق ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا اور یہ بڑی دیدہ دلیری سے کہہ دینا ہے، کہ اسلام دورِ جدید کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا، یہ قرآن کا انکار ہے یہ بڑا صریح اور واضح کفر ہے۔ علامہ زین العابدین شامی رحمتہ اللہ علیہ نے بڑی مزیدار بات لکھی ہے کہ اکثر لوگ ایسے ہیں جن کا روزانہ نکاح کرنا چاہیے ایسے جاہل ہیں کہ وہ دل سے نہیں چاہتے کہ کفر بکیں، مگر یہی کلمات کا فرانہ کہہ جاتے ہیں کہ جی اس زمانے میں اسلام پر عمل ممکن ہی نہیں۔ کیسے ہوسکتا ہے۔ اب اس میں ایسے کھرے لوگ بھی آجاتے ہیں جو واقعی اسلام پر جان دینے کو تیار ہیں لیکن یہ بات دہراد ہرا کران کے منہ سے بھی کہلوائی جاتی ہے۔ تو علامہ شامی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایسا کہنے سے بندہ کافر ہو جاتا ہے۔ بیوی مومن ہے، بندہ کافر ہوگیا، نکاح تو ٹوٹ گیا۔ پھر دوبارہ وضو کر کے نماز میں کھڑا ہوگیا، دوبارہ مسلمان تو ہوگیا مگر نکاح تو باطل رہا۔ نکاح کافر ہونے سے ٹوٹا تھا، وہ تو باطل ویسے ہی رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جو آگے نسل چلے گی، وہ صحیح النسل نہیں ہوگی۔ پھر لوگ کہتے ہیں کہ بچے عزت نہیں کرتے۔ بھئی بچے تمہارے ہیں کہاں۔ اکثریت تو ایسی ہے کہ اصل نسب ثابت نہیں ہوتا۔ والد بزرگوار نکاح توڑ چکے ہوتے ہیں۔ تو اطاعت کس کی کریں گے جب ان کا وہ شرعی والد ہی نہیں۔ جو بچہ بغیر نکاح کے پیدا ہوا، اس بچے سے آپ امید رکھتے ہیں کہ وہ آپ کی عزت کرے گا۔ تو جب عامۃ الناس کا جو تعلق توالد و تناسل کا تھا اس کا یہی حشر ہوگیا تو ادب کہاں سے آئے گا۔ آپ نے اپنے آپ کو عزت کے قابل چھوڑا ہی کب ہے۔ ان کی پیدائش میں یوں خلل انداز ہوئے، ان کی تربیت مغربی تہذیب پر کی، نہ دینی نقطہ نظر سے ان کی پیدائش کا خیال رکھا اور نہ دینی تعلیم ان کے قریب پھٹکنے دی۔ اب ادب کو لیے پھرتے ہیں کہ بچہ ادب نہیں کرتا۔ تم نے کونسا ان پر احسان کیا ہے۔ تو یہ چھوٹے چھوٹے جملے کہنے سے پہلے یہ سوچنا چاہیے کہ ایسی بات کوئی زبان سے نہ نکلے جو قرآن یا اللہ کے ارشاد یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تکذیب کرتی ہو۔ ایسا کرنے سے بندہ کافر ہو جاتا ہے۔ خواہ بعد میں مسلمان بھی ہو جائے توبہ بھی کرلے تو کفر کا نقصان جو ہے وہ غیر شعوری طور پر اسے پہنچتا رہتا ہے اور نسلیں بگڑ جاتی ہیں۔ اور اسلامی معاشرے میں کنجروں کو کیوں پسند کیا جاتا ہے۔ برائی کیوں مرغوب ہوگئی ہے۔ کیوں ہر بندہ فحاشی پر جان فدا کرنے کو تیار ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ بندوں کی تولید اور ان کے مزاج میں بے حیائی آگئی ہے۔ بغیر نکاح کے پیدا ہوگا اس میں حیا کہاں سے آئے گی۔ وہ اچھی چیزوں کو پسند کیوں کرے گا۔ عمارت آپ نے کیچڑ سے بنائی ہے، اس سے آپ سیمنٹ کی مضبوطی کی توقع کیسے کرتے ہیں۔

ایک انسان کی تعمیر ہی غلاظت سے ہوئی ہے، اس سے بھلائی کی امید کیسے کی جاسکتی ہے۔ تو ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ

کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں سے فرمادیجیے کہ میں تم سب کے لیے اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں۔ اس اللہ کا جو سب کا پیدا کرنے والا ہے **هُوَ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ** وہ ہی سب کو پیدا کرتا ہے اور موت بھی دیتا ہے۔ زندگی اور موت کا اگر ایک قانون بنادیا ہے تو اس درمیانی فاصلے کے لیے ایک قانون دے دینا کوئی مشکل نہیں ہے، یہ قابل عمل ہے۔ بات صرف یہ ہے **فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ** کہ بھروسہ کرو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ جس کا اللہ کے علاوہ دنیا اور عالم اسباب میں کوئی استاد نہیں، کسی سے کچھ نہیں سیکھا، جس نے کسی مدرسے سے نہیں پڑھا، کسی قانون دان سے قانون نہیں سیکھا، کسی سیاست دان سے سیاست نہیں سیکھی، جس نے کسی جرنیل سے فوجی ٹریننگ حاصل نہیں کی، جس نے کسی ادارے سے کچھ نہیں سیکھا۔ لیکن ساری دنیا کے سارے نظاموں کی امامت کرتا ہے۔ یہی اس کی صداقت کی دلیل ہے کہ ہر مسئلے کا سیاسی ہو، مذہبی ہو، معاشی ہو، ہر مسئلے کا وہ حل بتاتا ہے جو بہترین ہو۔ یہی اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام ہونے کی دلیل ہے کہ وہ سیکھنے میں دنیا میں کسی کا محتاج نہیں، اور سکھانے میں ساری دنیا کا استاد ہے۔ کیا یہ دلیل کم ہے کہ آپ انسانی ضرورتوں کو سامنے رکھیں، زندگی گزارنے کا سلوب جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے اسے سامنے رکھ کے دیکھیں۔ کہ بڑے سے بڑا مدبر اس سے بہتر بات سوچ سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے بہترین بات کہاں سے سیکھی؟ اللہ سے، جس کا رسول ہے صلی اللہ علیہ وسلم۔ تو فرمایا اللہ پر یقین کرو اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مانو۔ جو دنیا میں کسی کا شاگرد نہیں ہے۔ دنیوی اعتبار سے ان پڑھ ہے۔ جو لغتِ دنیا کے اعتبار سے اَن پڑھ ہے لیکن سارے علوم کے خزانے لبِ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے پھوٹتے ہیں۔ یہ اسلوب ہے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا۔ پوری کائنات کو سکھانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب جلیلہ ہے۔ اگر اتنا کمال جو ہمارے سامنے ہے اور جو اندھے بھی دیکھ رہے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے کچھ نہیں سیکھا اور ساری کائنات کو سب کچھ سکھایا۔ تو پھر بھی کیوں یقین نہیں کرتے۔ پھر تمہیں شبہ رہتا ہے کہ پتہ نہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قابل عمل ہے کہ نہیں ہے۔ کیا عجیب بات کرتے ہو۔ ایک بات اللہ کریم نے فرمادی۔ ساری دنیا ایسے مانے گی کہ جس طرح اس کے ایک حکم پر ساری دنیا کے لوگ پیدا ہوتے ہیں اور اس ایک کے حکم پر ساری دنیا کے لوگ مرتے ہیں۔ اگر پیدا ہونے اور مرنے کا ایک قانون اللہ کا اپنایا جا سکتا ہے تو پھر درمیانی وقفے کا ایک قانون بھی اپنایا جا سکتا ہے۔ کتنی خوبصورت بات کہی ہے قرآن نے۔ ایک مختصر سے جملے میں بیان فرمادی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ثابت کرنے کے لیے ایک بات کہہ دی۔ ہر دور کے دانشوروں کو جمع کرلو، کسی دور کا کوئی دانشور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا استاد ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اور سارے زمانے کے دانشوروں کو ایک جگہ جمع کرلو، کوئی اس کے شاگردوں کے کفِ پا کو بھی نہیں پا سکتا۔ یعنی پڑھنے میں وہ کسی کا محتاج نہیں اور پڑھانے میں وہ پوری دنیا کا استاد ہے۔ کس کی بات کرتے ہو تم اور اس پر تمہاری سمجھ اور تمہاری رائے کہ قابل عمل نہیں! اس ہستی کے بارے جس نے کائنات میں ہر موضوع پر علم کے دریا بہادیے اور وہ اللہ کا ایسا کھرا بندہ ہے صلی اللہ علیہ وسلم

کہ وہ اللہ ہی کی بات کو مانتا ہے یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ کوئی اس کا مقتدا و پیشوا نہیں ہے۔ وہ کسی کے پیچھے نہیں چلتا، ساری بات اللہ سے لیتا ہے۔ ساری بات اس کی مانتا ہے تو تم صرف ایک کام کرو، تم اس کی غلامی کرلو، تم اللہ سے مل جاؤ گے۔ یہ ایسی ہستی ہے کہ اگر تم اس کا دامن پکڑلو، اس کے پیچھے چلنا شروع کردو، اونچ نیچ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہیں سیدھا واصل باللہ کردے گا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ تاکہ تم ہدایت پاسکو۔ جب سنتیں ہم سے چھوٹیں تو گویا ہدایت چھوٹ گئی۔ ہم راہ گم کردہ ہوگئے۔ اگر ایک آدمی ساری عمر چلتا بھی رہے، اس کی سمت کعبے کے الٹ ہو تو کیا وہ بیت اللہ پہنچے گا؟ سفر تو دوسری سمت کو کررہا ہے۔ صرف چلنا تو مقصد نہیں ہے چلنا اور صحیح سمت چلنا شرط ہے۔ فرمایا زندگی کے شب و روز تو گزارتے رہو گے لیکن اگر دامان رسالت تم سے چھوٹ گیا تو سمت بدل جائے گی۔ تو بجائے قریب ہونے کے اللہ سے دو تے چلے جاؤ گے۔ قریب ہونے کے لیے ساری انسانیت کے کرنے کا صرف ایک کام ہے، اس کا اتباع کرلو۔

مزید مطالعہ کے لئے الاعراف کی انہی آیات کی تفسیر اسرار التنزیل اور تفسیر اکرم التفاسیر سے ملاحظہ فرمائیں۔

☆ ☆ ☆

سبق نمبر ۸: سورۃ البقرۃ

آیت ۱۵۲ تا ۱۵۴

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا

پس تم مجھ کو یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر ادا کرو اور

تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ

ناشکری نہ کرو۔ اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد

وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا

حاصل کرو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔ اور جو اللہ کی

لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ

راہ میں قتل ہو جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں

وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

اور لیکن تم سمجھ نہیں سکتے۔

آج کے سبق میں البقرہ کی 152 نمبر آیت ہے۔ اللہ کریم نے اس میں ارشاد فرمایا ہے کہ تم مجھے یاد رکھو، تم میرا ذکر کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ اور میرا شکر ادا کرو، ناشکری کے قریب مت جاؤ۔ قرآن حکیم نے خود قرآن کو بھی ذکر کہا ہے۔ عبادات کو ذکر کہا ہے اور اللہ کے ذاتی نام اور اسم ذات کی تکرار کا حکم دے کر اسے بھی ذکر کہا ہے۔ اب یہ درجہ بندی کرنا کہ ان میں سے کون سا ذکر ضروری ہے اور کون سا غیر ضروری، یہ صحیح نہیں۔ بلکہ جان لینا چاہیے کہ یہ سارے ذکر کے مختلف درجے ہیں۔ ذکر کی بنیادی بات ہے یاد، تو ہر وہ عمل جس سے اللہ کی یاد وابستہ ہو، ہر وہ کام جس کے کرنے سے مسلمان رک جائے کہ اللہ نے اس کے کرنے کی اجازت نہیں دی، اس کے ساتھ اللہ کی یاد وابستہ ہے تو وہ عملاً ذکر شمار ہوتا ہے۔ ہر وہ کام جو ایک مسلمان اس نیت سے کرتا ہے کہ یہ کام کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، تو اس کام کا کرنا ذکرِ الٰہی ہی شمار ہوگا اور عملی طور پر اسے ذکر کہا جائے گا۔ اب اس میں دوسرا درجہ ہے ذکرِ لسانی کا۔ اس میں نماز ہے، تسبیحات ہیں، تلاوتِ قرآن پاک ہے۔ حدیث

شریف کا بیان ہے یا دین کی یا نیکی کی یا بھلائی کی کوئی بھی بات یا ہر وہ بات جو کسی کو برائی سے روکنے کے لئے کی جائے، امر بالمعروف یا نہی عن المنکر غرضیکہ ہر وہ بات جس کے ساتھ اللہ کی یاد وابستہ ہو کہ یہ نہ کرو اللہ ناراض ہوں گے، ایسا کرو اللہ کریم راضی ہوں گے تو یہ لسانی ذکر کہلائے گا۔ یہ دوسرا درجہ ہے جو عملی ذکر سے زیادہ کیا جاتا ہے کہ آدمی اتنا کام نہیں کرتا دن بھر میں جتنا وہ زبان چلاتا ہے۔ اور تیسرا اور اعلیٰ درجہ اس کا یہ ہے کہ بندے کا دل ذاکر ہو جائے۔

دل وجودِ انسانی میں ایک ایسا حصہ ہے جو خون کی صورت میں سارے وجود کو غذا فراہم کرتا ہے۔ باقی اعضاء مفلوج بھی ہو جائیں تو کام چلتا رہتا ہے۔ یعنی ہاتھ، بازوں، ٹانگوں کے بغیر آدمی اپاہج تو ہو جاتا ہے لیکن زندگی کا رشتہ باقی رہتا ہے۔ اگر دل کام میں سستی کرے تو سارا نظام معطل ہو جاتا ہے اور کام چھوڑ دے تو حیات منقطع ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے شکمِ مادر میں وجودِ انسانی جو حرکت کرتا ہے، وہ دل کی دھڑکن ہے جس سے حیات کی نمو ہوتی ہے۔ تو سب سے پہلے دل دھڑکتا ہے اور عند الموت سب سے آخری حرکت دل کی ہوتی ہے۔ اس کی دھڑکن رکتی ہے تو سب حرکات رک جاتی ہیں۔ گویا دل کی دھڑکن عملی طور پر بھی وہ کام ہے جو زندگی میں ہر بندہ سب سے زیادہ کرتا ہے۔ رب کریم نے جو اپنے ذکر کا حکم دیا ہے **فَاذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيرًا** ۔ کہ زندگی میں سب سے زیادہ کام جو بندہ کرے (خواہ غیر ارادی ہی سہی) وہ اللہ کا ذکر ہو۔ دل کی دھڑکن سے بھی زیادہ، اگر جتنی بار دل دھڑکا ہے، زندگی میں اتنی بار ہی کسی نے ذکر کیا تو اس نے ذکر کثیر نہ کیا کہ اتنی بار تو دل بھی دھڑکا تھا، اس کے برابر کیا۔ کثرت سے تو مراد یہ ہوگی کہ دل ایک بار دھڑکے اور اللہ کا نام کئی بار لیا جائے اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ دل کی ہر دھڑکن میں یادِ الٰہی کو یوں سمو دیا جائے کہ اس کی ایک دھڑکن اللہ کا نام کئی بار لے۔ بندہ بے ہوش ہو جائے یا سو جائے یا کام پر ہو یا فارغ۔ دل جسے اصطلاحِ شریعت میں قلب کہا جاتا ہے یا قرآن جس قلب کی بات کرتا ہے، وہ یہ پمپنگ سٹیشن نہیں ہے بلکہ اس کے اندر ایک لطیفہ ربانی ہے۔ پمپنگ مشین دھڑکتا ہے، خون ایک طرف سے لیتا ہے دوسری طرف سپلائی کرتا ہے۔ خون تو سارے بدن میں جاتا ہے۔ خون آنکھوں میں جاتا ہے، دماغ میں بڑا نتھرا ہوا خون جاتا ہے۔ ایک ایک سیل تک، خواہ وہ کھال کا ہے یا گوشت کا یا ہڈی کا، ان سب کی حیات خون کے پہنچنے پر ہے۔ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق بدن کا ہر سیل خون لیتا ہے لیکن ہر سیل میں خواہش و آرزو پیدا نہیں ہوتی۔ خواہش جہاں جنم لیتی ہے وہ کوئی چیز اس پمپنگ سٹیشن کے اندر ہے۔ اور وہ ایک لطیفہء ربانی ہے جس میں آرزو کرنے کی، تمنا کرنے کی، چیزوں کو پرکھنے اور جانچنے کی، قوت فیصلہ کی، بندے پر حکومت کرنے کی استعداد ہوتی ہے۔ دماغ مادی ضرورتوں کی تعیین کرنے میں اور ان کی تکمیل میں بدن کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ علم الابدان (Physical Sciences) مومن ہو یا کافر، سب سیکھ لیتے ہیں۔ لیکن جسے قرآن قلب کہتا ہے وہ لطیفہء ربانی ہے جسے اللہ سے ہم کلام ہونے کی سعادت نصیب ہوتی ہے، جو ان حقائق کو دیکھتا ہے جنہیں آنکھ نہیں دیکھتی، ان حقائق کو سنتا ہے جنہیں ظاہری کان نہیں سنتے، جو ان چیزوں کے لئے تڑپ اٹھتا ہے جنہیں ظاہری

بدن محسوس ہی نہیں کر پاتا، ظاہری حواس انہیں سمجھ ہی نہیں پاتے، وہ لطیفۂ ربانی جو خطاب الٰہی کا سزاوار ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری ہے۔ **نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ** (سورۃ الشعراء: آیت نمبر 193) نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا دماغ تمام انسانوں میں بہترین تھا لیکن نزولِ قرآن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اطہر پر ہوا وہ جس کے بارے قرآن کہتا ہے **فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ** (الحج: 46) یہ کافر آنکھوں کے اندھے نہیں ہیں انہیں آنکھوں سے تو نظر آتا ہے یہ دل کی نگاہ کھو چکے۔ آنکھ مادی چیزوں کو دیکھتی ہے۔ دل کی نگاہ اس مادی شے میں بھی جمالِ باری کا مشاہدہ کرتی ہے۔ قلب، اگر ذاکر ہو جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دل بدن میں ایک لوتھڑا ہے اگر وہ درست ہو جائے۔۔۔۔۔ اگر وہ سدھر جائے، سارا بدن سدھر جاتا ہے، سارا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ خراب ہو جائے، بگڑ جائے تباہ ہو جائے **فسدت اذا فسدت جسد کلہ** تو انسانی وجود کے سارے نظام کو تباہ و برباد کر دیتا ہے۔ اس سے انسانیت کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ وہ ایک ڈھانچہ، ایک جانور، ایک حیوان رہ جاتا ہے۔ اس میں انسان نہیں رہتا۔ تو یہاں اس آیتِ مبارکہ میں اللہ کریم نے ارشاد فرمایا، کہ تم وہاں مجھے دل میں بسا لو، میں تمہیں یاد کروں گا۔ اب اللہ کریم کا علم تو ازلی ہے، قدیم ہے، ہمیشہ کے لیے ہے۔ بھولنے کا وہاں تصور نہیں۔ تو اس قسم کے الفاظ جب ذاتِ باری کی طرف ان کی نسبت ہوتی ہے تو ان سے معنی بعید مراد لیا جاتا ہے۔ معنی بعید وہ ہوتا ہے جو عمل اس مفہوم کا مظہر ہو۔ جو چیز ہمیں بھول جائے، خواہ وہ بڑی قیمتی ہو، کاٹھ کباڑ میں چلی جائے، ضائع ہو جائے، زنگ کھا جائے، ہم نہیں پوچھتے۔ تو جو یاد رہے، کم قیمت کی بھی ہو تو اسے روز جھاڑ پھونک کر صاف کر کے رکھتے ہیں۔ تو اللہ جل شانہٗ کا بھول جانا یہ ہے کہ اللہ اس کی پرواہ نہ کرے کہ کس کباڑ میں ضائع ہوتا ہے۔ اور رب کریم کا یاد رکھنا یہ ہے کہ وہ اس پر اپنے انعامات کرتا ہے۔ بندے کی یاد ہمیشہ مانگنے کے لیے ہے۔ یہ فقیر ہے۔ اللہ کی یاد عطا کے لیے ہے۔ وہ غنی ہے۔ تو فرمایا! تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا اور یہ یاد رکھنا ہی بہترین شکر ہے۔ اور میری جیسی ہستی کو میری مخلوق بھلا دے اس سے بڑا ناشکری کا کوئی تصور نہیں۔ اب یاد رکھنے سے ہماری توقعات انسانی شعور کے مطابق بہت نیچے آ جاتی ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ میں ہر وقت اللہ کو یاد کرتا ہوں، مجھے بیمار نہیں ہونا چاہیے، میرے کاروبار میں زیادہ منافع آنا چاہیے، میرے دنیوی مصائب دور ہونے چاہئیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں، بات یہ نہیں ہے، کوئی مجھے یاد کرنے سے میرے نظام میں مخل نہیں ہو سکتا۔ ایک نظامِ حیات میں نے ترتیب دے دیا ہے، جسے کوئی نہیں روک سکتا، جس میں کسی کی دخل اندازی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے یاد خود ہی بہت بڑا انعام ہے کہ تمہیں یہ توفیق ارزاں ہے کہ تم ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہو۔ یہی بہت بڑا انعام ہے کہ اُسے یاد کرنے کی توفیق تو ہے۔ جو یاد کریں گے انہیں بھی موسموں سے گزرنا ہو گا، گرمی سردی محسوس ہو گی، بڑھاپا آئے گا۔ جوانی گزرے گی۔ کبھی کوئی چیز ملے گی۔ کبھی بھوک و افلاس آ جائے گا۔ صحت و بیماری ہو گی۔ یعنی جسے آپ فطری طریقہ کار یا نیچرل پراسس (Natural Process) کہتے

ہیں، اس میں سے آپ کو گزرنا ہوگا۔ تو یادِ الٰہی کر کے یہ نہ سوچو کہ اب جو تم چاہتے ہو، اس طرح سے نظامِ کائنات تبدیل ہونا شروع ہو جائے۔ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھا تو ایک ساتھی کا خط آیا۔ اس نے بڑی شکایت کی کہ حضرت میرے مراقبات بڑے اچھے ہیں، مجھے منازل کی تفصیلات تک نظر آتی ہیں، بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری نصیب ہوتی ہے، بالائے عرش جاتا ہوں لیکن میں جو دعا کرتا ہوں وہ قبول نہیں ہوتی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو وہ خط ناگوار سا گزرا تو انہوں نے پڑھ کے مجھے پکڑا دیا کہ اسے جواب تم لکھ دو۔ تو میں نے اسے چند جملے لکھے کہ جب تم پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، تم پڑھے لکھے باشعور انسان نہیں تھے، تم چھوٹے سے بچے تھے، اپنی ضروریات بھی نہیں سمجھتے تھے، تب سے لے کر اس وقت تک وہ اپنی کائنات اکیلا ہی چلا رہا ہے۔ اب تم میں کچھ تھوڑی سی سمجھ آ گئی، تم چاہتے ہو تم اس کا ہاتھ بٹاؤ، لیکن کل پھر جب تم نہیں ہو گے پھر اسے اکیلا ہی چلانا پڑے گا۔ اس لئے وہ نہیں چاہتا کہ اس تھوڑے سے عرصے میں بھی تمہاری مدد لے اس لیے اس کو اپنا کام کرنے دو، وہ تمہارا احتاج نہیں ہے۔ تمہیں اس نے دعا مانگنے کا حق اس لیے دیا ہے کہ تم اس سے بات کرنے کی سعادت سے مشرف ہو جاؤ۔ یہ جو تم نے کہہ دیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ پہلے ہم اس کی عبادت کریں پھر وہ ہماری کرے۔ یعنی پہلے ہم اس کی بات مانیں پھر وہ ہماری بات مانے، یہ تم برابری کا سودا مت کرو، بندے ہی رہو۔

عبادت کرنے سے رضائے الٰہی نصیب ہوتی ہے۔ نظامِ کائنات اپنی روش پر چلتا رہتا ہے۔ ہاں ایک بہت بڑی تبدیلی آتی ہے کہ جس کا اللہ کے ساتھ محبت کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے، اس پر مصیبت بھی آئے تو اسے تڑپاتی اور بے قرار نہیں کرتی، سزا نہیں بنتی، تحفہ بن جاتی ہے۔ کیونکہ وہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میرا رب میرے ساتھ اتنا کریم ہے کہ میں اپنی بہتری خود بھی اتنی نہیں سوچتا جتنا کہ وہ میری بہتری کا خیال رکھتا ہے یا میری کسی کوتاہی کا اثر ہے مجھے پہنچنے والی کوئی تکلیف میری کسی خطا کا نتیجہ ہے۔ میں نے کوئی بد پرہیزی کی، اس سے پیٹ میں درد ہونا چاہیے تھا لیکن جتنا ہو رہا ہے، اس میں بھی اللہ کا احسان ہے کہ میری بد پرہیزی زیادہ ہوگی، درد کم ہو رہا ہے۔ اسے یہ احساس یہ شعور سکون بخشتا ہے۔ وہ مصیبت یا وہ بیماری اس کے لیے جزا کا سبب بن جاتی ہے اور بندے کے لیے اللہ کے مزید انعامات کا سبب بن جاتی ہے کہ وہ اس میں بھی صبر کرتا ہے شکر کرتا ہے تو وہ ترقی درجات کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لیے نافرمانوں کو جو مصیبت آتی ہے، وہ از قسم عقوبات ہوتی ہے۔ یعنی سزا کے طور پر انہیں بے چین کر دیتی ہے، انہیں تڑپاتی ہے۔ تکلیف تو اپنی جگہ اس پر، ذہنی پریشانی اور قلبی بے اطمینانی اور شور و واویلا، یہ ایک الگ تکلیف بن جاتی ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کو جو مصیبت آتی ہے، اس میں دو پہلو ہوتے ہیں، تلافی مافات، بعض اوقات آدمی پر جتنے اللہ کے احسانات ہوتے ہیں، اتنا وہ شکر نہیں کرتا۔ وہ جو کمی رہ جاتی ہے، اس پر کوئی بیماری یا کوئی تکلیف بھیج کر، اللہ کریم اس کے صلے میں اسے معافی دے کر وہ کمی پوری کر دیتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں تلافی مافات۔ بعض مقاماتِ قرب ایسے ہوتے ہیں کہ جیسے شہادت ہے، تو شہید ہونے کے لئے اللہ کی راہ میں قتل ہونا پڑتا ہے۔ اب یہ کہنا

کہ اس پر قتل کی مصیبت آئی، صحیح نہیں ہے بلکہ اسے تو شہادت کا انعام ملا۔ یعنی بعض انعامات ایسے ہوتے ہیں، قرب کے بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے گزرنے کے لئے ان تکالیف سے گزرنا ضروری ہوتا ہے۔ بظاہر تو وہ تکالیف ہوتی ہیں لیکن حقیقتاً ترقی ءدرجات ہوتی ہیں۔ مومن پر جو مصیبت آتی ہے یا تلافی ءمافات ہوتی ہے یا ترقی ءدرجات ہوتی ہے۔ ہاں اگر اللہ سے دوری ہو تو ہر مصیبت عقوبت یعنی سزا بن جاتی ہے۔

تو فرمایا، اگر ایسی صورت پیش آئے کہ تمہیں دنیا میں کوئی خزاں کا جھونکا ناگوار گزرے، بیماری آجائے، کوئی پریشانی آجائے، کوئی حالات میں تبدیلی آجائے تو **استعینوا بالصبر** اللہ کے کئے پر صابر و شاکر ہو کر اپنے صبر شکر کے درجے سے مدد حاصل کرو، کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے اندر وہ جذبہ ودیعت کر دیا گیا ہے کہ جو ایسی حالت میں تمہارا معاون ہوگا۔ صبر سے مدد حاصل کرو۔ صبر کہاں سے آئے گا؟ صبر پھر اللہ ہی کی یاد سے آئے گا۔ **والصلوٰۃ** اللہ کی عبادت سے، اللہ کی بندگی سے، اس کے در پر سجدے کرنے سے، اس سے دعا مانگنے سے، اس کو یاد کرنے سے، تمہیں صبر آئے گا۔ اور اس تکلیف پر تم جب صبر کرو گے تو اس کا اجر کیا ہوگا، اللہ ذاتی طور پر تمہارے ساتھ ہوگا تم اکیلے نہیں ہوگے۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ اس بات پر یقین کر لو کہ جب بندہ صبر کرتا ہے یعنی خلافِ شریعت امور سے اپنے آپ کو روکتا ہے تو اللہ اس بندے کے ساتھ ہوتا ہے۔ تمہیں اس کا بدلہ یہ ملے گا کہ تمہیں معیتِ باری نصیب ہو جائے گی۔ تو جس بندے کے ساتھ اللہ رب العالمین ہو، اس پر تکلیف کیا رہے گی۔ تو بظاہر نظر آنے والی وہ تکلیفیں بھی اپنے اندر بے شمار راحت کے پہلو رکھتی ہیں۔ ایک تلخ گھونٹ دوائی کا، پورے بدن کی شفا کا سبب بن جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی آنے والا تلخ گھونٹ مصیبت یا پریشانی کا، ساری ناراضگیاں اللہ کریم کی دور کر کے، لغزشوں کی ساری آلائش دور کر کے، بندے کو نکھار جاتا ہے۔ تو اس کے حق میں وہ مصیبت نہیں انعام بن جاتا ہے۔

اب سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ بندے کی جان چلی جائے۔ گھر گیا، دوبارہ بن سکتا ہے، اولاد کی جدائی سہنا پڑی، بہت مشکل ہے، لیکن اللہ قادر ہے پھر اولاد دے سکتا ہے۔ ملک چھوٹ گیا، دوسرے ملک میں چلے گئے، وہاں بھی رہنے کو جگہ مل سکتی ہے۔ واپس ملک میں آنے کے چانس بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ ساری صحت چلی گئی، اللہ چاہے تو صحت واپس بھی آسکتی ہے۔ لیکن جان کا جانا ایک ہی بار ہے۔ یہ قانون ہے فطرت کا کہ جان گئی اور گئی پھر وہ واپس نہیں آئے گی۔ یہ وہ متاع ہے کہ جو صرف ایک بار نصیب ہوتی ہے۔ جب ختم ہو گئی دوبارہ اس کے ملنے کی توقع نہیں ہے۔ اب اگر راہِ خدا میں تم ذکر بھی کرتے ہو، تم اللہ کی عبادت بھی کرتے ہو، تم اس کی اطاعت بھی کرتے ہو، اس کے باوجود تمہیں اس کی راہ میں مرنا پڑ جاتا ہے، تم زندگی ہار جاتے ہو، اللہ کریم فرماتے ہیں، کہ اس پر تم شکر نہیں کرتے، کہ اللہ کی راہ میں زندگی ہارنے والا مرتا نہیں بلکہ موت کو بھی شکست دے جاتا ہے۔ یعنی یہ واحد فلسفہ ہے کہ اس سے موت بھی شکست کھا جاتی ہے اور وہ اس قدر زندہ ہو جاتا ہے کہ

اسے مردہ کہنا شرعاً حرام ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ خبردار! مت اسے مردہ کہو اس کا مردہ کہنا حرام ہے۔ جس کام سے قرآن کی آیت منع کرے، وہ حرام ہوتی ہے، اور جس کام کے کرنے کا حکم قرآن کی آیت دے، وہ واجب اور فرض ہوتا ہے۔ تو مردہ کہنا حرام اور زندہ ماننا واجب اور فرض ہوگیا۔ عجیب بات ہے، یہاں صرف یہ نہیں کہا کہ مردہ نہ کہو، فرمایا **بَلْ اَحْيَاءٌ** وہ زندہ ہیں۔ کیسے زندہ ہیں یا اللہ؟ ان کے وجودوں کے پرخچے اڑ گئے، بدن کٹ گیا، اس کے ٹکڑے ہوگئے، ہم نے اس کا جنازہ پڑھا، اسے قبر میں اتارا، اس پر مٹی ڈال دی، اس کی وراثت تقسیم ہوگئی، اس پر موت کے سارے احکام وارد ہو گئے۔ پھر بھی اللہ کریم فرماتے ہیں کہ اسے مردہ نہ کہو۔ مردہ نہ کہیں تو کیا کہیں۔ فرمایا **بَلْ اَحْيَاءٌ** وہ زندہ ہے، یہ احکام صرف دنیا کے نظام کو قائم رکھنے کے لیے ہیں اس دنیا سے وہ اگلی دنیا میں چلا گیا لیکن وہ مرا نہیں۔

موت کیا ہے؟ زندگی سمجھنے کے لیے پہلے ہمیں موت کو سمجھنا ہوگا۔

موت کو سمجھا ہے غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

موت زندگی کا خاتمہ نہیں ہے۔ موت زندگی کی وہ ابتدا ہے کہ جہاں سے شروع ہو کر زندگی کبھی ختم ہی نہ ہوگی۔ موت سے پہلے زندگی کے جتنے پہلو ہیں، ان کے عرصے محدود ہیں۔ شکمِ مادر میں زمین کے سینے پر محدود عرصہ ہے لیکن دنیا کی زندگی سے گزرنا ایسا ہے جیسے عالمِ امر میں ارواح تھیں، وہاں سے شکمِ مادر میں آئیں، عالمِ امر کی زندگی ختم ہوگئی۔ شکمِ مادر کی زندگی صرف روح کی نہیں روح اور بدن کی مل کر تھی۔ شکمِ مادر سے دنیا میں قدم رکھا تو وہ جگہ خالی ہوگئی اور اس کی وہ زندگی ختم ہو گئی۔ وہ اس کی وہاں موت ہے جو یہاں پیدائش ہے۔ یہاں کی موت برزخ کی ولادت ہے۔ جیسے وہ جگہ خالی ہوئی تھی، ایسے اس سے زمین کی پیٹھ خالی ہوگئی اور یہ برزخ میں وارد ہوگیا۔ موت کیا ہے؟ روح کا وہ تعلق جو بدن کو امورِ دنیا کے کرنے کی توفیق دیتا ہے اس میں حیاتِ دنیوی کا سبب بنتا ہے، وہ تعلق منقطع کر دیا جاتا ہے۔ روح ملنے کے بعد بدن سے بچھڑتی نہیں۔ روح اور بدن کا ملاپ جب ہوتا ہے تو اس کے بعد ان میں جدائی نہیں ہے۔ اور یہ اتنا پکا جوڑ لگتا ہے اور یہ عجیب وغریب جوڑ ہے کہ روح عالمِ امر کی لطیف ترین حقیقت ہے اور بدن مادے کی کثیف ترین حالت ہے۔ کبھی لطیف کا کثیف سے پیوند نہیں لگایا جا سکتا۔ بجلی لوہے سے گزر کر تو جا سکتی ہے اس کا حصہ نہیں بنتی، آپ اسے کبھی پاور سٹیشن سے کاٹیں تو وہ لوہا لوہا رہ جائے گا بجلی اس میں نہیں رہے گی۔ لیکن اللہ نے اس روح کا، اس لطیف شے کا، ایسا پیوند اس مادی وجود سے لگایا ہے کہ یہ مادی وجود بھی دوام حاصل کر گیا۔ روح کے تعلق کی وجہ سے اب یہ کبھی نہیں تباہ ہوگا۔ بندہ مومن ہو یا کافر، کافر کا وجود بھی ابدالآباد رہے گا خواہ وہ جہنم میں جلتا رہے، ختم نہیں ہوگا۔ حیاتِ دوام اسے بھی نصیب ہوگی۔ **خٰلِدِيْنَ فِيْهَا** جہنم میں بھی ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی

وہ جو پیوند لگا ہے روح اور بدن کا وہ ٹوٹے گا نہیں۔ اگر دوزخ کی آگ سے جل کر نہیں ٹوٹتا تو زمین کے بدن کو کھا جانے سے کیسے ٹوٹ جائے گا۔ زمین اتنا تو نہیں کھاتی جتنا دوزخ جلاتا ہے۔

اب زمین کھا کر کیا کرتی ہے؟ بدن مرجانے کے بعد آدمی کا رشتہ روح کا وہ ٹوٹ گیا جو حیات کے لئے ضروری تھا تو بدن تباہ ہونا شروع ہو گیا، گلنا سڑنا شروع ہو گیا، مٹی میں مل گیا، کیا بنے گا اس کا۔ اسے جلا دیں، اسے جانور کو کھلا دیں، وہ جانور جلا دیں، اسے پانی میں ڈال دیں، اسے مچھلیاں کھا جائیں، اسے مٹی کھا جائے، کیا بنے گا آخر؟ ایٹم بنیں گے، اس سے آگے تو مادہ کہیں نہیں جاتا۔ تو پہلے کیا یہ ٹھوس بدن تھا؟ پہلے بھی تو ایک ایک اس کا ایٹم تقدیر باری نے کہاں کہاں سے چنا۔ ایک لقمہ جو ہم کھاتے ہیں اس میں جو دال آٹا چاول نمک گرم مصالحہ، یہ چیزیں کہاں کہاں سے آئیں۔ وہ ایٹم وذرات جو اللہ نے بندے کے وجود کے لیے مقدر کیے تھے، نظامِ باری ایک ایک ذرے کو کہیں پھل، کہیں دودھ، کہیں گھی، کہیں چاول، کہیں آٹے کی شکل میں تبدیل کر کے، اتنا مضبوط طریقے سے چلاتا ہے کہ جس وجود کا وہ ایٹم مقدر ہے، اس وجود تک پہنچتا ہے، دوسرا کوئی نہیں کھا سکتا۔ یعنی جو روح اس نے ماں کے پیٹ میں بھیج دی ہے اس کے بدن کے اجزاء کو طویل عرصے تک پراسس (process) کر کے ماں کی خوراک کی صورت میں اس تک پہنچاتا ہے، کوئی دوسرا نہیں کھا سکتا۔ اگر لوگ ایک دوسرے کا کھاتے تو پہلے والے سارا کھا کر مر گئے ہوتے۔ انسانی مزاج ایسا ہے کوئی باقی چھوڑ کر نہ جاتا کہ پچھلے کھائیں گے۔ ہر بندہ وہی ذرات کھا سکتا ہے جو اس کا اپنا حصہ ہے۔ یہ ایسا مربوط نظام ہے۔

اصل حق یہ ہے کہ ہم وسائل ضائع کرتے ہیں۔ جس کا گھر سیلاب میں بہہ گیا، اسے پانچ ہزار ملے اور ان گھروں کو دیکھنے کے لیے وزیراعظم کے لیے ایک ارب کا ہوائی جہاز آیا۔ جہازوں کا بیڑا ملک کے پاس موجود ہے پی۔ آئی۔ اے کا اور بے شمار فوجی جہاز بھی، ان میں سے کسی پر بھی بیٹھ کر وہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ ایک بندے کے لئے سو کروڑ کا ایک جہاز آیا اور ایک خاندان کا گھر بہہ گیا اسے پانچ ہزار دیے گئے۔ منصوبہ بندی کی ضرورت یہاں ہے یا پیدائش پر ہے؟ یعنی منصوبہ بندی تو وسائل کی ہونی چاہیے کہ اللہ نے جتنے بندے پیدا کیے ہیں، اتنے وسائل بھی اس مٹی کو دیتا ہے۔ چند ظالم اس پر غاصبانہ قبضہ جما کر وسائل خود ضائع کر دیتے ہیں دوسروں کو کہتے ہیں تم اولاد پیدا کرنا بند کر دو۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ ان وسائل کی تقسیم منصفانہ ہو۔

سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہمیشہ جو کی روٹی کھانے سے بیمار ہو جاتے تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ کا معدہ خراب ہو جاتا تھا، بخار شروع ہو جاتا تھا۔ کسی نے عرض کیا امیر المومنین اب اسلامی ریاست میں ایک بندے کے لئے غلہ نہ ملے، یہ تو ممکن نہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ کی صحت کا مسئلہ ہے، آپ رضی اللہ عنہ گندم کی روٹی کھائیں۔ فرمایا مدینہ کے شہری جو کو ترسیں اور عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) گندم کی روٹی کھائے۔ صحت رہے یا نہ رہے، مجھے ان کے ساتھ کھڑا ہو کر اللہ کے روبرو حساب دینا ہے۔ جو چیز عام شہری کو ملتی ہے، وہی عمر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) بھی کھائے گا، زندہ رہے یا نہ رہے۔

تو وسائل کی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ جسے پیدا ہونا ہے، جو رزق اس کے وجود کا حصہ بنتا ہے، وہ رب کریم کا نظام اس تک پہنچا دیتا ہے۔ مرنے کے بعد اجزاء اتنے منتشر ہو ہی نہیں سکتے کہ یہ سوچا جائے کہ روح کا تعلق کیسے ہوگا۔ روح تو عالم امر میں ہے۔ بدن کے اجزاء شکم مادر میں جمع ہو رہے ہیں جس میں روح نے آ کر مقیم ہونا ہے۔ یہ تو اتنا بڑا قدرت کا نظام ہے۔ مرنے کے بعد آپ کے ہر ذرے کیساتھ اس کی روح کا تعلق رہتا ہے۔ تبدیلی صرف یہ ہوتی ہے کہ اس دنیا سے جانے کے بعد برزخ کی گرمی سردی کو وہاں کے آرام اور تکلیف کو براہ راست روح محسوس کرتا ہے جیسے یہاں براہ راست بدن محسوس کرتا ہے، روح خواہ وہ دنیا میں کہیں ہو۔ یہ حال ہر انسان کا ہے خواہ وہ کتنا ہی ظالم و بدکار ہے۔ لیکن ہر بندے کی موت ایک جیسی تو نہیں ہوتی۔ کافر اور مومن کی موت میں بہت بڑا فاصلہ ہے۔ قرآن حکیم میں موجود ہے کہ جب کافر کی موت آتی ہے تو فرشتے۔ **یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ** (محمد:27) ان کے مونہوں پر، ان کی پیٹھوں پر انہیں مارتے ہیں۔ سزا دیتے ہیں۔ تکلیف دیتے ہیں اور اس طرح ان کی جان قبض کرتے ہیں۔ اس کے برعکس اللہ کی رحمت کے فرشتے جب مومن کی روح قبض کرنے آتے ہیں تو مومن کو مبارک دیتے ہیں کہ تو زندگی کے امتحان سے کامیاب نکلا۔ اسے کہتے ہیں تو خوشیاں منا، مبارک دن ہے۔ تیرا بڑا مشکل امتحان تھا دنیا پر، اس میں سے سرخرو نکلا جا رہا ہے۔ ہم نے زندگی بھر تیرا ساتھ دیا ہر نیکی میں اللہ کے فرشتے بھی تیرے لیے دعا کرتے تھے، ہم بھی تیرے معاون رہے۔ اللہ کی مدد تجھے حاصل ہوتی رہی اور تجھے کس بات کا غم۔

حدیث شریف میں موجود ہے کہ کافر کے لیے جہنم کے وہ طوق لاتے ہیں جو جہنم کی آگ سے بھڑک رہے ہوتے ہیں۔ سخت بدبودار ہوتے ہیں۔ مومن کے لئے جنت کا لباس اور جنت کی خوشبوئیں لے کر آتے ہیں۔ تو مومن اور کافر کی موت میں فرق ہو گیا۔ اب کافر جسے عذاب ہو رہا ہے، اس کے ہر ذرہ بدن کے ساتھ روح کا تعلق تو ہے۔ لیکن مومن کی موت کے مختلف مدارج ہیں۔ ایک درجہ مومن کا یہ بھی ہے کہ اس کی موت سے روح کا وہ تعلق بھی بدستور قائم رہتا ہے جو بدن کی حیات کے لئے ضروری ہے، صرف احکام بدلتے ہیں۔ اس دنیا سے جب یہ برزخ میں چلا گیا عالم بدل گیا احکام بدل گئے۔ اب اس کی غذا اس کی گرمی سردی برزخ کی ہوگی۔ آپ اسے دفن کریں یا نہ کریں۔ چونکہ عالم بدل گیا، برزخ میں چلا گیا۔ یہ تبدیلی ہوگی، حیات میں تبدیلی نہیں ہوگی۔ اس کا بدن ویسے ہی تر و تازہ اور زندہ رہے گا جیسا روح اس میں موجود تھی تو زندہ تھا۔ اور یہ تاریخی اعتبار سے ثابت ہے۔ قرآن سے تو ثابت ہے ہی، دنیا کی تاریخ میں بھی ثابت ہے۔ کہ شہدائے احد کی قبور کھولی گئیں، نہر کا راستہ بنایا گیا، اڑتالیس برس گزر چکے تھے۔ حضرت امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاؤں پر مٹی ہٹانے والے کی کدال سے خراش آ گئی خون جاری ہو گیا۔ یہ ایک نہیں، اس طرح کے اتنے واقعات ہیں کہ وہ شمار میں نہیں آ سکتے۔

1978ء میں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودہ توسیع شروع ہوئی۔ ایک حصہ جنت البقیع کے سامنے کی طرف ہے۔ یہ محلہ چار پانچ فٹ صحن مسجد سے اونچا تھا۔ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کا مزار سب سے زیادہ واضح اور

ترکوں کے بنے ہوئے بہت سے مکانات اور تعمیرات تھیں۔اس کے علاوہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بھی مقابر تھیں۔
حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ مشہور صحابیؓ ہیں، ان کی قبر تھی۔ یہ وہ صحابیؓ ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت بہت زیادہ ناساز تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تشریف لائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم خدام کے سہارے پاؤں گھسیٹ کر چل رہے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر بیٹھ کر خطاب فرمایا۔باقی ارشادات کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ کسی کا میرے ساتھ کوئی لینا دینا ہو تو وہ اپنا حساب برابر کر لے۔حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور انہوں نے عرض کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یوم بدر ایک چھڑی ماری تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ میرا ادھار ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا چھڑی منگواؤ اور عکاشہ رضی اللہ عنہ کو دو۔وہ مجھے مار لے تو سارا مجمع تڑپ اٹھا کہ یہ کیا غضب کرتے ہو! صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے آپ کو پیش کیا کہ ہمیں دس دس چھڑیاں مار لو۔اس نے کہا، میرا لینا دینا اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، آپ سے میرا کیا کام۔چھڑی لائی گئی۔حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم میری پیٹھ اس وقت برہنہ تھی۔میرے پاس تو ایک ہی چادر تھی جو میں نے کمر سے باندھ رکھی تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت مبارک پر تو قمیص ہے، مجھے ننگے بدن لگی تھی۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قمیص مبارک ہٹادی تو انہوں نے بڑھ کر مہر نبوت کو چوم لیا جو دو شانوں کے درمیان تھی اور کہا کہ میرا مشن پورا ہو گیا۔

وہاں ایک اور صحابیؓ کی قبر بھی تھی۔ یہ تین وجود براہ راست لوگوں کے سامنے نکالے گئے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد کا، حضرت عکاشہ رضی اللہ عنہ کا اور ایک صحابیؓ کا، (مجھے نام یاد نہیں) حکومت نے نکال کر انہیں جنت البقیع میں منتقل کیا۔ڈیڑھ ہزار سال بعد ویسے ہی تر تازہ تھے جیسے کوئی سو رہا ہو۔کہ شہید جو ہوتا ہے اسے مردہ نہ کہو وہ زندہ ہے۔اس کی روح کا بدن سے وہ رشتہ جو دنیا کی زندگی کے لئے ضروری ہے، بدن کو گرم رکھتا ہے، تر و تازہ رکھتا ہے۔وہ نہیں توڑا جاتا، اس نے موت کو شکست دے دی، وہ مرا ہی نہیں۔یہ اور بات ہے کہ اس عالم سے عالم برزخ میں منتقل ہو گیا۔یہاں کے اوقات یہاں کے معمولات سے اس کا رشتہ نہ رہا۔احکام برزخ کے وارد ہوں گے۔کھانا پینا وہاں کا ہو گا، سونا جاگنا وہاں کا ہو گا لیکن حیات وہی بدستور رہے گی جو دنیا میں تھی۔اگر یہ نہ مانا جائے تو اس آیت کا منشاء پورا نہیں ہوتا۔اور اگر یہ حال شہید کا ہے جسے ایمان، اسلام، اللہ کا تعلق، نبی علیہ السلام کی غلامی سے ملتا ہے، تو انبیاء علیہم السلام کی موت کیا ہو گی۔انبیاء علیہم السلام کی تو موت بھی حیات تقسیم کرنے والی ہوتی ہے۔ارے کتنا جہاں زندہ ہے گنبد خضراء کی وجہ سے۔

زندگی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عنایت ہے
ورنہ ہم لوگ مر گئے ہوتے

انسان سے ایمان گیا تو سمجھو اس سے انسانیت گئی، اس سے حیات گئی، وہ مر گیا، وہ بوجھ ہے زمین کے سینے پر۔ایک عرب

شاعر کا قول ہے۔ **واجسامھم قبل القبور قبورھم** ان کے وجود روحوں کی چلتی پھرتی قبریں ہیں جو ایمان سے خالی ہیں۔ یہ انسان نہیں ہیں۔ انسانیت اور انسانیت کی حیات نورِ ایمان ہے اور آج بھی ایمان کہاں سے مل رہا ہے **لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ** آج بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، تھے نہیں۔ **کان محمد عبدہ و رسولہ** نہیں ہے **کان محمد رسول اللّٰہ** نہیں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آج بھی رسول ہیں اور رسول کیا صرف روحِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھی یا جسدِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ رسول نام تھا، روح مع الجسد محمد ابن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ تو اگر موت نے روح اور جسم کو الگ الگ کر دیا اور جسدِ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم الگ ہے، روحِ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم الگ ہے تو رسول کہاں رہے۔ رسول کا تصور کہاں رہا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی معاذ اللہ نہ رہے تو روح کہاں رہی۔ روحِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی حیثیت اپنی جگہ ہے، بدنِ اطہر کی ساری فضیلتیں اپنی جگہ، لیکن اگر الگ الگ ہو گئے۔ تو وہ کیا کہلائیں گے؟ روح کیا کہلائے گی؟ اور بدن کیا کہلائے گا؟ جسدِ اطہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو۔ دونوں میں کوئی نہیں۔ ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن ہے دوسرا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا روح ہے۔ آپ کس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں؟ آپ کیسے کلمہ پڑھتے ہیں۔ لہٰذا یہ تفریق محال ہے بلکہ ممکن ہی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدام کی ارواح بدن کی حیات کو قائم رکھتی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں جو مرتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاکِ پا پر جو جان دیتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر جو ہزاروں سال بعد مرتا ہے، اس کے روح و بدن کا رشتہ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ بدن بھی ہمیشہ سلامت رہتا ہے۔

کابل میں مرنے والے پٹھان کو۔ (طالب علم تھا) والد نے منع کیا، نہ باز آیا۔ جہاد میں حصہ لیا اور شہید ہو گیا (جہا افغانستان کے بے شمار واقعات ہیں لیکن میں ایک سناتا چلوں)۔ تو جوان بیٹے کی میت جب مجاہدین اٹھا کر اس کے گھر واپس لائے تو اس کے والد نے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا۔ دیکھو اللہ کہتا ہے شہید زندہ ہوتا ہے میں تمہیں کہتا تھا یہ اقتدار کی لڑائی ہے اور تم مفت میں مارے جاؤ گے، یہ جہاد نہیں ہے۔ تم اپنی دینی تعلیم پوری کرو مگر تم مدرسہ چھوڑ کر بھاگ گئے کہ یہ جہاد ہے، تعلیم سے زیادہ ضروری فرض ہے۔ اگر تم سچے ہو اور یہ جہاد تھا اور تم شہید ہو تو پھر ہاتھ اٹھا کر میرے ساتھ مصافحہ کر و تا کہ مجھے یقین ہو جائے کہ تم زندہ ہو۔ تو کئی روز بعد گھر پہنچنے والے بظاہر میت نے اپنا ہاتھ اٹھا دیا۔ اسے کس نے کہا تھا یہ شہادت ہے، اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا؟ اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تھا؟ اسے تو ڈیڑھ ہزار سال بعد چلتی چلتی پہنچی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کہ یوں مرنا شہادت ہے۔ اس نے جان دے دی اور موت کو شکست دے دی۔

تو خود ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے یہ سوچا جائے کہ موت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کو ختم کر دیا۔ یہ تو محرومی والی بلکہ سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔ مسلمان کیسے سوچ سکتا ہے۔ اور یہ سارے دین کا سٹرکچر کس بنیاد پر کھڑا رہ سکتا ہے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول

ہوتا ہی نہیں ملتا۔

اس بات کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ میرے خیال میں مسلمانوں کے ہر مکتبِ فکر کا یقین ہے کہ مرنے کے بعد نیک مومنین کی ارواح کو دنیا کی نسبت آخرت میں بہتر جگہ رکھا جاتا ہے۔ اس میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ جو اللہ کے بندے ہیں مرنے کے بعد وہ ان کی ارواح پہلے سے بہتر مقام پر پہنچ گئیں۔ اب اللہ نے جو وجود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تخلیق فرمایا ہے، ویسی شان نہ اس نے اپنے عرش کو دی ہے نہ جنت کو، نہ کسی دوسرے وجود کو دی ہے۔ اگر روحِ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ جسدِ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا مانتے ہیں تو جہاں بھی روحِ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام ہوگا، وہ مقام جسد اطہر سے کم تر درجے کا ہوگا خواہ اسے آپ عرش پر بٹھادیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ سارے نیک لوگوں کی ارواح پہلے سے اعلیٰ مقام پر جائیں اور جن صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل وہ درجے پائیں، ان کی روحِ اطہر پہلے سے کم تر مقام پر جائے گی؟ یا جسدِ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم جیسا کوئی دوسرا مقام ثابت کرو کہ وہاں روحِ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام ہو۔ ارے یہ تو باتیں تب بنتی ہیں جب بندہ اللہ کو بھی اپنے اوپر قیاس کرلے اور سمجھے کہ جو مجھ سے نہیں ہوسکتا وہ اللہ سے بھی نہیں ہوسکتا۔ اللہ، اللہ ہے، خالق، خالق ہے۔ روح اور بدن کا تعلق بنتا ہے تو ٹوٹتا نہیں مومن ہو یا کافر۔ کافر کا وہ تعلق بدن کے لیے ایذا کا سبب بنتا ہے اور مومن کا تعلق راحت کے لیے۔ اور اگر مومن راہِ اللہ میں اللہ کا ذکر کرتے ہوئے۔ جہاد کرتے ہوئے موت کو پا جائے تو پھر اس کا کیا کہنا۔

جہاد بھی دو طرح سے ہے۔ عالمِ اسلام پر افتاد پیش آئے، مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے جیسے آج ہے اور ہم اس فرض سے کوتاہی کر رہے ہیں۔ اگر میدانِ کارزار میں جہاد کی ضرورت نہ بھی ہو تو نفس کے ساتھ جہاد ہر لمحے ہے اور اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہادِ اکبر کہا ہے۔ گناہ اور برائی کے خلاف جہاد کرنا، اللہ کی اطاعت پر جم کر رہنے کے لئے مجاہدہ کرنا، یہ سب جہاد ہے۔ اس جہاد میں قتل ہونے والے بھی شہید ہی ہوتے ہیں شرط صرف یہ ہے کہ اللہ کے نام پر موت آئے۔ شہادت شہادت کا بھی فرق ہے۔ اس کے مختلف مدارج ضرور ہیں لیکن ہر وہ بندہ جو جان اللہ کی راہ میں مجاہدہ کرتے ہوئے دیتا ہے، اسے اللہ شہادت سے سرفراز فرما دیتے ہیں۔ مومن تو ہوتا ہی شہید ہے۔ مومن کا تو شہادت کے علاوہ کوئی تصور ہی نہیں۔ اس کا تو جینا مرنا اللہ کے لیے ہوتا ہے۔ وہ تو مرتے ہوئے بھی گواہی دیتے ہوئے مرتا ہے **لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)** ۔ اس گواہی پر جان دے دینا بھی تو شہادت ہے کہ کفر کے خلاف ایک شہادت دیتا ہوا گزر گیا۔ شہید موت کو شکست دے دیتا ہے اور فرق یہ ہوتا ہے کہ لوگ خلط ملط کر کے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اگر وہ زندہ ہے تو پھر وہ کھانا کیوں نہیں کھاتا اور پانی کیوں نہیں پیتا۔

اب ایک بندہ یہاں سے امریکہ چلا گیا تو یہاں کا موسم کیا اسے امریکہ میں ستائے گا۔ یہاں کی گرمی اسے وہاں متاثر کرے گی۔ اسی طرح ایک بندہ اس عالم سے عالم برزخ میں چلا گیا تو یہاں کی بھوک پیاس تو وہاں نہیں جائے گی۔ وہاں

کا کھانا پینا مختلف ہوگا۔ عالم تبدیل ہوگیا، احکام بدل گئے لیکن شہید کی زندگی تبدیل نہیں ہوتی۔ ویسے ہی زندہ ہے جیسے یہاں تھا۔ اس کا ثبوت یہ بھی ہے ان کے وجود اگر قبروں سے نکلے تو بھی تروتازہ تھے، زمین پر پڑے رہے تو بھی تروتازہ تھے۔ نہ انہیں کیڑے پتنگے نے کھایا نہ انہیں موسموں نے خراب کیا نہ انہیں گرمی سردی نے خراب کیا اسی لیے کہ ان میں حیات باقی تھی۔

اور انبیاء علیہم السلام کی حیات تو شہید سے کروڑوں گنا مضبوط ہوتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو مصدرِ حیات ہیں۔

آپ ایک لمحے کے لیے سوچیں! میں نے ایک شعر کہا تھا، اب وہ مجھے یاد نہیں آرہا۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ دنیا کی حیات کی تار رگ وابستہ ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے ساتھ۔ اس کے دوسرے مصرعے میں اس کا ثبوت یہ تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے ایک لحہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قدمِ اطہر دارِ دنیا سے عالمِ بالا کو چلا گیا تو نظامِ کائنات وہیں رک گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی میں محققین کے مطابق اتنا وقت لگا کہ تیئس برس کا عرصہ جتنا دنیا میں گزرتا ہے لیکن جیسے نظامِ عالم میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ جلوہ افروز ہوئے وہیں سے نظام چل پڑا۔ یعنی جیسے کسی جسم سے آپ روح الگ کرلیں وہیں وہ ساکت ہوجائے گا، جیسے آپ گھڑی سے سیل نکال لیتے ہیں تو ایک لحظہ بھی نہیں گزرا وہ رک گئی۔ آپ نے سیل رکھ دیا وہیں سے چل پڑی۔ اسے اس سے غرض نہیں کیا وقت ہوا۔ تو جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قدمِ مبارک دارِ دنیا کی فضا سے باہر گیا تو نظامِ کائنات رک گیا۔ اب جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے، گو برسوں بیت گئے، نظام وہیں کھڑا تھا۔ لحاف گرم تھا، دروازے کی کنڈی جہاں تھی اس کی حرکت وہاں رک گئی، اوپر تھی تو نیچے نہیں آئی نیچے تھی تو آگے نہیں ہلی۔ جیسے قدمِ اطہر واپس آیا، ہر شے میں حیات آگئی، وہ حرکت بھی کرنے لگ گئی حتیٰ کہ وضو جو فرمایا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا پانی جو بہہ رہا تھا، جیسے فضا سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکلے وہیں رک گیا، جیسے فضا میں واپس داخل ہوئے وہاں سے چل پڑا۔ پانی جاری تھا، لحاف گرم تھا، اور کنڈی ہل نہیں رہی تھی، ہلنا شروع ہوگئی اور پانی چلنا شروع ہوگیا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات کو رب العالمین نے کائنات کی حیات بنایا ہے۔ یہی مسلمانوں کا حیات النبی علیہ السلام کا عقیدہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر موت وارد ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم روضہ اطہر میں آرام فرما ہیں، لیکن موت اس طرح نہیں کہ روح الگ بدن الگ۔ دنیوی حیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکلف تھے وہ ختم ہوگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تبلیغ کا حق ادا کردیا۔ دنیا کے موسم، دنیا کی بھوک، دنیا کی نیند، یہ احکام دنیا میں رہ گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم برزخ میں تشریف لے گئے۔ اب وہاں کے احکام ہیں، حیات میں کوئی تبدیلی نہیں، جس طرح وجودِ اطہر صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں رہتے ہوئے زندہ تھا، ویسے ہی ہے۔ نبی علیہ السلام کی حیات تو اتنی مضبوط ہے کہ ان پر مردے کے احکام وارد نہیں ہوتے۔ نبی علیہ السلام کی بیویوں سے نکاح نہیں کیا جاسکتا، ان کی

میراث تقسیم نہیں ہوتی۔یعنی وہ احکام اپنی جگہ رہتے ہیں۔چلو ازواج مطہرات تو امہات المومنین ہو کر حرام ہو گئیں لیکن میراث تقسیم کرنے کا بھی حکم نہیں ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نیزے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈھالیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دراقدس پر جو تھوڑا بہت تھا، وہ تبرکاً بعض قریبیوں کو دے دیا گیا، ورثا میں نہیں بانٹا گیا اس لئے کہ وراثت تقسیم نہیں ہوتی۔ موت کے احکام وارد نہیں ہوتے۔

اس کا حاصل یہ ہے، اللہ کریم فرماتے ہیں کہ تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔یاد کے مختلف مدارج ہیں۔عملاً بھی ذکر ہے، زبانی بھی ذکر ہے اور منشاء ذکر پورا ہوتا ہے قلبی ذکر سے۔بندہ کی یاد اللہ کے سامنے اپنا فقر اپنی احتیاج بیان کرنا ہے اور اللہ کی یاد عطا و کرم سے نوازنا ہے۔پھر عبادات اور ان پر قائم رہنے کے لئے صبر کی ضرورت ہے۔نظامِ کائنات بندے کی آرزوؤں سے نہیں بدلتا بلکہ بندے کو تسلیم و رضا کا درجہ نصیب ہو جاتا ہے اور اس پراسس (Process) سے گزرنا آسان ہو جاتا ہے۔تکلیف بھی آئے تو ترقی درجات کا سبب بن جاتی ہے۔حتیٰ کہ موت بھی آجائے تو شکست کھا جاتی ہے اور اس کا مرنا بھی زندگی کا ایک روپ بن جاتا ہے۔اس لیے اللہ کریم نے منع فرمادیا کہ جو میری راہ میں جان دیتے ہیں یا قتل کیے جاتے ہیں، انہیں مردہ نہ کہو وہ کٹے ہوئے حصے جو ہیں ان کے ساتھ روح کا وہی رشتہ موجود ہے جو اس جڑے ہوئے مجسمہ بدن کے ساتھ تھا۔احکام بدل گئے، اس دنیا سے عالم برزخ میں تشریف لے گئے لیکن ان پر موت وارد نہیں ہوئی، وہ زندہ ہیں۔تم بھی انہیں زندہ ہی کہو۔عقلاً یہ سوچنا کہ وہاں بارش کیسے ہوتی ہوگی، انہیں رفع حاجت کی ضرورت آتی ہے یا نہیں، وہ کیا کرتے ہوں گے؟ فرمایا انسانی عقل میں اتنی وسعت ہے ہی نہیں کہ اس عالم کی حاجات و حالات کو سمجھ سکیں۔جب وہاں جاؤ گے، تم بھی سمجھ لوگے۔فی الحال اتنا تسلیم کرلو کہ وہ زندہ ہیں اور اس کے عقلی اور نقلی دلائل موجود ہیں۔

مزید مطالعہ کے لیے سورت البقرہ:152 تا154 تفسیر اسرار التنزیل اور تفسیر اکرم التفاسیر سے ملاحظہ فرمائیں۔

☆ ☆ ☆

سبق نمبر۹: سورۃ النحل

آیت نمبر ۹۷

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ

جو شخص نیک کام کرے وہ خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ

مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ

صاحب ایمان ہو تو ہم ضرور اس کو (دنیا میں) پاک (اور آرام کی) زندگی عطا فرمائیں گے

اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

اور (آخرت میں) ان کے اعمال کا بہت اچھا صلہ عطا فرمائیں گے۔

اسلام نے جہاں اللہ پر ایمان، دائمی زندگی کی خبر، آخرت کے آرام وسکون اور میدان حشر کی عزت وآبرو اور وہاں کی سربلندی کی بات کی ہے، وہاں دنیا ودنیوی ضروریات، انسان وانسانی مزاج اور اس کی حاجات کو فراموش نہیں کر دیا۔ یہ جو اس دور میں ایک روش اپنائی گئی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ اسلام دور حاضرہ کی انسانی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا اسلام پر عمل اس دور میں ممکن نہیں ہے اور اسلامی قانون یا نظام عدل آج کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا یا اسلام کی سزائیں سخت ہیں۔ یہ ساری باتیں بنیادی طور پر یہودی لابی کے اس حصے کی ایجاد ہیں جس کا کام ہی ان ذرائع کی تلاش ہے کہ اسلام کو کس طرح نقصان پہنچایا جا سکتا ہے۔ جب ملک میں نفاذ اسلام کی کوشش کی گئی۔ تو ایک بہت بڑی رکاوٹ یہ بنی کہ ہمارے دانشور طبقے نے، جسے عرفاً دانشور کہا جاتا ہے، یہ شوشہ چھوڑا تھا کہ ماحول اسلام کے لئے سازگار نہیں ہے، فضا اسلام کے لئے درست نہیں۔ پہلے فضا بنائی جائے، لوگوں کی اصلاح کی جائے، پہلے ماحول درست کیا جائے تو اس کے بعد نفاذ اسلام کا کام ہو سکے گا۔ میں نے عرض کیا تھا اور اس سطح پر بھی کہا تھا کہ فضا کا درست نہ ہونا، یہ بیماری ہے، یہ معاشرے کا مرض ہے۔ اسلام، اسلامی نظام عدل، اسلامی تہذیب، اسلامی طرزِ معاشرت، یہ اس بیماری کی دوا اور اس کا علاج ہیں اور یہ کہاں کی منطق ہے کہ جب بیمار تندرست ہو جائے گا تو اسے دوا کھلائی جائے گی۔ اگر ماحول صحیح نہیں ہے تو زیادہ ضروری ہے کہ اسلام فوراً نافذ کیا جائے۔ لیکن اس نقار خانے میں ہماری تو کسی نے بھی نہ سنی۔ جو طاقتیں خلاف اسلام کام کرتی ہیں وہ کچھ جملے یا اصطلاحات ایجاد کرتی ہیں تاکہ خوشنما الفاظ کے ذریعے عوام الناس کو گمراہ کیا جائے۔ ان کی ایک اور ایجاد ایک چھوٹا سا لفظ وہابی ہے۔ اب

جو کسی بھی عقیدے سے وابستہ ہے، ویسا کہلوانے میں نہیں شرماتا سکھ کو سکھ کہلوانے پر فخر ہے، ہندو کو ہندو کہلانے پر فخر ہے، اگر کوئی مرزائی ہے وہ مرزائی کہلوانا چاہتا ہے، اگر کوئی شیعہ ہے تو وہ اپنے گھر پر جھنڈا لگاتا ہے کہ میں شیعہ ہوں۔ تو اگر وہابی ہے تو وہابی کہلواتا کیوں نہیں؟ کبھی آپ نے غور فرمایا کہ کوئی بھی اس بات پر راضی نہیں کہ اسے وہابی کہا جائے، اس لیے کہ وہابی سرے سے مسلمانوں میں کوئی فرقہ ہی نہیں تھا۔ انگریز کو جب ضرورت پڑی اور اس پر علماء کا دباؤ پڑا اور معاشرے میں علماء جہاد کی بات کرتے تھے تو اس کا جواب دینے کے لیے یہودی لابی کے جو دانشور تھے انہوں نے بڑی تحقیق کی۔ پھر انہیں ایک نام ملا محمد بن عبدالوہاب جس کے رویے پر علماء بڑے سخت برہم تھے جو اس نے حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اور حرمین کے ساتھ سلوک کرنے کے بارے میں اپنایا تھا۔ میرے خیال میں عرب کا معاشرہ بھی بدعات میں بہت کھو گیا تھا اور ابن عبدالوہاب کا عمل اس کا ایک ردعمل تھا جو ان بدعات کی نسبت شدید تھا۔ ہر عمل کا ایک Re-action ہوتا ہے جو عموماً زیادہ شدید ہو جاتا ہے۔ بہر حال چونکہ علماء میں اور عامۃ المومنین میں اس نام پر خفگی پائی جاتی تھی تو انگریز اور یہودی لابی نے مل کر لفظ وہابی ایجاد کیا۔ لائبریری آف لندن میں ایک کتاب ملتی ہے (OUR INDIAN MUSLIMS) جس میں انہوں نے پورے ہندوستانی مسلمانوں پر بحث کی ہے کہ ہم نے انہیں کس طرح کنٹرول کیا۔ لکھتے ہیں کہ بڑی محنت سے ہم نے یہ لفظ ایجاد کیا، علماء میں سے جو بھی ہم سمجھتے ہمارے لیے مضر ہے، اس کے خلاف ہم پراپیگنڈہ کرا دیتے کہ یہ وہابی ہے۔ آج تک وہابی پر پراپیگنڈہ بدستور چلا آ رہا ہے لیکن وہابی ہونے کا مدعی کوئی بھی نہیں اس لیے کہ شروع سے یہ فرقہ تھا ہی نہیں۔ برا فرقہ بھی ہوتا تو برے سے برے فرقے کے لوگ اپنے آپ کو کہتے ہیں میں فلاں ہوں۔ تو کوئی تو یہ بھی کہتا کہ میں وہابی ہوں آج بھی آپ دیکھ لیں کہ کسی کو آپ دلائل حقہ دیں اور اس کے پاس جواب نہ ہو تو وہ آپ کو وہابی کہہ دے گا۔ چوری کر لیں وہابی کوئی نہیں کہے گا، قتل کر دیں کوئی وہابی نہیں کہے گا لیکن آپ کہیں اسلامی عقائد و نظریات صاف ستھرے کر کے پیش کریں تو اسلام کے نام پر چندے لے کر کھانے والی قوتیں آپ کو وہابی کہیں گی۔

اسی طرح سے جدید ترین مغرب سے ایک اصطلاح آئی ہے قدامت پرستی FUNDAMENTALIST قدامت پرست۔ اب اسے بڑے برے معنوں میں لیا گیا ہے کہ پرانی ایک بات پر اڑ جانا اور مر جانا یا مار دینا کوئی سمجھوتہ نہ کرنا۔ یہ عموماً تشدد کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ کوئی بندہ یہ کہہ دے کہ میری یہ بات مانو اور پھر اس پر اڑ جائے، مر جائے یا گلے کو مار دے، اس میں کوئی لوچ کوئی نرمی نہ ہو۔ تو اس کا اطلاق مذہبی حقائق پر کرنا سرے سے نا روا بات ہے کہ مذہبی حقائق بندے کی بات ہی نہیں ہے۔ بندہ اس میں تبدیلی کر نہیں سکتا لیکن یہود و نصاریٰ نے اپنے مذہب میں تبدیلیاں کیں۔ ماحول کے ساتھ سمجھوتہ کیا اور وہ باتیں جو تورات و انجیل میں حرام تھیں، آج انہوں نے یا تو حلال کر لیں، یا رفتہ رفتہ سمجھوتے کرتے گئے۔ وہ عقائد جو تورات اور انجیل میں شرک اور کفر تھے، وہ انہوں نے اپنا لیے اور کہا کہ ہمارے مذہب میں سمجھوتے کی گنجائش

ہے۔اور اسلام بڑا تشدد پرست ہے۔ یہ بڑا اذیت پسند مذہب ہے مرجاتا ہے یا مار دیتا ہے لیکن چودہ سو سال پہلے کی بات کرتا ہے۔اور یہ اچھی بات نہیں ہے۔انہوں نے اس کے لیے بھی لفظ ایجاد کیا کہ یہ FUNDAMENTALIST ہیں۔اسے اتنا بدنام کیا کہ اسلامی ریاست کے وزیراعظم سے میں نے خود اس کی ٹی۔وی تقریر میں سنا I AM NOT A FUNDAMENTALIST یعنی جو قدیم بات ہے جو پرانی بات ہے میں اسے نہیں مانتا۔حالانکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ وہ اسلامی عقائد جو قرآن میں یا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائے تھے، میں ان پر قائم نہیں ہوں۔ جب کہ ہمارے چیف جسٹس صاحب نے کہا ہے کہ جی میں تو بنیاد پرست ہوں۔مسلمان تو ہوتا ہی بنیاد پرست ہے۔میرے خیال میں اس خرابی کے بعد کسی اللہ کے بندے نے اول الذکر کو سمجھایا ہوگا کہ آپ نے کیا کہہ دیا۔تو یہ اس طرح کی ایجادات جو مغرب سے آتی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ اسلام معاشرے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔آپ نے دیکھا، یہاں دو بچوں کا نکاح ہوا ہے۔ کیا وقت ہوئی، کیا تکلیف پیش آئی، کس کو کیا دکھ پہنچا، ان پر کیا غیر ضروری بوجھ پڑا، کیا انہیں ادھار مانگنے کی ضرورت پیش آئی؟۔ کچھ انہیں نذرانہ پادری کو دینا پڑا، گرجے میں جانے کے کوئی قواعد اپنانے پڑے۔ وہ اپنی نماز کے لیے آئے، انہوں نے جمعتہ الوداع پڑھا، گواہ ساتھ لائے، ایجاب وقبول نکاح ہوگیا، اب مل کر سب دعا کریں گے۔اس میں آرام ہے یا تکلیف؟ دونوں خاندانوں کو اسلام پر عمل کرنے سے سکون ملا یا دکھ؟ اور اگر اسی کے لیے باجے گاجے ہوتے، بہت سا شور شرابا ہوتا، اسی کے لیے شامیانے لگے ہوتے، بہت سے لوگوں کی ضروریات کا، ان کے کھانے پینے کا بندوبست ہوتا اور بہت سی دھوم دھام ہوتی اور گھر بیچ کر اور زمینیں رہن رکھ کر پیسہ لے کر خرچ کیا جاتا تو وہ بہتر تھا یا یہ بہتر ہے؟ تہذیب جدید بہتر ہے یا یہ قدامت پسندی؟

اس سبق میں اللہ کریم یہ بات ارشاد فرماتے ہیں کہ جو لوگ اس طرح کہیں گے، ان کی بات پر توجہ نہ دو اس لیے کہ اسلام صرف آخرت نہیں بناتا آخرت کی بنیاد حیاتِ دنیا پر رکھتا ہے۔اسلام ایسا مذہب نہیں جو فسانوں میں اور قصوں میں الجھا ہوا ہو، اور جو محض یہ کہے کہ ثواب ہو رہا ہے اور اس کا عملی اظہار نہ ہو بلکہ ارشاد باری ہے **مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى**۔اگر سارا معاشرہ بگڑ جائے، سارا معاشرہ غلط رویہ اپنا لے اور ایک بندہ اس غلطی میں اُن کا شریک نہ ہو تو آپ کسی قانون کسی معاشرے میں جائیں تو اس معاشرے کے خلاف جو ایک چلنا چاہتا ہے اس پر تکالیف آئیں گی۔اسلام کے قوانین اتنے خوبصورت ہیں کہ پورے معاشرے میں ایک مرد یا ایک خاتون کہہ دے کہ میں اسلام کے مطابق جیوں گی تو سارا معاشرہ اس کی عزت کرتا ہے باوجود اس کے کہ وہ اکیلا معاشرے کے خلاف چل رہا ہے۔یعنی ایسی عجیب بات اللہ نے اس میں رکھی ہے کہ سارا معاشرہ سود کھانے والا ہے، ایک بندہ کہتا ہے کہ میں سود نہیں لوں گا تو سود کھانے والے بھی اس کا احترام کرتے ہیں۔ سارا معاشرہ گانے بجانے پر خوش ہے، ایک کہہ دیتا ہے کہ میں یہ خرافات نہیں سنوں گا، سننے والوں کے دلوں میں اللہ اس کی عزت پیدا کر دیتا ہے۔عجیب بات یہ ہے کہ جب وہ ان کے ساتھ ان کے عمل میں شریک نہیں ہوتا۔تو چاہیے تھا کہ وہ اس کی

مخالفت کرتے، لیکن یہ تجربہ بتاتا ہے کہ وہ اس کی عزت کرتے ہیں۔

حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پاس ایک دفعہ ایک فتویٰ آ گیا اور فتویٰ بڑا عجیب تھا۔ گاؤں کے غریب لوگ تھے ان کی آپس میں رشتے کی بات ہوئی اور اس نے بیٹی کا نکاح دے دیا اس خطرے کے پیش نظر کہ دوسرے میری بیٹی نہ لے جائیں جو ایک رئیس آدمی کے نوکر تھے اور رشتہ مانگتے تھے۔ اس نکاح کے بعد اس رئیس نے اس کی بیٹی اٹھوالی۔ اور اپنے نوکر سے نکاح پڑھوا دیا۔ اب شور اٹھا، زمانہ کچھ آج سے بہتر تھا، لوگ اس طرح برداشت نہیں کرتے تھے۔ فتوے تک بات گئی، علماء تک بات گئی، بڑا الجھا ہوا معاملہ تھا۔ پھر بات حضرت تک پہنچی۔ حضرت وہاں تشریف لے گئے۔ آپ نے فرمایا بھئی کہ اگر تم اس کا تصفیہ چاہتے ہو تو ایسا کرو کہ دو بزرگ گاؤں کے ہوں، بچی ان کی تحویل میں دو، اور وہ اس حویلی میں بیٹھے ہوں۔ پھر میں تم سب کے بیانات سنوں اور میں فیصلہ اس صورت میں دوں گا کہ بچی جہاں جسے میں کہوں، اس کو دے دی جائے۔ اور اگر میں اس پر عمل نہیں کرا سکتا تو میرا فتویٰ دینا بے فائدہ ہے میں پھر آپ کی بات میں نہیں آتا۔ اس طرح سے وہ بات مان گئے، حویلی میں وہ بچی بھی بلائی گئی اور دو بزرگوں کے پاس بٹھا دی گئی۔ پھر انہوں نے اپنی اپنی روئیداد اپنے اپنے گواہوں کے ساتھ سنائی تو سارا سننے کے بعد حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے فیصلہ سنایا کہ پہلا نکاح قائم ہے دوسرا منعقد ہی نہیں ہوا۔ تم نے زیادتی کی، ظلم کیا، ان سے معافی بھی مانگو اور لڑکی اس کے پہلے خاوند کے سپرد کر دی جائے اور دوسرے جو بڑے طاقتور، جابر اور پھنے خان تھے، لڑکی ادھر موجود تھی، انہوں نے دے دی۔ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو رخصت کرنے کے لیے ان کا بندہ ساتھ آیا اور کہنے لگا ہماری ساری عمر تو مار دھاڑ میں، بدکاری میں گزری، آپ نے ایک غریب آدمی کے حق میں فیصلہ دے کر ہماری ساری کوشش ناکام بنا دی۔ ہمیں بدنامی ملی، بے عزتی ہوئی، لیکن ایک بات کی خوشی ہوئی ہے کہ اللہ کا شکر ہے کوئی حق کہنے والا تو ہے۔ یعنی یہ سارے نقصان برداشت کر کے، ساری بے عزتی (اپنے حساب سے) برداشت کرنے کے بعد اس بندے نے یہ کہا کہ اللہ کا شکر ہے، ہم آپ کی عزت کرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی ایسا بندہ تو ہے جو حق کہتا ہے۔ کسی کے رعب سے نہیں ڈرتا، کوئی اسے خرید نہیں سکتا۔ ایک نظام ہے رب العالمین کا، اللہ کریم فرماتے ہیں **مَنْ عَمِلَ صَالِحاً مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ** کوئی بندہ جو میرے ساتھ ایمان رکھتا ہو اور میرے نبی علیہ السلام کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی کا کوئی کام بھی کرتا ہے، اللہ فرماتے ہیں میرا وعدہ ہے۔

فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً میں اسے زندگی بھی بڑی مہذب و محترم، پاکیزہ و صاف ستھری دوں گا۔ دنیا میں بھی اسے عزت واحترام نصیب ہوگا، دنیا کے کاموں میں بھی اسے سہولت ہوگی۔ یہ نہ سمجھو کہ اسلام افسانوی مذہب ہے، صرف آخرت کی بات کرتا ہے۔ آخرت میں کیا ہوگا کیا نہیں ہوگا، اسلام پر عمل کرنے سے جو ثمرات مرتب ہوتے ہیں، وہ پھل حیات دنیا میں بھی کھانے کو ملتا ہے۔ اس کے خلاف آپ روئے زمین کے معاشرے پر پھر کر دیکھیں۔ محبت تو دور کی بات ہے نفرت کہیں

نہیں ملتی۔ آدمی جان بچانے کے لیے مال دے دیتا ہے۔ اگر بیماری ہو تو سارا مال خرچ کر دیتا ہے۔ کوئی اس کے سینے پر بندوق رکھ دے تو سارا مال دے کر، جان بچاتا ہے۔ لیکن آبرو کی بات آئے تو پھر جان تو دے دیتا ہے، آبرو نہیں دیتا۔ یہ انسانی مزاج ہے۔ جانوروں میں یہ ہے کہ وہ بھی اپنی آبرو کی حفاظت کرتے ہیں اور اکثر پرندے ساری ساری زندگی اپنی آبرو کی حفاظت کرتے ہیں۔ اپنے جوڑے کے ساتھ رہتے ہیں۔ بے شمار جانور اور پرندے ایسے ہیں جن کا جوڑا مر جائے تو دوبارہ جوڑا نہیں بناتے، اس سے مانوس نہیں ہوتے۔

جانوروں میں بے آبرو جانور خنزیر مشہور ہے وہ اپنی آبرو پر سمجھوتا کر لیتا ہے ورنہ کتے جیسا بدترین جانور بھی نہیں کرتا۔ اگر انسان کی آبرو ہی نہ رہی، اس کے پاس بچا کیا؟ اور سارے کافر معاشرے میں کسی آبرو کا تصور دکھایئے، سارے غیر اسلامی معاشرے میں جاپان سے امریکہ تک، چین سے افریقہ تک، کہیں آبرو کا کوئی Concept دکھا دیجیے، کوئی تصور دکھا دیجیے، بڑے بڑے نامور مثلاً ہٹلر کے باپ نے اپنی بھانجی بیوی بنالی تھی۔ ہٹلر اس کا بیٹا تھا۔ ہٹلر کی پہلی بیوی اس کی سگی بہن کی بیٹی تھی۔

اب جو جدید قانون پیرس میں، عیسائی دنیا میں، کلیسا کے پادریوں نے منظور کیا ہے وہ یہ ہے کہ داماد اپنی ساس کے ساتھ اور سسر اپنی بہو کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔ یہ تو ان کے مذہب کا تقدس ہے۔ یعنی اس فعل کو تو مذہبی اجازت حاصل ہے تو جو مذہب سے گزر گئے وہ کہاں تک جاتے ہوں گے۔ مغربی معاشرے کا ایسا واقعہ میں آپ کو سنا سکتا ہوں کہ ماں نے اپنے بیٹے سے اولاد جنی۔ سگی ماں نے اپنے پہلے بیٹے سے آگے تین چار بچے پیدا کیے۔ جس بندے کے پاس آبرو کا تصور ہی نہ رہے اسے سارا جہان دے دو، اسے فوجی طاقت دے دو، اسے معاشی خوشحالی دے دو، تو کیا معاشی خوشحالی اور فوجی طاقت اس معاشرے میں نہیں ہے۔ ہمیں انہوں نے دھوکا دے رکھا ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى یہ نہ سوچو کہ معاشرہ جدھر جا رہا ہے ہم بھی ادھر ہی جائیں، سب چور ہیں تو ہم بھی چوری کریں۔ سب جھوٹ بولتے ہیں، ہم بھی جھوٹ بولیں۔ یہ ہمارا ٹرینڈ (Trend) بن گیا ہے۔ کہتے ہیں جی ماحول ہی ایسا ہے، جی معاشرہ ہی ایسا ہے۔ ارے میں اور آپ معاشرہ ہیں، ہم معاشرے کا حصہ ہیں۔ جو ہم سوچتے ہیں، جو ہم کہتے ہیں وہ معاشرہ ہے۔ تو کیا معاشرے میں ہم سب برائی میں شریک ہو جائیں؟ یہ معاشرے کی اصلاح ہے یا کہیں کوئی ایک بندہ تو معاشرے میں صحیح بھی ہو یا سب ہی ایک دوسرے کو کھا جائیں؟ اللہ کریم وعدہ فرماتے ہیں۔ کہ میری عظمت، میری قدرت پر یقین رکھنے والو! میری اس بات پر بھی یقین رکھو کہ تنہا بھی اگر میری راہ میں ڈٹ گئے، اپنا طرز عمل اسلام کے مطابق کر لیا تو تمہیں دنیا میں سکون بھی ملے گا، آبرو بھی ملے گی، احترام بھی ملے گا۔ تمہارے کام بھی دوسروں کی نسبت آسانی سے ہو جائیں گے۔ تمہاری بات میں وقار بھی ہوگا، تمہاری آبرو بھی بڑھے گی۔

فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً اللہ کریم وعدہ فرمارہے ہیں کہ میں دنیا کی زندگی بھی اسے خوبصورت بسر کرنے کی توفیق دے دوں گا۔لوگوں کے دلوں میں اس کا احترام بھی ہوگا، اس کی آبرو بھی محفوظ ہوگی، اس کی عزت بھی ہوگی۔

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ مزے کی بات یہ ہے کہ دنیا میں اسلام پر عمل کرنے سے، سود نہ کھانے سے، معیشت میں آسانی ہوگی۔ آپ ان لوگوں سے پوچھیے جنہوں نے سود پر قرضے لیے ہیں اور اس کا حساب دیکھیے۔ میں اگلے دن ۷ فیصد سود در سود کا تجزیہ پڑھ رہا تھا۔ جرمنی میں ۱۹۷۲ء میں ایک آدمی نے سو(100) مارک جمع کرائے جو 2022ء میں ایک سو سے بڑھ کر ڈھائی سو کروڑ ہو جائیں گے۔ اسے آپ پچاس برسوں پر تقسیم کریں تو جواب ڈھائی لاکھ آتا ہے یعنی فی الحقیقت ڈھائی لاکھ گنا سود بنتا ہے جسے آپ سات فیصد کہتے ہیں۔ دنیا اسی لیے تو مصیبت میں ہے کہ کوئی دس ہزار لے بیٹھتا ہے تو اس کے بچے بھی سود دیتے جارہے ہیں پھر بھی وہ دس ہزار باقی رہتا ہے۔ جب تک مکان قرق نہ کرلیں، جب تک جائیداد نہ چھین لیں، جب تک بندے کو لٹکا نہ دیں، وہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ وہ پیپر ورک ہے صرف دکھاوے کو سات فیصد ہے عملاً ڈھائی لاکھ فیصد ہے۔

تو جو نہیں لیتا، وہ دو دن فاقے کر لیتا ہے، ساری عمر سود خور کے دروازے پر ذلیل تو نہیں ہوتا۔ آسانی اس طرح ہے ایک جھوٹ بول کر فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ جب جھوٹ کا پول کھلتا ہے تو وہ کسی قابل نہیں رہتا۔ اس سے بہتر وہ رہتا ہے جو سچ بولتا ہے، نقصان اٹھالیتا ہے، سکون سے سوتا ہے، اطمینان سے جاگتا ہے اور معاشرے میں جو احترام ملتا ہے، وہ الگ ہے۔ تو اللہ کریم کی یہ ضمانت دیکھیے کہ معاملہ آپ نے معاشرے کے لیے نہیں کرنا، لوگوں کو منوانے کے لیے نہیں کرنا، ہر بندے نے معاملہ رب العلمین سے کرنا ہے۔ اگر پوری دنیا غلط روش اپنالے، فرمایا ایک بندہ جو کمزور سہی، ایک عورت سہی، اسلام کے مطابق زندگی گزارے، فرمایا میں اس کی زندگی خوبصورت کردوں گا یہ میرا وعدہ ہے۔

ہمیں کارل مارکس نے کہا اس طرح زندگی بجتی ہے، ہم ادھر بھاگ پڑے۔ ماؤزے تنگ نے کہا اس طرح خوبصورت ہے، ادھر بھاگ پڑے۔ ہٹلر نے ایک تصور دیا کہ اس طرح خوبصورت ہے، ادھر بھاگ پڑے۔ مغرب ایک تصور دیتا ہے کہ جمہوریت خوبصورت ہے۔ اب ہر فقیر چھوٹا بڑا جمہوریت جمہوریت کی رٹ لگا رہا ہے۔ بھئی اگر جمہوریت ہوتی تو مکہ میں بات کس کی سنی جاتی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یا ابوجہل کی۔ تمہاری جمہوریت تو ابوجہل کے پاس تھی اسلام حق کو اہمیت دیتا ہے، شور شرابے کو اہمیت نہیں دیتا۔ اسلام میں حق کی، صداقت کی اہمیت ہے جمہوریت کی نہیں۔ اور اسلام میں دونوں کا معیار ہے۔ جمہوری اسلام یہ ہے کہ قوم کو وہ افراد دو جن کی نیکی کا بندوں کو اعتبار ہے۔ نرے نیک ہی نہ ہوں، اس شعبے کے ماہرِ فن بھی ہوں۔ اگر وہ ایک بات پر متفق ہو جائیں پھر وہ بات ان کے اتفاق سے عامۃ الناس کے سامنے رکھی جائے کہ وہ قبول کرتے ہیں یا نہیں۔ یہ نہیں کہ ہر نتھو خیرا اٹھ کر اس میں مداخلت کرلے اگر آپ جرنیل چننا چاہتے ہیں تو اس کی رائے دینے والے جرنیل ہوں۔ اگر آپ مفتی چننا چاہتے ہیں تو مفتیوں کی بات کی اہمیت ہوگی۔ اگر آپ حاکم چننا چاہتے ہیں تو

حکومت نے آشنا لوگوں کی رائے کو اہمیت دیں گے، دیانت دار لوگوں کی رائے کو اہمیت دیں گے۔ وہ جس پر متفق ہو جائیں، پھر آپ عوام کے سامنے لے کر جائیں گے کہ آپ کے صاحب رائے لوگوں نے یہ چنا ہے اور کیا وہ اس پر اتفاق کرتے ہیں یا نہیں جو یہ تماشا بنا ہوا ہے کہ چیف جسٹس کا بھی ایک ووٹ ہے اور لیٹرینیں صاف کرنے والے بھنگی کا بھی ایک ووٹ ہے۔ اس کی رائے اس کی رائے برابر ہے۔ یہ مغربی جمہوریت ہے اور یہ خود سود کی طرح ایک اور دھوکا ہے کہ جی اکثریت کی حکومت ہے۔ دس آدمی میدان میں اترتے ہیں، ان میں اکثریت والا کون ہوتا ہے، ہارنے والے، تو بندوں کی اکثریت ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ جو ہار گئے جنہوں نے ان کو ووٹ دیے ان کی تعداد جمع کریں اور جس ایک کو آپ جتوا رہے ہیں اس کی جمع کریں تو اکثریت کا پول کھل جائے گا۔ صدر سے لے کر چپڑاسی تک جمہوریت جمہوریت، ارے اسلام کا نام لیں تو تمہارا منہ بنتا ہے، تمہیں اتنی شرمندگی ہے اپنے مسلمان ہونے سے تو پھر اپنی نصرانیت کا یہودیت کا اعلان کرو۔ اتنے معذرت خواہانہ اسلام کی کیا ضرورت ہے؟ اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمارے لیے ایک ہی طرز حیات ہے اور وہ اسلام ہے۔ کوئی جمہوریت نہیں، کوئی فسطائیت نہیں، کوئی سوشلزم نہیں، کوئی کچھ بھی نہیں۔ یہ ساری خرافات ہیں اور ان سب میں مصیبتیں ہیں۔ آبرو آرام اور سکون اللہ کے وعدہ میں ہے۔ اگر ایک بندہ بھی ایمان کے ساتھ عمل صالح اپنا لے تو آبرومندانہ حیاتِ دنیوی عطا کرنا یہ میرے اللہ کا وعدہ ہے اور یہ بھی کہ دنیا کی زندگی جب ختم ہوگی تو آخرت میں اس کے کردار واعمال کروڑوں گنا زیادہ دوں گا۔ فرمایا **اَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ** اور اس نے کام اپنی حیثیت کے مطابق کیا، میں جو بدلہ دوں گا وہ میری شان کے مطابق ہوگا۔ اس کے کام سے کروڑوں گنا۔ اَحسن اسم تفضیل (Superlative Degree) ہے۔ بہت زیادہ حسین، بہت زیادہ بہتر، بہت زیادہ اچھا۔

حضرت مالک بن دینار درویش بھی تھے اور صاحب ثروت بھی۔ ایک بڑھیا نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میرا بیٹا بیمار ہے، مجھے شہد چاہیے۔ آپؒ نے خادم سے کہا کہ تہہ خانے میں جاؤ اور ایک مشکیزہ لے آؤ۔ (اس زمانے میں عرب بکری کے چھوٹے بچوں کی کھال سے مشکیزے بنا کر اس میں شہد محفوظ رکھا کرتے تھے جس میں بیس پچیس سیر آ جاتا ہوگا) وہ مشکیزہ اٹھا کر لے آیا تو آپ نے اشارہ کیا کہ نیک بخت کو دے دو۔ وہ مشکیزے سمیت دعائیں دیتی چلی گئی۔ بعد میں آپ کے خزانچی نے پوچھا، حضرت اس نے سوال ایک کٹورے کا کیا تھا، آپ نے مشکیزہ اسے دے دیا، اسے اس کی ضرورت بھی تھی یا نہیں، آپ اسے کٹورا دیتے۔ فرمایا دیکھو، اللہ دیکھ رہا ہے، اس نے سوال کیا تھا اس کی حیثیت ہی اتنی تھی، وہ سمجھ رہی تھی کٹورا بھی بڑی چیز ہے اگر یہ بھی مل جائے بڑی غنیمت ہے۔ مجھے اللہ نے اتنا دیا ہے کہ ایسے سینکڑوں مشکیزے میرے پاس ہیں۔ میں نے دیا ہے اپنی حیثیت سے کہ مجھے اللہ سے حیا آئی کہ وہ کہے گا تو نے کٹورا ہی دیا، تجھے تو میں نے منوں دیا تھا۔ اگر اللہ کے بندوں کا یہ حال ہے تو جب وہ خود کسی کو اجر دے گا، تمہاری مزدوری کے مطابق نہیں اپنی شان کے مطابق دے گا۔ یعنی اسلام پر عمل دنیوی زندگی کے مسائل کا حل بھی ہے اور آخرت کی سرخروئی کا سبب بھی۔ (مزید سورۃ نحل آیت نمبر ۹۷ اسرار التنزیل جلد چہارم صفحہ نمبر 114، 115 پر پڑھ سکتے ہیں اس کے علاوہ اکرم التفاسیر بھی ملاحظہ فرمائیں)۔

☆ ☆ ☆

سبق نمبر ۱۰: سورۃ المائدہ

آیت نمبر ۸

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ

اے ایمان والو! اللہ کے لئے انصاف کے ساتھ گواہی دینے پر

بِالْقِسْطِ ۫ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ

قائم رہنے والے بنو اور لوگوں کی دشمنی تمہیں انصاف چھوڑنے پر آمادہ نہ کر دے انصاف کرو

اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ

کہ یہ نیکی کے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو کہ بے شک ۔ اللہ

خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۞

تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہیں۔

اسلام نے بنیادی طور پر اپنا ایک معاشرہ تخلیق کیا۔ اس نے کہیں سے کوئی بات ادھار نہیں لی، کسی کی پیروی نہیں کی۔ اور جو باتیں گزشتہ ادیان کی یا جو باتیں کافر معاشرے میں انسانیت کے لیے مفید تھیں، وہ اگر کافر معاشرے میں بھی رائج تھیں تو انہیں کافروں سے ادھار نہیں لیا گیا، اللہ نے ان کو جاری رکھنے کا حکم دیا۔ یہ بہت بڑا فرق ہے۔ یاد رکھیے، ایک دھوکہ دیا جاتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں رواج پر عمل کر لیا تھا، یہ غلط ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی رواج پر عمل نہیں کیا تھا بلکہ اللہ کریم نے اس بات کو اپنانے کا حکم دیا۔ تو آپ نے بحیثیت رواج کوئی بات نہیں اپنائی، آپ نے جو بات بھی اپنائی وہ اللہ کریم کے حکم سے اپنائی۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی بات ایسی ہو جو پہلے بھی رائج ہو۔ اس لیے ہم اگر آج کوئی ایسی مثال قائم کرنا چاہیں کہ خلاف اسلام رواجات کو قبول کرنا چاہیے، تو اس کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اسلام نے ہر پہلو پر رہنمائی فرمائی اور انسان کے لیے بہترین معاشرہ ترتیب دیا۔ اس میں ایک بہت بڑی بات یہ ہے کہ معاشرہ اور سوسائٹی انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے ہوتی ہے۔ ہر انسان کا زندہ رہنے کا ایک حق ہے، ہر انسان کا اپنا عقیدہ اپنانے کا ایک حق ہے۔ ہر انسان کو اس کی ملکیت کا ایک حق دیا گیا ہے۔ ہر انسان کو کاروبار کرنے کا ایک حق دیا گیا ہے۔

تو اس طرح سے معاشرے میں جتنے بھی انسانی حقوق بنتے ہیں اور جو محکمہ یا جو ادارہ بنتا ہے، اسے ہم حکومت کہہ لیں یا اسے کوئی بھی نام دیں، اس سے غرضِ اصلی یہ ہوتی ہے کہ وہ معاشرے میں انسانی حقوق کی حفاظت کرے۔ اسی کا نام امن ہے۔ اب انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے جو ادارہ بنے گا، وہ بھی تو انسان ہی چلائیں گے۔ اب معاشرے میں وقوع پذیر ہونے والے حادثات یا واقعات جن کے روبرو ہوتے ہیں، اگر وہ لوگ غلط بات کہیں اور جھوٹی گواہی دیں تو کوئی عدالت کوئی ادارہ کوئی حکومت انصاف کیسے کر سکے گی۔ تو اسلام نے اس پہلو کو یوں لیا کہ اگر تمہارے سامنے کوئی واقعہ ہوتا ہے تو اس کی شہادت تمہیں اس لیے نہیں دینی کہ تم نے دیکھا اور بتانا نہیں، اللہ نے تم پر یہ ذمہ داری عائد کر دی ہے کہ جب تم دیکھ رہے ہو تو **كُونُوا قَوّٰمِينَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ** نہایت انصاف کے ساتھ اللہ کے لیے کھری بات کرو۔ جو کچھ تم نے دیکھا ہے جو کچھ سنا ہے یا جو واقعہ تم نے دیکھا، اس کی شہادت اس لیے نہ دو کہ جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، اس کے ساتھ تمہیں دلچسپی ہے۔ اس لیے بھی نہ دو کہ جو ملزم ہے اس سے تمہیں ناراضگی ہے۔ اس لیے بھی بات کو نہ بدلو کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی تم بھی اس سے خفا ہو، ٹھیک ہے اس کا علاج ہوا، اس کی شہادت نہ دو۔ نہیں، تمہارا نہ اس کے ساتھ تعلق ہے جس نے زیادتی کی، نہ اس کے ساتھ تعلق ہے جس کے ساتھ زیادتی ہوئی۔ جب تمہارے سامنے ایک واقعہ ہوتا ہے تو تمہاری حیثیت اللہ کی طرف سے گواہ کی بن گئی۔ ان کی دوستی دشمنی سے الگ اپنی ذاتی پسند و ناپسند سے الگ اپنی خواہش سے بالاتر ہو کر اب تمہیں جو بات کرنی ہے "**کونو قوامین**" ڈٹ کر بات کرنے والے بنو "**للّٰہ**" اللہ کے بندے ہو تم مومن ہو۔ تمہیں جو بات کرنی ہے اس لئے کرنی ہے کہ اللہ کریم نے تم پر ذمہ داری ڈال دی ہے اور نہایت اعتدال کے ساتھ انصاف کے ساتھ وہ بات کرو **وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا** کسی کی ناراضگی میں کسی سے خفا ہو کر کسی کے غصے میں غلط گواہی مت دو۔

ایک واقعہ کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے تو جو اس میں ملزم ہے اس کے خلاف کسی رنجش کی وجہ سے گواہی دینے چلے جاؤ یا جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اور تم چشم دید گواہ ہو، تم گواہی دینے سے اس لیے کنی کترا جاؤ کہ یہ میرا بھی دشمن ہے، ذلیل ہوتا رہے۔ نہیں! ہر وہ شخص جس کے سامنے کوئی واقعہ وقوع پذیر ہوتا ہے، اس پر اللہ کی طرف سے یہ ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔ وہ اللہ کا گواہ ہے۔ اللہ نے اسے دیکھنے سننے کی قوت دی ہے۔ اسے چاہیے کہ پورے استقلال کے ساتھ اور پورے انصاف کے ساتھ وہ بات آگے پہنچائے اور کسی کی دوستی اس کے راستے کی آڑ نہ بنے، کسی کا غصہ کسی کی دشمنی اسے کسی زیادتی کا مرتکب نہ بنائے۔ اور ایسا نہ ہو کہ کسی سے خفا ہو کر **تَعْدِلُوْا** تم انصاف کا دامن چھوڑ دو اور غلط گواہی دو یا صحیح گواہی دینے سے انکار کر دو یہ دونوں چیزیں انصاف کا دامن چھوڑ دینے کے برابر ہیں۔ **اِعْدِلُوْا** انصاف کرو حق پر رہو کیوں **هو اقرب للتقوىٰ** کہ تقویٰ تو تمہارا مقصدِ حیات ہے اور حق پرستی حق پسندی حق پر عمل کرنا یہ تقویٰ کا سب سے قریب ترین راستہ ہے۔ قرآن حکیم نے مسلمان کو معاشرے سے انسانی زندگی سے الگ تھلگ نہیں کیا بلکہ معاشرے کی اور انسانی زندگی کی ایک ایک ضرورت کے

خوبصورت ضابطے عطا فرمائے ہیں۔ خوبصورت قواعد عطا فرمائے ہیں جو معاشرے کی صحت کے لیے، خاندانوں کی دوستی کے لیے، حکومت اور حکمرانوں کی صحت کے لیے، رعیت کے فائدے کے لیے، اور مالک کے فائدے کی بات کرتا ہے تو نوکر اور غلام کے فائدے کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ عدالت کے لیے صحیح شہادتوں کا اہتمام کرتا ہے تو جرم کرنے والے کو بھی سزا دلوانا چاہتا ہے۔ مجرم کی حوصلہ افزائی بھی کرنا نہیں چاہتا اور جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے اس کے ساتھ تلافی مافات بھی چاہتا ہے۔ یعنی اسلام ایک خوبصورت سوسائٹی کا نام ہے۔ ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم (One Sided) یک طرفہ ہو گئے ہیں۔ اگر ہم نے معاشرے میں یا سوسائٹی میں حصہ لیا ہے Participate کیا ہے تو ہم شاعر بن گئے، ادیب بن گئے، دانشور بن گئے، حکمران بن گئے، سیاستدان بن گئے لیکن صرف ایک چیز ہی رہی۔ جس نے سیاست شروع کی وہ سیاستدان تو بن گیا۔ اسلام تو دور کی بات ہے، اسے بیوی بچوں کا بھی پتہ نہیں ہے۔ جس نے شاعری شروع کی، نامور شاعر تو بن گیا لیکن گھر بار سے بھی بے خبر ہو گیا، دین مذہب یا قوم تو دور کی بات ہے۔ اسی طرح آپ اگر اپنے معاشرے کے نامور لوگوں کو دیکھیں تو ان میں سے ہر نامور بندہ بھی آپ کو یک طرفہ نظر آئے گا۔ زندگی کے راستے سے ہٹ چکا ہوگا۔ آخر یہ لوگ کیوں ہٹ جاتے ہیں، کیوں سنگل ٹریک ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ عقیدے کی کمزوری یا اللہ سے دوری، بندے کو وہ ہمت ہی نہیں دیتی کہ ایک بندہ متعدد کام کر سکے۔ بندے کی جو استعداد ہے وہ ایک کام میں فنا ہو جاتی ہے حتیٰ کہ ہم نے ایسے بھی دیکھے ہیں کہ انہیں کھانا کھانے کا ہوش نہیں رہتا۔ ان کی زندگی بالکل ایک طرف ہو جاتی ہے اور دوسری طرف کا ہوش ہی نہیں رہتا۔ اسلام نے وہ خوبصورت زندگی دی ہے کہ مسجد میں امامت کر سکے اور لشکر کی قیادت کر سکے۔ خواہ کسی لیبارٹری میں کام کرتا ہو، دفتر کا کلرک بھی ہو اور ضرورت کے وقت فتویٰ بھی دے سکتا ہو۔ اسلام نے انسان کو ایک بھرپور انسان بنایا ہے اور منشاء اسلام یہ ہے کہ اللہ کا ہر بندہ، دین کو ماننے والا ہر بندہ، اپنی ضرورت کے مطابق ذاکر بھی ہو، عالم بھی ہو، قاری بھی ہو، عبادت گزار بھی ہو، مفتی بھی ہو، فقہ بھی جانتا ہو، ضروریاتِ دین سے بھی واقف ہو اور زندگی میں بھی پوری پوری حصہ داری کرے۔ یہاں مصیبت یہ ہے کہ ہم کسی کو بھرپور زندگی گزارتا دیکھیں تو اس پر فتویٰ، کسی کو نرا مسجد میں بیٹھا دیکھیں تو اس پر فتویٰ، تو یہ دو گروپ بن گئے ہیں۔ دفتر والا کہتا ہے کہ جو مسجد میں بیٹھے ہیں مجھے تباہ کر رہے ہیں، انہیں سولی پر لٹکا دینا چاہیے اور مسجد والا سارا دن دفتر والے کے لیے بددعائیں کرتا ہے کہ یہ تباہ ہو جائے۔ حق یہ ہے کہ جو میدانِ عمل میں ہے، آدھا دین اس کے پاس بھی ہے۔ دنیا کو سیکھنا بھی تو دین ہے۔ یہ ساری دنیوی باتیں ہی ہیں جو قرآن کریم ہمیں سکھا رہا ہے۔ تو انسان کے لیے دنیا کے علوم کو سیکھنا بھی تو دین ہے لیکن تب دین ہے جب آپ دین بھی سیکھ چکے ہوں۔ تو اس کو تقسیم کر کے ہم نے قوم کی کوئی مدد نہیں کی بلکہ قوم کا نقصان کیا ہے۔ اب اللہ کرے کہ علماء کو اور دینی طبقے کو یہ بھی خیال آئے کہ وہ بھی دنیا کے کام کرنا سیکھے اور دنیا دار طبقے کو بھی چاہیے کہ تعلیماتِ قرآنی سے دین کو اپنا دین سمجھ کر سیکھیں۔ دین مولوی کا پیٹنٹ نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں مولوی صاحب کا مذہب ہے، یہ

پیر صاحب کا مذہب ہے۔ نہیں! مذہب ہر مسلمان کا ذاتی اور اپنا ہے۔ جو آپ کا بنک بیلنس ہے کبھی آپ نے اس طرح کیا ہے کہ اُس کے بارے صرف مولوی صاحب جانتے ہوں۔ وہ تو کہتے ہو میرا اپنا ہے، مجھے خود پتہ ہونا چاہیے کہ کمی ہوئی اس میں یا اضافہ، تو یہ دین بھی بنک بیلنس ہے جو اس ملک کا سکہ ہے جہاں آپ کو جانا ہے۔ برزخ میں، آخرت میں، یہ دنیا کے بعد کی طویل زندگی کا سرمایہ ہے۔ دین پر عمل کرنا دنیوی حیات میں اللہ سے تعلق کو قائم رکھنا، اللہ سے اتنی محبت بڑھانا کہ اس کی نافرمانی پر حیا آ جائے، تو یہ تقویٰ کے قریب تر راستہ ہے کہ عدل پر رہو اور **''واتقو اللہ''** اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ دیکھیں ہر حکم کے ساتھ ہر عبادت کے ساتھ ہر موڑ کو لے کر اللہ کریم بندے کو لے کر وہیں پہنچاتا ہے کہ تو بندہ ہے میں پروردگار ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ تو میرا چاہنے والا ہو جائے، تو مجھ سے محبت کرے اور تو میری رضا کو اپنی رضامندی سمجھے اور تو میرے حکم پر جئے اور مرے، میرا طالب میرا دیوانہ میرا پروانہ بن جائے۔ اور فرمایا یہ بھی یاد رکھو **اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْن** ہزار جذبات چھپا کر بھی ناانصافی کرو گے تو اللہ کو چھپی باتوں کی بھی خبر ہے۔ یعنی بظاہر تقدس کا لباس اوڑھ کر دین کے پردے میں اگر کسی سے دشمنی نکالنے کی کوشش کرو گے، کسی کے خلاف شہادت دو گے، بظاہر معاشرے میں تم پر حرف نہ بھی آئے، اللہ کے علم سے وہ بات نہیں چھپ سکتی۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ اس کا ماننے والا صرف اللہ کا بندہ ہو۔ کسی کا غلام نہ ہو، سوائے رب کے کسی کا بندہ نہ ہو۔ زندگی کی ایک ایک ادا وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے اور اپنا معاملہ عمل کی زندگی میں اپنے پروردگار کے ساتھ قائم رکھے۔ تو اب اسے یوں تقسیم کر لینا کہ ہم نرے عبادات پر وظائف پر اذکار پر آ جائیں اور دفاتر میں ہماری کارکردگی کم ہو جائے، وہ رزق کو حرام کر دے گی۔ جو تنخواہ ہم لیتے ہیں، اس کے بدلے کام پورا نہیں کریں گے تو روزی حرام ہو جائے گی۔ حرام روزی دل میں ذکر کی برکات بھی پیدا نہیں ہونے دیتی۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام کے نقصان کا جو ایک نقشہ کھینچا ہے وہ بڑا ہی عبرت آموز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کوئی شخص دور سے سفر کرتا ہوا صحراؤں اور جنگلوں کی وسعتوں سے گزرتا ہوا کہ اس کا لباس پھٹ جائے گا بال گرد آلود ہوں گے پاؤں مٹی سے بھرے ہوں گے تو دیوانہ وار پیدل بیت اللہ میں پہنچے۔ اور وہ چکر لگا رہا ہو طواف کر رہا ہو اور دل کے درد سے پکار رہا ہو یا رب! یا رب! حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اس کی اس پکار کا اللہ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آئے گا۔ یہ پورا نقشہ اس حدیث شریف میں کھینچا گیا ہے کہ اتنا دور دراز سے آئے، اس کا اتنا برا حشر ہو، تھکاوٹ سے چور ہو، گرد آلود ہو، بال پریشان ہوں، لباس پھٹ جائے اور درد سے اللہ اللہ پکار رہا ہے۔ جواب نہیں آتا۔ کیوں؟ فرمایا اس لیے کہ اس کی غذا حلال نہیں۔ حرام سے جو گوشت بنتا ہے، حرام سے جو خون بنتا ہے، حرام سے جو تعمیر بدن ہوتی ہے، جب بدن پر حرام چڑھتا ہے تو اس حرام کے غبار میں عقیدے کا بچ رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اللہ رحم کرے اور بندہ عقیدہ بچا کر بھی لے جائے تو فرمایا بدن کے گوشت کا وہ حصہ جو حرام سے بنا ہے **النار اولیٰ بہ او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم** اسے آگ ہی سزاوار ہے۔ حرام کا بنا ہوا گوشت جنت میں

نہیں جائے گا۔ جہنم میں جانا ہوگا۔ وہ گوشت جل جائے گا، جب تک اللہ چاہے گا وہ جلے گا، پھر اللہ انہیں معاف فرمائے گا۔ اس کی جگہ نیا گوشت عطا کر کے جنت بھیج دے گا لیکن حرام کا بنا ہوا گوشت جنت میں نہیں جائے گا۔ تو عملی زندگی میں اپنے حصے کا کام نہ کرنا بھی روزی کو حرام کر دیتا ہے۔ یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ ہم تبلیغ پر چلے گئے اور فرائض سے غافل ہو گئے، تنخواہ دفتر سے لے لی، تبلیغ پر جانے کے لیے جائز چھٹی لو، بیوی بچوں کے اخراجات اور ذمہ داری کا اہتمام کرو۔ تبلیغ پر ضرور جاؤ لیکن اپنی گھر کی ذمہ داری پوری کر کے، باہر کے اخراجات لے کر نہیں تو ناجائز ذرائع استعمال نہ کرو، دین کی بدنامی کا سبب مت بنو۔

کیا آپ نے دفتر میں حاضری دی؟ تنخواہ لے رہے ہیں، کام کے وقت آپ تبلیغ پر ہیں۔ اللہ کا دین آپ کی اس بددیانتی کا محتاج نہیں اور نہ یہ بھی یاد رکھیں کہ کبھی بددیانتی سے دیانت اور امانت اور دین نہیں پھیلتا، اگر پانی ہی ناپاک ہو تو اس میں دھونے سے کپڑا کیا پاک ہو جائے گا۔ ایک کام کی بنیاد میں ہی ہم نے حرمت داخل کر دی تو آگے جو اس کے نتائج ہوں گے، وہ حلال نہیں ہوں گے۔ اس لئے دین کو دین سمجھا جائے۔ اپنی ذمہ داریاں حسن و خوبی کے ساتھ پوری کی جائیں۔ مزہ جب ہے کہ آپ اپنا آٹھ دس گھنٹے دفتر کا کام کر کے پھر دو گھنٹے تبلیغ کے لیے بچائیں۔ تبلیغ ضرور کریں لیکن اپنی ذمہ داری پوری کر کے۔ تہجد ضرور پڑھیں لیکن وہ آپ کی کارکردگی کو متاثر نہ کرے۔ ذکر ضرور کریں لیکن جہاں سے اجرت لیتے ہیں وہاں کام بھی کریں۔ اور کام کرنا سیکھیں، یہ بھی دین ہے۔ اور اسلام محض حجرے یا گوشے آباد نہیں کرنا چاہتا، اسلام انسانیت کو اللہ کی زمین پر پھلتا پھولتا، آسودہ حال اور خوبصورت معاشرے کی صورت میں رہتا اور بستا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ اسلام وہ خوبصورت دین ہے جس نے کافر کو بھی انسانی حقوق سے محروم نہیں کیا۔ بحیثیتِ انسان جو حق کافر کا بنتا ہے، وہ کافر کو بھی دیا ہے چہ جائیکہ ہم مسلمان کا حق ماریں۔ مسلمان حکومت کا حق ماریں یا مسلمان طالب علموں کا حق ماریں یا مسلمان رعیت کا اور پبلک کا حق ماریں کہ ایک شخص دفتر میں بیٹھا ہے، وہ کسی کی بات ہی نہیں سنتا۔ تنخواہ لیتا ہے، سیٹ پر بیٹھا ہے۔ کوئی کام اس کے پاس لے کر جاؤ تو آپ کی بات ہی نہیں سنتا۔ ایک ٹیلی فون کا افسر ہے، آپ کا ٹیلی فون خراب ہے، متعلقہ آدمی ہے، آپ جاتے ہیں، وہ بات نہیں سنتا، ایک افسر پولیس کا بیٹھا ہے، ڈرتے ہوئے کوئی تھانے کو منہ نہیں کرتا کہ پکڑ کر مارے گا، سنے گا بھی نہیں۔ یہ اسلام ہے؟ ہمارے یہاں ایک دفعہ جنرل محمد ایوب خان نے، اللہ اس پر رحم فرمائے، بنیادی جمہوریت کا ایک تماشا شروع کیا تھا اور اس میں کچھ ادارے بنے، اور پھر ان کے کچھ افسر بنے جو باہر سیکھنے جاتے تھے۔ امریکہ تک سے وہ ٹریننگ لے کر آتے تھے۔ تو یہاں جلسہ تھا، اس میں میں بھی تھا، امریکہ سے آئے ہوئے ایک افسر نے خطاب کیا۔ وہ یہ تھا کہ ہمیں جو ٹریننگ دی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ جس دفتر میں جس کرسی پر بیٹھے ہیں، کوئی بندہ آجاتا ہے تو پہلی بات تو آپ یہ سوچیں کہ کوئی بھی گھر سے اٹھ کر کسی کے دفتر بلا ضرورت نہیں جاتا، یعنی آپ سمجھ لیں کہ اسے کوئی ضرورت میرے دفتر تک لائی لہذا اس کی بات سنیں۔ چونکہ وہ بلا ضرورت نہیں آیا پھر اگر اس نے بات شروع کی تو آپ بیٹھے ہیں محکمۂ ٹیلی فون کے دفتر میں اور اس کی بات

ہے بجلی والوں کی تو آپ اسے بات کرنے دیں، ٹوکیں نہیں۔ جب وہ ختم کر چکے تو اسے اطمینان سے سمجھائیں کہ جس دفتر کی آپ بات کر رہے ہیں، وہ یہ نہیں ہے۔ وہ دفتر فلاں نکڑ پر ہے۔ آپ کا مسئلہ فلاں افسر کی ذمہ داری ہے۔ یہ نہ کہیں کہ یہ میرا کام نہیں ہے، کسی اور کے پاس جائیں۔ کیونکہ اس طرح سائل کی آدھی عمر تو نہ نہ میں بسر ہوگئی۔ اسے پتہ ہی نہیں چلے گا مجھے جانا کہاں ہے۔ تو بجائے اس کے کہ وہ مزید پریشان ہو، وہ پہلا افسر ہی اسے بتادے کہ بھائی آپ کا کام فلاں بندے سے متعلق ہے، سیدھے وہاں جایئے۔ اور اس کی بات تسلی سے سن کر جو ممکن صورت حال ہو اسے سمجھائی جائے۔ کوئی گھنٹے بھر کی تقریر تھی۔ اِس کے بعد انہوں نے مجھے Wind up کرنے کی دعوت دی تو میں نے عرض کیا کہ آپ کو ہر چیز امریکہ سے درآمد کرنے کا شوق ہے۔ یہ باتیں امریکہ نے مسلمانوں سے سیکھی ہیں۔ جب مسلمانوں کی سلطنت روئے زمین پر پھیل رہی تھی تو امریکہ میں Red Indians رہتے تھے۔ وحشی قوم تھی اور ان سے نو آباد کاروں نے جنھیں آپ نئے امریکن کہتے ہیں، جس حال میں امریکہ ان سے چھینا دنیا کی تاریخ میں ہے کہ پہلی دفعہ اس ملک کے سارے شہری قتل کر دیئے گئے۔ یعنی تاریخ میں صرف امریکہ ہی ایک ملک ہے کہ جس میں باہر سے آنے والے آباد کاروں نے اس کے اصل باشندوں کو سرے سے نابود کر دیا۔ انسانی تاریخ میں ایسی وحشت کہیں نہیں ملتی۔ امریکہ کی تاریخ یہ ہے۔ دو چار ہزار نمونے کے طور پر ریڈ انڈین انہوں نے ابھی تک رکھے ہوئے ہیں۔ اتنے بڑے براعظم میں جس میں چپے چپے پر ریڈ انڈین قبائل آباد تھے، اس کے چپے چپے کو ان کی لاشوں سے اٹ دیا گیا۔ وہ سخت مزاج لوگ تھے۔ آپس میں ان کی بنتی نہیں تھی۔ قبائل آپس میں بھی لڑتے تھے اور ان نو آباد کاروں سے بھی لڑتے رہے۔ اتنے غیرت مند تھے کہ ہر قبیلہ آخری بندے کے آخری خون کے قطرے تک لڑتا رہا۔ غلامی انہوں نے قبول نہیں کی اور ظلم میں ان نو آباد کاروں نے انسانی تاریخ میں مثال قائم کر دی۔ اتنا ظلم کیا کہ جس ملک پر قبضہ کیا اس ملک کے اصل رہنے والے باشندوں کی نسلیں ختم کر دیں۔ عورتیں بچے بوڑھے ہر ایک کو قتل کر دیا۔ آج دنیا کو امریکہ تہذیب کا سبق سکھا رہا ہے۔

ببیں تفاوت کجا است تا بکجا۔ کیا لوگ ہیں اور کیا بہروپ ہے۔ آج بھی واحد ظالم قوم امریکن ہیں کہ جو ظلم امریکن کر سکتے ہیں وہ دنیا کی کوئی بدترین سفاک قوم بھی نہیں کرتی حتیٰ کہ سوشلسٹ بھی اتنا ظلم نہیں کرتے جتنا امریکن کر گزرتے ہیں۔

اس کی مثال کوریا میں موجود ہے۔ اس کی مثال ویت نام میں موجود ہے۔ اس کی مثال افریقہ کے ایک ایک ملک میں نظر آتی ہے اور خود امریکہ کے اندر جو ظلم امریکن اپنی امریکی قوم پر کرتے ہیں، اس کا تصور ہی نہیں۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ امریکہ کے شہری بھی جس ظلم میں پستے ہیں، اس کی کوئی انتہا ہی نہیں، اور اس کی تفصیل بتانا بڑا لمبا کام ہے۔ میں نے کچھ اس کی جھلکیاں غبار راہ میں لکھی بھی ہیں جن سے کچھ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کا اپنا حال کیا ہے اور ایک دوسرے سے وہ کس طرح بنتے ہیں۔ ان سے بھلائی کی امید ہی فضول ہے۔ اسلام ان سارے معاشروں کے مقابلے میں خوبصورت معاشرہ بنانے کی

تعلیم دیتا ہے۔اور مسلمان وہ ہے جو کافر دنیا پر ثابت کرے کہ ساری دنیا بھی کافر ہو جائے مسلمان اکیلا بھی اللہ کے دین پر قائم رہ سکتا ہے۔اور زندگی کے ہر شعبے میں اسلام پر عمل کر کے دکھائے۔صرف نماز پڑھنا نہیں، صرف روزہ رکھنا نہیں، کاروبار بھی کرے، تجارت بھی کرے، ملازمت بھی کرے، پڑھے لکھے بھی، پڑھائے بھی اور زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ذمہ داری نبھا کر ثابت کرے کہ اسلام خوبصورت طرزِ عمل کا نام ہے۔جو کام کافر بھی کرتا ہے وہ کام انعان کر سکتا ہے۔جو انسان کر ہی نہیں سکتا وہ کافر بھی نہیں کر سکتا۔تو اس کے کرنے کا اگر کوئی کافرانہ انداز ہے تو اس کا مومنانہ انداز بھی ہونا چاہیے۔یہ تو ممکن نہیں کہ ایک کام صرف کافر ہی کے کرنے کا ہے۔مشین کافر بھی بنا سکتا ہے، جہاز کافر بھی اڑا سکتا ہے، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ انسان جو کام کر سکتا ہے، اسے کافرانہ انداز میں اگر کر سکتا ہے تو مومنانہ انداز میں، اس کے اچھے طریقے کے انداز میں، اس سے آسانی سے کیا جانا چاہیے۔اس لیے مسلمانوں پر اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ ذمہ داری ہے کہ دین بھی سیکھیں اور دنیوی علوم بھی سیکھیں۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کو جن کے پاس فدیہ کے پیسے نہیں تھے، حکم دیا تھا کہ مدینہ کے دس دس بچوں کو پڑھا دو، تمہارا یہی فدیہ ہے۔بدر سے جو قید ہو کر آئے تھے انہوں نے مدینہ کے بچوں کو دین تو نہیں پڑھانا تھا۔دنیوی علوم جو بحیثیت کافر وہ جانتے تھے، وہ پڑھائے۔گویا کافر سے بھی دنیوی علوم کی مہارت حاصل کرنے کی اسلام اجازت دیتا ہے۔یہ دنیوی علوم بھی مسلمان کو سیکھنے چاہیے۔

ان آیات کی تفسیر اسرار التنزیل اور اکرم التفاسیر سے بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

سبق نمبر ۱۱: سورۃ النساء

آیت نمبر: ۱۳

سورۃ النساء آیت نمبر ۱۳

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ

یہ اللہ کی حدیں ہیں اور جو اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرے گا وہ (اللہ) اس کو بہشتوں

جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ

میں داخل کریں گے جن کے تابع نہریں جاری ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے

وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾

اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

اللہ جل شانہٗ نے انسانیت کے لیے جو ادیان نازل فرمائے، تو ان میں بنیادی طور پر انسانوں ہی کو بہتری مقصود اور مطلوب تھی۔ لہٰذا ہر دین میں، جس قوم کی طرف وہ دین نازل کیا گیا، اس قوم کی ضروریات کے حل کا سب سے بہترین اور مفید جو طریقہ تھا، وہ انہیں بتایا گیا۔ اور اس میں پھر دو فائدے رکھ دیے۔ ایک فائدہ یہ کہ ان کے مسائل کا انہیں بنا بنایا حل مل گیا جو صحیح ترین تھا۔ دوسرا یہ کہ وہی عمل اللہ کی رضا کا سبب بن گیا اسی کو عبادت بھی قرار دے دیا گیا۔ دین اسلام میں اور پہلے نازل ہونے والے ادیان میں بہت بڑا فرق یہ ہے کہ پہلے نازل ہونے والے دین مختلف اقوام یا مختلف علاقوں میں ان کے وقت، ماحول، ان کی استعداد، ان کی ضروریات کے مطابق تھے۔ لیکن جوں جوں انسانیت جوان ہوتی گئی یا اس کا شعور پختہ ہوتا گیا اس انسانی علوم ترقی کرتے گئے تو ظہورِ اسلام پوری انسانیت کے لیے ہوا۔ اور نظامِ قدرت بڑا خوبصورت ہے، ضرورت کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اس کی تکمیل کے ذرائع نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ انسانوں میں یہ تعلق اور یہ رابطہ کہ پوری دنیا ایک کنبہ بن جائے، یہ ظہورِ اسلام سے ڈیڑھ ہزار برس بعد ہوا۔ آج ایسا حال ہے، ایسا (Communication System) ہے، آج ایسے ذرائع مواصلات ہیں، آج ایسے ذرائع آمد و رفت ہیں، ذرائع نقل و حمل ہیں کہ پوری دنیا ایک کنبہ یا ایک خاندان یا ایک گھر نظر آتی ہے۔ اب میچ ہوتا ہے، دنیا کے ایک سرے پر، دیکھ پوری دنیا رہی ہوتی ہے۔ بات ہوتی ہے ایک سرے پر، دوسرے سرے پر سن رہے ہوتے ہیں۔ واقعہ دنیا کے کسی حصے میں ہوتا ہے، لمحوں میں ساری دنیا میں خبر پھیل

جاتی ہے۔تو اسلام نے ان ایجادات کے آنے سے پہلے وہ عالمی اوروہ انسانی طرز حیات عطا کر دیا جو ساری انسانیت کے لیے، سارے موسموں، سارے زمانوں اور علاقوں میں قابل قبول ہے، اور اس میں کسی بات کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ایک معاملہ تھا کہ آدمی جو کما تا جو جائیداد بنا تا جو اس کی زمین ہوتی مکان ہوتے دولت ہوتی، اس کی وفات پر بڑا تماشا بنتا۔ ہر قوم نے اپنا ایک لائحۂ عمل بنا رکھا تھا حتیٰ کہ جاہلیت میں تو مرنے والے کی بیویاں بھی اس کی اولاد آپس میں بانٹ لیا کرتی تھی۔ایک کی ماں دوسرا بیوی بنالیتا، دوسرے کی ماں پہلا بیوی بنالیتا۔آپس میں ماں بدل کر وراثت میں لے لیتے تھے۔پھر تہذیب جدید میں انگریز نے آگے قدم بڑھایا اور اس نے اس میں ایک نیا اضافہ کیا تو مرنے والے کا سارا جو اثاثہ ہے اس کے بڑے بیٹے کو دے دیا جائے اور باقی سارے اپنا کمائیں کھائیں۔اسلام نے انسانی رشتوں کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔انسان تخلیقی طور پر مدنی الطبع یعنی آبادیوں میں مل جل کر رہنے والا ہے۔کوئی انسان اکیلا جی نہیں سکتا۔اس کی ضرورتیں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں کہ کوئی پڑھنے کا محتاج ہے، کسی کو پڑھانے کی ضرورت ہے۔کوئی دوکانداری کرتا ہے تو دوسرا گاہک بنا ہوتا ہے۔کسی کو مزدور چاہئیں اور کسی کو مزدوری چاہیے۔کسی کے پاس موٹر ہے اس کے پاس ڈرائیور نہیں، کوئی ڈرائیونگ جانتا ہے اس کے پاس موٹر نہیں۔تو اس طرح سے انسانی ضرورتوں کی تقسیم سے مل جل کر ایک معاشرہ بنتا ہے۔

اب جو انسانی معاشرہ بنتا ہے، اس میں اگر رشتوں کی حدود نہ رکھی جائیں تو انسان میں اور جانوروں کے گلے میں کیا فرق رہ جائے گا، جانوروں کے ایک ریوڑ میں جو جانور تگڑا ہوتا ہے، وہ چر لیتا ہے۔اس میں کسی کے کوئی حقوق کی تعین نہیں یا ان کا جنسی جذبہ ہے تو جو جس سے ملتا ہے پورا کر لیتا ہے۔اس میں کوئی حدود و قیود نہیں۔لہٰذا ان میں کوئی رشتے نہیں۔انسانی تعلقات کو شریعتِ مطہرہ نے ایک خوبصورت طریقے سے جوڑا اور اس جوڑ سے جو رشتے بنتے ہیں، ان کو اتنا مضبوط کر دیا کہ جتنا جتنا جس کا رشتہ قریب تر ہے، اتنا اتنا وہ مرنے والے کی جائیداد کا بھی وارث قرار پایا، بیوی ہے، اس کی بھی وراثت ہے۔بیٹی ہے، وہ بھی وارث ہے۔بیٹا ہے، وہ بھی وارث ہے۔بھائی ہے، وہ بھی وارث ہے۔یا کسی کی اولاد نہیں ہوتی، دور کے رشتہ دار جو ہیں وہ وارث ہیں۔یہ ایک خوبصورت طریقے سے مرنے والے کی جائیداد کو اسلام نے اس نسبت سے تقسیم کر دیا جتنی اہمیت یا جتنی Strength یا جتنی طاقت ان رشتوں میں تھی، جو زیادہ قریب تھا، اس کو زیادہ حصہ دیا۔جو اس کے بعد تھا اس کو اس کے بعد کا دیا۔جو اس کے بعد تھا اس کو اس کے بعد کا دیا اور یہ سارے حصے بیان کرنے کے بعد ایک اصولی بات جو ارشاد فرمائی گئی وہ یہ تھی کہ اس کے دنیوی فوائد بے شمار ہیں۔دوسری اقوام میں وراثت کی تقسیم سے جو خرابیاں آ گئی ہیں وہ اس میں نہیں آئیں گی لیکن اس سے بھی بالاتر ایک بات ہے، اس سے بہت اونچی بھی ایک بات ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ صرف تمہارے دنیوی مسائل کا حل نہیں ہے، تلک حدود اللہ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود ہیں۔یعنی ان احکام کا یہ پہلو بہت قیمتی ہے کہ باپ کی وفات کے بعد بیٹے نے وراثت پائی، بہن کو اس کی وراثت تقسیم کر کے دے دی، بیٹے کا اپنا جو حق تھا وہ پورا ہوا، جو اس

کی بہن تھی یا اس کی عزیز تھی یا اس کی والدہ تھی، ان کا جو حق تھا انہیں دے کر دنیا میں اسے یہ سکون نصیب ہوا کہ اب کوئی مجھ پر انگلی بھی نہیں اٹھائے گا اور کسی کو میرے ساتھ دشمنی بھی پیدا نہیں ہوگی کہ سارا تو یہ لے گیا اور ہم خالی رہ گئے بلکہ ہر ایک اپنی جگہ پر مطمئن ہو جائے گا کہ اس کو اس کا حصہ مل گیا تو دنیوی اعتبار سے ایک اطمینان بھی نصیب ہوا اور ہر ایک کو کچھ نہ کچھ حصہ اس کی حیثیت کے مطابق مل گیا، یہ تو تھا دنیوی فائدہ۔ اگر ایک آدمی جیسے انگریز جس کا بڑا بیٹا وارث ہوتا ہے، لیکن چھوٹے جب ہوش سنبھالتے ہیں تب سے وہ اس کے پیچھے لگے ہوتے ہیں کہ اگر مر جائے گا تو ہمیں مل جائے گی۔ یعنی بڑا اگر وراثت لے لیتا ہے، تب بھی ساری زندگی ان کی دشمنی چلتی ہے کہ اس نے تو ساری لے لی اور ہم خالی رہ گئے۔ اس سے کسی طرح سے چھینی جائے یا اسے قتل کیا جائے یا کم از کم کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں تو ان میں دوستی کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے سے محبت نہیں رہتی، نفرت ہو جاتی ہے۔ تو ان سب خرابیوں سے بچنے کے علاوہ بہت بڑا کمال یہ ہے کہ دنیوی فائدہ اور سکون بھی حاصل کیا اور اسی میں اللہ کی اطاعت بھی آ گئی۔ تو اصل فائدہ یہ ہوا کہ اس قانونِ وراثت پر عمل کر کے اور دوسرے اسلامی احکام پر عمل کر کے زندگی کی جو آسانی یا نیک نامی یا سکون یا ذہنی تسلی یا قلبی اطمینان نصیب ہوا وہ اپنی جگہ، بہت قیمتی ہے اور اتنا بڑا سوال ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی معاشرہ بھی ہزاروں تدبیروں کے باوجود اس سوال کو تسلی بخش طریقے سے حل نہیں کر سکا، وہ معاشرہ خواہ جمہوریت پر استوار کیا گیا یا اس کا نام سوشلزم رکھا گیا۔ وہ افریقہ میں ہے یا امریکہ میں ہے۔ وہ مشرق میں ہے یا مغرب میں۔ جاپان میں رائج ہے یا آسٹریلیا میں۔ آپ باقی تمام قوانین کو اگر بنظرِ غور دیکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ مرنے والے کے جو ورثاء ہیں، ان کے اطمینان کا یا اس تقسیم کے بعد ان میں دوستی کا رشتہ نہیں رہتا۔ اسلام نے جو تقسیم کی ہے، اس میں یہ حسن سمو دیا ہے کہ ہر کوئی لینے کے بعد مطالبہ کرتے ہوئے شرماتا ہے کہ اس سے زیادہ مانگیں کہ اسے اتنا حصہ دے دیا ہے جتنا اس کا تعلق بنتا تھا۔ وہ زیادہ مانگے تو اسے خود اپنا ضمیر ملامت کرتا ہے کہ میں اپنا حصہ لے چکا ہوں دوسرے کو اگر زیادہ ملا ہے تو اس کا حق بھی زیادہ بنتا ہے۔ یہ جو اس کے سوال کا جواب مل گیا، بہت بڑی کامیابی تھی اور بہت بڑا ایک مسئلہ حل ہو گیا۔ لیکن اس کے علاوہ فرمایا اصل اس کا کمال جو ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کے احکام میں یہ حُسن سمو دیا گیا ہے کہ ان پر عمل کرنے سے اللہ کی رضامندی نصیب ہوتی ہے، قربِ الٰہی نصیب ہوتا ہے۔

اس دور میں ہمارا طریقہ کار یہ ہو گیا ہے کہ اسلامی احکام پر عمل کرنے کی بجائے ہم نے اس کی رضامندی کا یہ مطلب لے لیا ہے کہ ہماری خواہشات پوری ہوتی رہیں تو یہ اللہ کی رضامندی کی دلیل ہے۔ کسی کو زیادہ پیسہ ملتا رہے خواہ وہ ڈاکے سے ملا ہو یا رشوت سے، ہم کہتے ہیں اس پر اللہ بڑا راضی ہے۔ اس کی کوٹھی، اس کا محل اس کی گاڑی ہے اس لیے اس کو اللہ کی رضامندی حاصل ہے۔ کسی کی اولاد ہے، جائیداد ہے، زمینیں ہیں، کسی کو عہدہ مل گیا یا حکومت مل گئی، اقتدار مل گیا، تو دنیوی جو خواہشات بندے کی ہیں، جب وہ پوری ہوتی ہیں تو ہم سمجھتے ہیں اس پر اللہ راضی ہے۔ یہ اللہ کی رضامندی کی دلیل

نہیں ہے۔ یہ اس کے نظامِ کائنات کا ایک حصہ ہے۔ بعض لوگوں کے لیے اس میں زیادہ رزق مقرر کر دیا اور یہی ان کی آزمائش ہے کہ اقتدار یا اختیار یا زیادہ دولت پا کر اللہ کی اطاعت کرتے ہیں یا نافرمانی کرتے ہیں، شکر کرتے ہیں یا کفر کرتے ہیں۔ بعض کو اس نے کمزور بنا دیا کم طاقت دے دی، کم روزی دے دی، اقتدار نہیں دیا ان کے لئے یہی آزمائش ہے کہ اس میں شکر ادا کرتے ہیں یا اس میں نافرمانی کرتے ہیں یا اس میں ان کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ دنیوی زندگی میں جو نعمتیں اللہ کی طرف سے ملتی ہیں، ان کے ردعمل میں انسان شکر ادا کرتا ہے یا کفر کرتا ہے، نافرمانی کرتا ہے یا فرمانبرداری کرتا ہے۔ یہ صرف اس لیے ہے۔ جہاں تک اللہ کریم کی رضامندی کا تعلق ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ جب اللہ کسی سے راضی ہوتے ہیں تو اسے اپنی اطاعت کی توفیق ارزاں کرتے چلے جاتے ہیں، اگر کوئی زیادہ اللہ کی اطاعت کرنے لگ گیا، یہ قطعی دلیل ہے کہ اللہ اس سے راضی ہو گیا، اسی کو ثواب کہتے ہیں۔ یہ جو ہم نے ایک تصور بنا لیا ہے کہ رشوت ملی، وہ لے لی، حرام ملا، وہ کھا لیا، موقع آیا، جھوٹ بول لیا اور تسبیحات پڑھ لیں حج کر آئے اور سمجھا بڑا ثواب ہے۔ حج کیا ثواب ہے؟ تسبیحات پڑھیں ثواب ہے؟ ثواب آخر ہوتا کیا ہے؟ کیا ثواب کوئی نقدی ہے جو کسی کو ملے گی، ثواب کوئی کھانے کی چیز ہے جو کسی کو ملے گی؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشادِ عالی ہے۔ بخاری شریف میں موجود ہے، صحاح ستہ میں موجود ہے کہ جب بدر کی فتح کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ بدر آج کے بعد جو جی چاہے کریں، جنت ان پر واجب ہو گئی۔ اب یہ اس فرمان میں تو کوئی قید ہی نہیں ہے کہ وہ نیکی کریں یا گناہ کریں۔ معاذ اللہ بلکہ اس میں تو یہ بھی قید نہیں ہے کہ وہ ایمان پر قائم رہتے ہیں یا نہیں رہتے تو جنت ان پر کیسے واجب ہو گئی، اس پر جب شارحینِ حدیث کلام کرتے ہیں تو وہ فرماتے ہیں کہ بدر میں شراکت سے جو اللہ کی رضامندی نصیب ہوئی اور جو ثواب اور اجر ملا، اس کا نتیجہ یہ ہوا، آئندہ جو جی چاہیں کریں سے مراد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ چاہیں گے وہی، جس میں اللہ کی رضا ہو گی۔ یعنی یہ آزادی دینے کا مطلب یہ نہیں کہ معاذ اللہ وہ گناہ کریں گے اور جنت جائیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کا مفہوم یہ ہے کہ ان کا جو جی چاہے۔ یعنی ان کا جی چاہے گا وہی جو اللہ چاہتا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے بعد اگر کوئی مسئلہ ہو اور ساری امت ایک طرف ہو جائے اور اہل بدر میں سے ایک بندہ زندہ ہو اس کی رائے دوسری طرف ہو تو عمل اس کی رائے پر کیا جائے گا۔ اس لیے کہ اس کی رائے میں رضائے باری موجود ہے۔ یعنی وہ وہی چاہیں گے جو اللہ چاہتا ہے۔ تو اللہ کے بنائے ہوئے قوانین یا احکام وہ نماز کے ہوں یا روزے کے ہوں یا وہ جائیداد کی تقسیم کے ہوں یا میراث کے ہوں، چوری اور ڈاکے کی سزا کے ہوں یا حدود شرعی کے جاری کرنے کے ہوں۔ کسی بھی شریعت کے حکم پر عمل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عمل کرنے والے کو اللہ کی رضامندی نصیب ہو رہی ہو۔

"تلک حدود اللہ" یہ اللہ کی معین کی ہوئی حدیں ہیں اور یاد رکھو **وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ**

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ. جس نے اللہ کی اطاعت کی اور اس کی اطاعت کیا ہے؟ **من یطع اللّٰہ ورسولہ** کسی کے پاس اللہ کی اطاعت کی کوئی سند نہیں سوائے اس کے کہ وہ کہہ دے کہ مجھے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ اللہ کی اطاعت یہ کام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی دوسرا یہ منصب نہیں رکھتا کہ وہ یہ کہہ دے کہ یہ کام کرنا ثواب ہے۔ یہ منصب ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ چھوٹی چھوٹی بات پر دو گواہوں کی ضرورت ہے لیکن ساری کائنات کو اللہ کی رضا نصیب ہوتی ہے صرف ایک ہستی کی شہادت پر۔ کوئی دوسرا وہاں سننے والا نہیں ہے کہ یہی وحی نازل ہوئی تھی، میں نے سنی۔ کوئی دوسرا یہ کہنے کی جرات نہیں کر سکتا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی کہا گیا ہے اور میں بھی اس کا گواہ ہوں۔ بلکہ اللہ کریم فرماتا ہے۔ **وَکَفٰی بِاللّٰہِ شَھِیْدًا** (سورۃ الفتح آیت نمبر 28) ان کی صداقت کا گواہ میں خود ہی کافی ہوں کسی گواہی کی ضرورت نہیں، میرا نبی علیہ السلام اصدق الصادقین ہے۔ **مَایَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی** (سورۃ النجم آیت نمبر 4-3) اپنی خواہش اپنی پسند سے کبھی اپنی زبان نہیں ہلاتا اپنے نطق کو اپنی قوت گویائی کو حرکت میں نہیں لاتا۔ **ماینطق**، قوتِ گویائی کو استعمال ہی نہیں فرماتا **ان ھو الا وحی یوحی** وہی بات کہتا ہے جو میں کہلوانا چاہتا ہوں۔

تو اللہ کی اطاعت کیا ہوگی؟ اطاعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایک بات ضمناً عرض کرتا چلوں کہ دوستوں کو بہت شکوہ ہوتا ہے کہ فلاں وظیفہ سنت میں موجود تھا اور ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق اتنی تسبیحات پڑھیں اور اس کا نتیجہ تو کچھ نہیں نکلا۔ ایسا ہوتا ہے، حدیث صحیح ہے اور اس میں موجود ہے کہ یہ تسبیح اتنی دفعہ پڑھی جائے اس کی یہ برکت ہوتی ہے۔ ہم پڑھتے ہیں اور کچھ نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ آپ نے نرا وظیفہ تو لے لیا لیکن وہ اطاعت جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کرتے تھے اور وہ کیفیاتِ قلبی جو قلب اطہر صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حاصل کر کے مقامِ صحابیت حاصل کیا، وہ حاصل کرنا تو آپ بھول گئے۔ آپ کہتے ہیں یہ گولی فائر ہی نہیں ہوتی، آپ کے پاس تو بندوق ہی نہیں ہے، گولیاں لے کر پھرتے ہیں تو کب فائر ہوں گی۔ آپ نے وظیفہ لے لیا لیکن وظیفہ پڑھنے کا حکم کن لوگوں کو دیا گیا؟ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو۔ جس کسی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا وہ صحابیؓ ہوگا۔ صحابیؓ کا حال یہ تھا کہ:

ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُھُمْ وَ قُلُوْبُھُمْ اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ (سورۃ الزمر آیت نمبر 23) کھال سے لے کر نہاں خانہ دل تک ان کے وجود کا ہر ذرہ ذاکر تھا اور ان کی اپنی کوئی پسند نہ تھی۔ جو اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیتا، اسے دل و جان سے قبول کرتے تھے۔ آپ بھی اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ معیار اپنایئے اور ذکر الٰہی کے اس درجے کو پایئے۔ پھر وظیفہ پڑھیے۔ دیکھیں پھر اس پر اثر مرتب ہوتا ہے یا نہیں۔ چلو اتنا نہ ہوگا، ان کی شان الگ سہی، ہم کمزور سہی، ہماری کیفیات کم سہی لیکن خالی تو نہ جائے گا، اگر ایک ولایتی رائفل میں ہم ولایتی کارتوس فائر کرتے ہیں، صحیح نشانہ لگتا ہے۔ دیسی ہوگی اس میں کارتوس دیسی نقلی ہوگا، دھماکہ تو کر ہی گزرے گا۔ ہمارا تو فائر ہی خالی جاتا ہے۔ اس کا کوئی نتیجہ نہیں ہوتا۔ کیوں نہیں ہوتا؟ اس

لیے کہ ہم نے آخری وہ نتیجہ لے لیا، بلٹ (bullet) کی بات ہم نے یاد رکھی اور گن (gun) لینا ہم بھول گئے۔ ہمارے پاس ہتھیار (Weapon) نہیں ہے۔ ہمارا وجود ذکر سے خالی ہے۔ ہمارا دل کیفیت سے خالی ہے۔ اور ہمارے اعضاء و جوارح اطاعت سے محروم ہیں۔ اب ایک آدمی فرائض ادا نہیں کرتا، حلال، حرام کی تمیز نہیں کرتا، سچ اور جھوٹ کی تمیز نہیں کرتا، تسبیحات پڑھنے سے کیا ہوگا۔

تو یاد رکھیے کہ اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی اطاعتِ باری تعالیٰ ہے اور اطاعت کا پھل ہے ثواب۔ ثواب اسی چیز کو کہتے ہیں کہ اللہ کی اطاعت کرنے کی توفیق ارزاں ہو جائے۔ جو شے بیج ہوتی ہے، آخر وہی حاصل ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا نظامِ کائنات کو۔ آپ آم کا بیج بوئیں، اس پر درخت لگے گا اس پر بُور آئے گا، اس پر پھل لگے گا، اس پر آم لگیں گے، آخر حاصل کیا ہوا؟ آم کا بیج۔ آپ غلہ بوتے ہیں، گندم کا بیج بوتے ہیں وہ سبزہ بنتا ہے، چارہ بنتا ہے، اک بھوسا بنتا ہے، نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہی دانے جو آپ نے بوئے تھے۔ اللہ کی اطاعت کی جائے تو اس سے کان بڑے نہیں ہو جاتے، اس سے قد نہیں بڑھ جاتا، اس سے رنگ نہیں بدل جاتا۔ بھوک افلاس یا صحت و بیماری کا اس سے تعلق نہیں ہے۔ یہ ضمنی چیزیں ہیں۔ یہ الگ ایک نظام ہے جو اپنی جگہ چل رہا ہے۔ اطاعت کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ مزید اطاعت کی توفیق ہو جاتی ہے۔ یہ عبادت کی اور توبہ کی قبولیت کی بہت بڑی سند ہے کہ میں نے عبادت کی، مجھ پر مزید عبادت کرنے کی توفیق ارزاں کر دی گئی۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ وہ نیکی قبول ہوگئی اور اگر توفیقِ عبادت نہیں ملتی تو پھر وقت ضائع ہو رہا ہے۔

ہم جنت لیے بیٹھے ہیں کہ ہمیں جنت مل گئی۔ کیا کرو گے جنت کو؟ جنت بجائے خود مقصودی چیز نہیں ہے، جنت رہائش گاہ ہے ان لوگوں کی جنہیں یہ سٹیٹس (Status) یہ درجہ دیا جائے گا کہ اللہ ان سے راضی ہے۔ جیسے آپ اسلام آباد کا پرائم منسٹر ہاؤس لینا چاہتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ میں شور کروں گا، میں پیسے لگاؤں گا، مجھے مل جائے گا۔ نہیں! آپ کو اس پر پیسے لگانے کی، اس کے لئے شور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کوشش کریں کہ آپ اس ملک کے وزیر اعظم بنیں، وہ خود آپ کو مل جائے گا۔ یہ جو کہہ دیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو جنت ملے گی، یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ اللہ ان پر راضی ہو جائے گا۔ یعنی یہ اس سٹیٹس کو پالیں گے جن لوگوں کے لیے جنت رہائش گاہ کے طور پر بنائی گئی ہے۔ تو ہم نے جو سٹیٹس مقصود تھا، جو درجہ مقصود تھا، جو حال مقصود تھا، اسے چھوڑ دیا اور صرف جنت کو لے کر بیٹھ گئے۔ یعنی ایک آدمی گورنر نہیں بنتا اور گورنر ہاؤس پر امید لگائے بیٹھا ہے، دعا مانگتا ہے یہ مجھے دے دے۔ پیسے خرچ کرتا ہے، میں اس میں رہنا چاہتا ہوں، شور کرتا ہے۔ یہ تو کوئی طریقہ نہیں ہے۔ اس کا طریقہ تو ایک ہی ہے کہ وہ شخص صوبے کا گورنر بن جائے، گورنر ہاؤس کے دروازے اس کے لیے کھلے ہوں گے۔ یہی بات اس آیہ کریمہ میں مقصود ہے کہ تم اللہ کی حدود کی پاسبانی کا حق ادا کرو، جنت تمہیں کھلی ہوئی ملے گی۔ وہ تمہارا حق بن جائے گا، تمہیں وہ درجہ نصیب ہو جائے گا، وہ سٹیٹس نصیب ہو جائے گا۔ اور جنت کی قیمت صرف یہ ہے کہ وہ اللہ

کی رضامندی کا سرٹیفکیٹ ہے۔ سند ہے، مظہر ہے۔ اس لیے اسے مانگنے کا حکم قرآن میں بھی ہے، حدیث میں بھی ہے۔ اور اس سے مراد اللہ کی رضامندی کو پانا ہے۔

اور فرمایا یہ سدا بہار باغات جو ہیں انہیں پانا صرف رہائش گاہ کا پانا نہیں ہے **ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ** یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس میں قرب رسالت ملتا ہے، اس میں قرب الٰہی ملتا ہے۔ اہل جنت وہ لوگ ہوں گے جو بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو سکیں گے۔ وہ لوگ ہوں گے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے پاس جا کر بیٹھ سکیں گے، وہ لوگ ہوں گے جو اہل اللہ کی محافل میں جائیں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں اللہ کا ذاتی دیدار نصیب ہوگا۔ **ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ** یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ یعنی آپ صرف مکانوں کو یا یہ نہ دیکھیں کہ اتنے پھل ہوں گے اور موج کریں گے، یہ ضمنی سی بات ہے۔ اصل موج اس میں یہ ہے کہ اس کے رہنے والوں کو اہل اللہ سے لے کر خود اللہ تک اپنی اپنی حیثیت کے مطابق دیدار کرنے کی توفیق بھی ہوگی، کلام کرنے کی توفیق بھی ہوگی، روبرو بیٹھنے کی فرصت بھی نصیب ہوگی۔ **ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ** یہ نری رہائش گاہ نہیں ہے، یہاں پہنچنے والے کو بہت بڑی کامیابی نصیب ہو جائے گی۔

تفصیل کے لیے ان آیات کی تفسیر کا مطالعہ اسرار التنزیل اور اکرم التفاسیر سے کیا جا سکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

سبق نمبر۱۲: سورۃ آل عمران

آیت نمبر:۱۰۲

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور سوائے

تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿١٠٢﴾

اسلام کے کسی حالت میں تمہیں موت نہ آئے۔

چوتھے پارے کا دوسرا رکوع شروع ہوتا ہے۔

قرآن حکیم نے انسانیت کو تین طرح سے خطاب فرمایا ہے یا تو ساری انسانیت کو **يَاأَيُّهَا النَّاسُ** اے اولاد آدم اے انسانو! یا پھر قرآن کی نگاہ میں انسانوں کی صرف دو جماعتیں دو قومیں اور دو طبقے ہیں۔ایک وہ جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جو اس سے انکار کرتے ہیں۔مومن اور کافر۔دنیا میں صرف دو قومیں ہیں ایمان کا رشتہ اتنا مضبوط ہے کہ قرآن حکیم نے مومن کو مومن کا بھائی کہا ہے۔یعنی سب سے مضبوط رشتہ یہ ہے کہ کوئی ایک باپ کے صلب سے،ایک ماں کی گود میں پرورش پانے والا،جس طرح وہ دونوں ایک وجود کے دو حصے ہوتے ہیں یا ایک شے کے دو نام ہوتے ہیں،اسی طرح ہر مومن دوسرے مومن کا اتنا ہی قریبی رشتہ دار ہے۔نسبی تعلق یا باپ کے صلب کا رشتہ یا ماں کے شکم کا رشتہ یا ماں کی گود کا تعلق،یہ رشتے دنیوی ہیں۔اسبابِ دنیا اس میں کارفرما ہیں اور دنیوی زندگی کا خاتمہ ان رشتوں کی طاقت کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ایمان کا رشتہ اللہ کے نام پر ہے۔وہ تعلق بہت مضبوط ہے۔مومن کا مومن سے رشتہ موت تو کیا قیامت کا عظیم حادثہ بھی ختم نہیں کرتا۔میدان حشر میں،آخرت کی پریشانی میں،سخت مشکل وقت میں بھی مومن مومن کے کام آئے گا۔مومن مومن کی شفاعت کرے گا۔مومن مومن کی خبر لے گا۔یہ صرف دنیوی رشتے ہیں جو قیامت کے زلزلے کی نذر ہو جائیں گے اور باپ بیٹے کا یا بیٹا باپ کا یا بھائی بھائی کا واقف نہیں بنے گا۔

لیکن ایمان چیز کیا ہے؟ کیا ایمان صرف ایک دعویٰ ہے؟ ایمان کیا کہہ دینے کا نام ہے؟ ایمان کیا کسی خاص رنگ یا محض شکل وصورت کا نام ہے؟ نہیں! فرمایا۔**اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ** تقویٰ کا ترجمہ ہمارے ہاں اردو میں ڈر کیا جاتا ہے اور ڈر بھی پھر مختلف طرح کا اور مختلف اقسام پر تقسیم ہو جاتا ہے۔مثلاً ہم کسی کی ایذا سے بھی ڈرتے ہیں۔کسی سے ہماری کچھ امیدیں وابستہ

ہوتی ہیں کچھ اس کے روٹھ جانے سے بھی ڈرتے ہیں کہ یہ ناراض ہو جائے گا، نوکری سے نکال دے گا۔ ہم سانپ اژدھے سے، موذی جانور سے، درندے سے ڈرتے ہیں۔ وہ ڈر ایک الگ قسم کا ہے۔ کہا اسے بھی ڈر ہی جاتا ہے۔ ہم ڈاکو سے قاتل سے ڈرتے ہیں لیکن وہ ڈر پھر بالکل الگ قسم کا ہے۔ تقویٰ کا معنی کونسا ڈر ہے؟ انسانی زندگی میں ایک کیفیت ہوتی ہے جسے آپ رشتہ یا تعلق یا محبت کہتے ہیں۔ تو ایک رشتہ یا ایک تعلق جسے آپ محبت کا نام دیتے ہیں اس کی بنیاد خواہ کوئی بھی ہو، محبت کی پھر آگے قسمیں ہیں۔ محبت اوصاف سے ہوتی ہے۔ مثلاً ہمیں کسی حاکم سے اس لیے محبت ہے کہ اس کے پاس اقتدار ہے۔ جب اس کے پاس اقتدار نہیں رہتا تو وہ چونکہ اس وصف کے ساتھ محبت تھی وہ رشتہ کمزور ہو جاتا ہے۔ ہمیں کسی سے اس لیے محبت ہے، کہ وہ بہت اچھے شعر کہتا ہے لیکن اگر اسے شعر کہنا بھول جائے یا اس کا بات کرنا مشکل ہو جائے تو اس محبت میں وہ شدت نہیں رہتی۔

اللہ جل شانہٗ سے بھی محبت کے یہ رشتے ہیں۔ اور اللہ نے اس کی دعوت بھی دی ہے کہ کم از کم بندہ یہ تو سوچے کہ اسے بے شمار نعمتیں کس نے دی ہیں اور مسلسل کون دے رہا ہے۔ تو عقلاً بھی شعوری طور پر بھی اپنے منافع کے لیے بھی نقصان سے بچنے کے لیے بھی اسے اللہ سے محبت کرنی چاہیے۔ لیکن جب اللہ سے تعلق قائم کیا جاتا ہے۔ جب کسی کا دل کا رشتہ اللہ سے جڑتا ہے تو جو حقیقی محبت نصیب ہوتی ہے۔ وہ اوصاف و کمالات کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ ذات کی محبت ذات سے ہوتی ہے جس کی بہت کم مثالیں یا بہت کم واقعات ہم انسانی معاشرے میں سنتے ہیں۔ بعض اوقات دیکھتے ہیں تو کسی کو کسی کی ذات سے ایک تعلق ہوتا ہے۔ تو وہ امیر ہو تو بھی اس کا تعلق اتنا ہی مضبوط رہتا ہے، وہ فقیر ہو جائے تو بھی اس سے اس کا تعلق ویسا ہی رہتا ہے۔ اس کے پاس کوئی صفت ہو تو بھی اس کے ساتھ رشتہ محبت کا ویسا ہی رہتا ہے، اگر ان اوصاف سے وہ محروم بھی ہو جائے تو بھی وہ اور وہ زیادہ عزیز ہو جاتا ہے۔ اور آدمی اس کی اور زیادہ نگہداشت کرتا ہے۔ یہ جو محبت ذات کو ذات سے ہوتی ہے، اس کے ٹوٹنے کا اندیشہ پیدا ہو جائے کہ میں اگر یہ بات کہوں گا، میں اگر یہ کام کروں گا تو میرے اس رشتے پر حرف آئے گا، اس میں شکن آ جائے گی، اس میں دراڑ آ جائے گی یا اس شیشے میں بال آ جائے گا۔ یہ ڈر جو ہے اس ڈر کو تقویٰ کہا جاتا ہے۔ اگر یہ تعلق اللہ کریم سے ہو، اللہ سے بندے کا ہو اس رشتے کو کوئی نام دینا خود بندے کے بس میں بھی نہیں جسے نہ وہ محبت کہہ سکتا ہے، نہ عشق کہہ سکتا ہے، نہ پیار کہہ سکتا ہے، نہ کسی خوبی اور کسی کمال پر قربان ہونے کا نام دے سکتا ہے۔ بلکہ ایک ایسی زنجیر جو نظر نہیں آتی، ایک ایسی زنجیر جو محسوس نہیں ہوتی، ایک ایسا حلقہ جس کا کوئی وجود بظاہر نہیں ہے، اس کے پورے باطن کو جکڑ کر اللہ کی ذات کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے۔ اگر کہیں اس پر حرف آنے کا، اس پر چوٹ پڑنے کا، یا اس کے محبوب کے خفا ہونے کا اندیشہ پیدا ہو جائے، جس کے بغیر انسان اپنی ذات اپنے وجود اپنی حیات کا تصور کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اگر یہ اندیشہ پیدا ہو جائے تو اس ڈر کو تقویٰ کہا جائے گا۔

تو اللہ کریم فرماتے ہیں کہ اے ایمان دارو! اللہ کے ساتھ ایمان رکھنے والے لوگو! اللہ سے محبت کرو۔ چلو لفظی ترجمہ

اللہ سے ڈر وہی ہوگا لیکن جو میری سمجھ میں آیا ہے یہ ہے کہ اپنے آپ کو طلب الٰہی کا اسیر بنا دو، اپنے آپ کو محبت الٰہی میں غرق کر دو۔ اور ایسے ڈوبو، ایسی محبت کرو، ایسا تعلق قائم کرو جو اللہ کی شان کے مطابق ہو، جو اسے زیب دیتا ہو، ایسا رشتہ ہو۔ **حَقَّ تُقٰتِهٖ** جو اس کا حق بنتا ہے۔ ایسی محبت اللہ سے نہ کرو کہ دولت مل جائے گی تو ہم اللہ کی عبادت کریں گے۔ نہیں ملتی تو نہیں ہو سکتی۔ صحت ہوگی تو اللہ کو یاد کرلیں گے۔ نہیں ہوتی تو نہ سہی۔ کسی کے ساتھ بات کرنے کی ضرورت پڑ گئی تو اس کی بات کو اولیت دے دی اور اللہ کی عبادت چھوٹ گئی تو خیر ہے، یہ پھر کرلیں گے۔ دکان پر بیٹھے ہیں، چار گاہک آ گئے سودا پہلے بیچو، نماز چھوٹتی ہے تو چھوٹ جانے دو۔ یہ نہیں! ثانوی حیثیت اللہ کے رشتے کو مت دو۔ فرصت ہوگی تو اللہ کو یاد کریں گے۔ طبیعت ٹھیک ہوگی تو اللہ کا نام لیں گے۔ موقع ملے گا تو کریں گے۔ نہیں! اللہ سے رشتہ ایسا رکھو جو اللہ کی شان کے لائق ہو **حَقَّ تُقٰتِهٖ** اور اس کی شان کے لائق کیا ہے؟ وہ رشتہ کیسا ہونا چاہیے؟

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ اگر موت بھی آ جائے، اگر جان بھی ہارنی پڑے تو ہار دو لیکن اللہ کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ رشتے کا مزا تو یہ ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ میرا چھوٹا سا کام ہو جائے، عبادت چھوٹ جائے، خیر ہے۔

ہمارے ایک بزرگ دوست ہوا کرتے تھے حکیم خدا بخش مرحوم، اللہ انہیں غریق رحمت فرمائے۔ بڑے مزے کے آدمی تھے۔ اگر ان سے کوئی کہتا کہ میں مسجد نہیں جا سکا۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ تو وہ کہتے تھے کہ تم باہر جنگل میں رفع حاجت کے لیے گئے ہو؟ (اس وقت یہ لیٹرینیں غسل خانے گھروں میں نہیں ہوتے تھے، لوگ باہر جنگل میں جاتے تھے) وہاں جانا پڑا تو پھر مسجد تو اس سے قریب ہے۔ اپنی ذاتی ضرورت کے لیے اگر تم اتنے دور جا سکتے ہو تو مسجد اس کے بہت قریب ہے، اس کے لیے طبیعت کیسے خراب ہوگئی؟ اور وہ خود بڑے ضعیف ہو گئے تھے۔ بہت عمر رسیدہ تھے، نظر نہیں آتا تھا، فالج کا بڑا شدید حملہ ہو گیا، چل نہیں سکتے تھے۔ ہاتھ میں کچھ پکڑ نہیں سکتے تھے تو ایک ٹارچ جلا کر گلے میں لٹکا لیتے، گرتے پڑتے رات کو بھی نماز جماعت سے جا کر پڑھتے۔ ایک دن میں نے مذاق سے کہا کہ حضرت آپ پہلے بتی اٹھا کر چلتے تھے، وہ اٹھانے کی ہمت نہ رہی تو ایک ٹارچ لٹکا لیتے ہیں۔ یہ کس لیے؟ تو کہتے تھے کہ یار! لوگوں کو تو اس سے پتہ چلے گا نا کہ کوئی آ رہا ہے، وہ تو بچائیں گے نا مجھے۔ یعنی ایک آدمی کی لگن دیکھیں بچپن میں اس نے نماز شروع کی اور نوے پچانوے سو برس کا اپاہج بیمار معذور ہو گیا ہو۔ کہتا ہے، نہیں! مسجد گئے بغیر مزا نہیں آتا۔

تو چھوٹے چھوٹے امور کو مقدم کر کے اللہ کے ساتھ رشتوں کو مؤخر کرنا اور ان کے لیے چھوٹے چھوٹے بہانے گھڑنا، فرمایا! یہ اُس تعلق کے شایانِ شان نہیں ہے۔ نہ کرنے سے تو وہ بہت اچھا ہے، چھوڑ دینے سے تو وہ بہتر ہے لیکن جسے شایانِ شان کہتے ہیں، وہ بات نہیں ہے۔ اور مومن کا فرض ہے کہ اللہ سے وہ رشتہ قائم کرے۔ قرآن حکیم نے جو دلائل دیے ہیں، عقلی و نقلی، وہ رشتہ قائم کرنے کی طرف دعوت ہے۔ یہ سوچو، مجھے پیدا کس نے کیا یہ، سوچو، مجھے اعضاء و جوارح کس نے دیے، یہ

سوچو مجھے رزق روزی کون دے رہا ہے، یہ سوچو مجھے نعمتیں کس نے دیں، تو اس کی عبادت کرو لیکن عبادت کر کے کیا ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ:21) یعنی جو عقلی دلائل دیے اللہ کی عبادت پر، وہ اس لیے دیے کہ کم از کم تم اپنے شعور سے یہ فیصلہ کر سکو کہ اس ہستی کی عبادت کرنی چاہیے۔ میرا سر نیاز اس کی بارگاہ میں جھکنا چاہیے، لیکن عبادت کا حاصل کیا ہوگا؟ اللہ سے وہ رشتہ جو تمہیں اس کی ذات کا اسیر بنا دے یعنی حاصل عبادت بھی تقویٰ ہی ہے۔ روزہ رکھنے کا حکم دیا تا کہ اس کی نعمتوں کی قدر کر سکو۔ تمہیں بھوکے پیاسے بندے کی بھوک اور پیاس کا اندازہ ہو سکے۔ تم ان غریبوں کے حال سے بھی واقف ہو سکو جنہیں دو دو دن کھانے کو نہیں ملتا۔ ہر متمول اور امیر یہ بھی جان سکے کہ کسی غریب کے بچے کیسے بھوکے سوتے ہوں گے۔ اس کے ساتھ تمہاری اطاعت کا یہ امتحان بھی ہو جائے کہ حرام تو بہت دور کی بات ہے، اللہ کریم نے جو نعمتیں حلال کی ہیں، اس سے بھی روک دیا۔ ہمیں تو اللہ کی اطاعت مقصود ہے، کھانا پینا نہیں۔ یعنی رمضان کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حرام یا جن سے ہمیشہ کے لیے منع فرما دیا گیا، وہ تو دور کی بات ہے۔ جن کاموں کے کرنے کی اجازت ہے یا جن چیزوں کے کھانے کی اجازت ہے، جو حلال ہیں طیب ہیں، اللہ جب ان سے بھی روک دیتا ہے تو بندہ مومن کا کام اللہ کی اطاعت ہے، کھانا پینا نہیں کہ وہ اس کی اطاعت کو چھوڑ کر ان کی طرف لپکے۔ تو اس سارے کا حاصل کیا ہوگا؟

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (البقرہ:183) تمہیں وہی جذبہ، وہی محبت، وہی فنائیت، اللہ کے ساتھ وہی رشتہ الفت نصیب ہو جائے گا کہ پھر تم جینے مرنے کا تصور اس کی رضا کے بغیر نہیں کرو گے۔ ایک ولی اللہ سے کسی نے کہہ دیا کہ اگر اللہ نے تمہیں جہنم بھیج دیا تو؟ وہ کہنے لگا، اللہ کی مرضی لیکن میں تمہیں ایک بات بتاؤں، میں اس درد سے اس کا نام لوں گا کہ جہنم سرد ہو جائے گا۔ ہم تو چھوٹے چھوٹے نفع نقصان میں الجھے رہتے ہیں کہ جی میرا یہ کام نہیں ہوا، میں امتحان میں پاس نہیں ہوا میری تنخواہ نہیں بڑھی، میں بیمار کیوں ہو گیا، میں عبادت بھی کرتا ہوں، میں ذکر بھی کرتا ہوں، مجھے تکلیف کیوں آ گئی لیکن جب وہ رشتہ قائم ہوتا ہے تو نگاہ اس رشتے پر رہتی ہے حالات پر نہیں۔ پھر یہ جرأتِ رندانہ پیدا ہو جاتی ہے کہ اس رشتے کے ساتھ کوئی شے بھی تکلیف دہ نہیں ہے۔ وہ جو کہا گیا ہے۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم احد میں تھے۔ مدینہ منورہ کی ایک خاتون کا خاوند، اس کا بھائی، اس کا باپ، اور اس کا ایک بیٹا، یعنی ایک گھر کے چاروں نمائندے احد میں شہید ہو گئے۔ اس کے گھر کی چاروں دیواروں میں سے کوئی بھی باقی نہ بچی اور میدانِ اُحد سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی ہو رہی تھی وہ خاتون بے تابانہ شہر سے احد کی طرف بھاگی جا رہی تھی اور ہر ملنے والے سے پوچھتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیریت سے ہیں؟ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطلاع آئی تھی

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زخم لگے ہیں، رخِ انور زخمی ہوا ہے مرہم پٹی کی گئی ہے۔ تو اسے وہ پریشانی تھی۔ وہ جس کسی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیریت پوچھتی تو کسی نے باپ کی خبر دی، کسی نے میاں کی، کسی نے بھائی کی، کسی نے بیٹے کی لیکن اس نے کسی پر کان نہیں دھرا۔ سنتی رہی اور پوچھتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی رہی۔ کسی نے کہا کہ یہ سامنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سواری پر تھے۔ اس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، بے تابانہ بھاگی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاؤں مبارک پکڑا اس پر بوسہ دیا اور ایک بڑا خوبصورت جملہ کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وسلم مل گئے تو مصیبت مصیبت نہیں رہی۔ یعنی جو کچھ بیت گیا تھا وہ اتنا بڑا تھا کہ کسی بھی شخص کا دل پھٹ جانے کے لیے کافی تھا۔ خصوصاً ایک عورت جس کے سارے ہی عزیز رشتے اس طرح سے میدانِ کارزار میں کٹ جائیں اور وہیں دفن ہو جائیں اور انہیں دوبارہ زندگی میں دیکھنے کی امید نہ رہے لیکن اس کی نگاہ ان دکھوں کی بجائے اس رشتے پر تھی جو اسے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل تھا۔

اسی لیے ربِ کریم نے ساری اطاعت کے ساتھ اپنے ذاتی نام کی تکرار اور مسلسل ذکر کا حکم دیا۔ ایک عجیب بات ہے، ہر شے میں ایک تاثیر ہوتی ہے۔ آپ کسی چیز کا ذکر کثرت سے کرنا شروع کر دیں تو آپ کو اس چیز کے ساتھ ایک لگاؤ شروع ہو جائے گا۔ آپ کبوتر پالتے نہیں، کبوتر اڑاتے نہیں، کبوتر بازوں کے ساتھ بیٹھ کر کبوتروں کی باتیں روزانہ سنتے رہیں، ایک دن آپ پال بھی رہے ہوں گے، اڑا بھی رہے ہوں گے، ان سے محبت پیدا ہو جائے گی۔ آپ نے دیکھا کتنے شرفاء گانے بجانے والے مردوں اور گانے بجانے والی عورتوں کو برا سمجھتے ہیں اور ان کو کنجر کہتے ہیں۔ کنجر نام ہی ایسا ہے کہ کسی کو کنجر کہا جائے، گالی سمجھتا ہے۔ لیکن مسلسل لوگوں کو سنوا سنوا کر ذرائع ابلاغ نے آج انہیں لوگوں کا محبوب بنا دیا ہے اور لوگ کسی کنجر خاتون یا کسی کنجر مرد کا پرستار کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس تکرار نے کتنا کام کیا۔ یہ سارے لوگ اس طرح کے شیدائی نہیں تھے۔ اب کسی کو کہا جائے کہ تم ایسے ہو تو وہ کتنا برا مانے گا لیکن اب چونکہ لوگوں کو وہ پسند آ گئے تو انہیں کنجر سے اٹھا کر سٹار بنا دیا۔ کہاں وہ درجہ جو ان کا اصل مقام ہے اور کہاں وہ نسبت جو عقیدت مندوں نے اور پرستاروں نے دے دی ہے کہ انہیں ستارا کہا جانے لگا۔ یہ محض اس تکرار کا اثر ہے جو روزمرہ ہمارے معاشرے میں ریڈیو سے ٹیلی ویژن سے اور ہمارے ذرائع ابلاغ سے کی جاتی ہے۔ اسی طرح آپ کوئی اور شعبہ لے لیں۔ آپ کسی پہلوان کے پاس بیٹھنا شروع کر دیں اور روزانہ کشتی کی باتیں سنتے رہیں تو آپ اسے پسند کرنے لگیں گے۔ اگر کشتی کرنے کے قابل نہ ہو سکیں تو ہر اکھاڑے میں دیکھنے ضرور پہنچ جائیں گے۔ آپ نے دیکھا کہ مسلسل پراپیگنڈے نے کرکٹ کو گھریلو خواتین کا پسندیدہ کھیل بنا دیا۔ ہنڈیا جل جاتی ہے اور گھر کی عورتیں ٹیلی ویژن پر کرکٹ دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ یہ اس تکرار کا اثر ہے جو روزانہ بلا ناغہ ساری قوم کو سنوائی جاتی ہے۔ اب ایک خاتون کو اس میں کیا مزا مل رہا ہے جو گھر کی ہانڈی پکا رہی ہے، بچے پال رہی ہے، کپڑے دھو رہی

ہے،اسے کیاغرض کرکٹ کیا ہوتا ہے،کون دوڑ رہا ہے،کون بھاگ رہا ہے۔

انسانی مزاج میں یہ جوخصوصیت تھی، یہ اللہ نے اپنے لیے رکھی تھی،فرمایا دنیا میں تجھے بے شمار الجھانے والی چیزیں ملیں گی،دنیا چھوڑ دینے کے قابل نہیں ہے۔ یہ لوگ جواس پر تنقید کرتے ہیں، یہ بے وقوفی سے کرتے ہیں۔ارے اسے اللہ نے بنایا ہے۔اسے اللہ نے حسن بخشا ہے۔اس میں اللہ نے لذتیں رکھی ہیں۔اس کی لذتیں معمولی نہیں ہیں۔جو کہتے ہیں معمولی ہیں،وہ دل سے نہیں کہتے،رکھ رکھاؤ کے لیے کہتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ یہ بھی دنیا کا دلدادہ ہے۔ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔پھلوں کو مٹھاس،گلوں کوحسن،اس نے دیا ہے۔ان پہاڑوں کو بلندیاں اس نے دی ہیں۔وادیوں اوران صحراؤں کو اس نے حسن سے بھر دیا ہے۔دنیا اتنی حسین ہے کہ یہ اللہ کے مقابل آ گئی ہے۔اللہ کو پتہ تھا،اس کی اپنی صنعت ہے،اس نے بنائی ہی اتنی خوبصورت ہے اور بندے کی آزمائش ہی یہ رکھ دی ہے۔

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

ایک طرف اس کی اپنی ذات ہے،ایک طرف دنیا کی لذتیں اوراس کی مٹھاس اوراس کی خوبصورتی اوراس کا حسن ہے۔اب اس کا جادو حسی ہے محسوس ہوسکتا ہے۔اللہ ہمارے عقل وشعور کی رسائی سے بلند وبالا ہے۔توفرمایا اس جادو سے بچنے کے لیے میرے نام کی مسلسل تکرار کروگے تو وہ لذت نصیب ہوگی جواس کی لذتوں کو مات کر دے گی۔دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کے چنگل میں نہیں آ ؤ گے۔سکون میری محبت میں ملے گا،آرام دنیا کی نعمتوں سے حاصل کروگے۔استفادہ دنیا کی نعمتوں سے کروگے لیکن ان پر قربان ہونے کی بجائے رشتۂ الفت تمہارا میرے ساتھ استوار ہوگا،اس لیے رب جلیل نے قرآن میں بارہا اپنے نام کی تکرار کا حکم دیا ہے۔اس کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ اتنی بار نام لو،اللہ کا اتنی تکرار کرو کہ تمہارے دل میں موت وحیات کا اللہ سے الگ ہو کر کوئی تصور نہ رہے۔اللہ کی یاد کو چھوڑ کر جینا تمہارے لیے کوئی حیثیت نہ رکھے اوراس سے بیگانہ ہو کر مرنے کا کبھی خیال نہ آئے۔یعنی اس طرح ٹوٹ کر چاہو اپنے رب کو جواس کی شان کے لائق ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اے وہ بندو جو میرے ساتھ اپنے تعلق اپنے رشتے کا دعویٰ رکھتے ہو(اگر دعویٰ رکھتے ہو۔)

ایک دن حضرت جی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کو کچھ دوستوں نے دعوت دی۔میں بھی ساتھ تھا،ہم گئے۔ایک جگہ مرزائیوں کا بہت شور ہورہا تھا۔وہ بڑا پروگرام بنا رہے تھے اور بڑے بڑے زمینداروں کوانہوں نے اپنے ساتھ عقیدے میں ملالیا۔وہاں وہ ہائی سکول بنانا چاہتے تھے،ہسپتال بنانا چاہتے تھے۔تواس سے سارے لوگ ڈر رہے تھے کہ لوگ پھنس جائیں گے۔مفت پڑھائیں گے،بچوں کو ہسپتال میں مفت دوائیں دیں گے۔آنے والے لوگ ان کے جال میں پھنستے جائیں گے۔تواس کے لیے انہوں نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا۔وہاں جلسہ وتقریر ہوئی اوراس تقریر میں حضرت نے بجائے حیات

مسیح علیہ السلام پر بحث کرنے کے، مرزا کی نبوت کے جھوٹا ہونے کے یا ختم نبوت پر دلائل دینے کے، آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں مرزا کا تعارف کرواتا ہوں۔ جو اس کی اپنی تصانیف میں خود اس نے اپنی باتیں لکھی ہیں، اس کے حوالوں سے میں تم لوگوں کو بتاتا ہوں۔ تم پھر خود فیصلہ کر لینا کہ اسے نبی ماننا چاہیے یا اسے شریف انسان بھی مانا جا سکتا ہے۔ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کی تقریر میں حضرت جی رحمتہ اللہ علیہ نے وہ سارے حوالے بیان فرمائے۔ اس کا نتیجہ الحمدللہ یہ ہوا کہ جتنے لوگ وہاں مرزائیت میں پھنسے تھے، سب نے وہیں توبہ کر لی اور مرزائیوں کا سارا پلان ناکام ہو گیا، اس کے بعد ہم بیٹھے تھے تو حضرت رحمتہ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ یار ایک بات ہے کہ یہ جیسا بھی تھا، اس نے اگر نبوت کا دعویٰ کیا ہی تھا تو کم از کم اس دعوے کی لاج تو رکھتا۔ اپنے آپ کو بظاہر تو پارسا بنائے رکھتا۔ یعنی باقی تو ساری بات جانے دو۔ وہ دین سے گیا، ایمان سے گیا، لوگوں کو گمراہ کیا لیکن یہ جو اس کی زندگی میں سارا لچر پن ظاہر ہوتا ہے، یہ بھی کتنی عجیب بات ہے کہ ایک شخص دعویٰ نبوت کا کرتا ہے اور اس کا کردار دیکھو۔ کم از کم اس دعوے کا بھرم تو رکھتا۔ یہی اسلوب اس آیہ کریمہ کا ہے کہ اگر دعویٰ ایمان ہی کیا ہے تو پھر اس دعوے کا بھرم تو رکھو۔ ایسی زندگی تو اپناؤ جو ایمان کے مطابق زیب دیتی ہو۔ وہ کام تو نہ کرو جو کسی مسلمان کو سزاوار نہ ہو۔ جب تمہیں اللہ سے محبت کا دعویٰ ہے۔ اللہ کا بندہ ہونے کا دعویٰ ہے تو پھر خود کو اس کا بندہ ثابت کرو۔ زندگی میں، موت میں، حیات میں، دنیا میں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اور اللہ کو اس طرح چاہو جو اس کی شان کے لائق ہو۔ اللہ کریم ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرماتے ہوئے ہمیں اس نعمت سے سرفراز فرمائیں۔

تفصیل کے لیے ان آیات کی تفسیر اسرار التنزیل اور اکرم التفاسیر میں دیکھی جا سکتی ہے۔

☆ ☆ ☆

سبق نمبر۱۳: سورۃ آل عمران

آیت نمبر:۱۰۳

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا

اور سب مل کر اللہ کی (ہدایت کی) رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور

تَفَرَّقُوْا ۖ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ

متفرق نہ ہو جاؤ اور تم پر جو اللہ کی نعمت ہے اسے یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے

اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ

تو اس نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی پس تم اس کی نعمت (فضل و کرم)

اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ

سے بھائی بھائی ہو گئے اور تم آگ کے گڑھے (دوزخ) کے کنارے پر تھے

فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ

پس اس نے تم کو اس سے بچا لیا اسی طرح اللہ تمہارے لئے نشانیاں بیان کرتے ہیں

تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

تا کہ تم ہدایت پاؤ۔

اس آیۂ مبارکہ میں اللہ کے ساتھ تعلق کا ایک اور امتحان، ایک اور آزمائش، ایک اور فرق، ایک اور معیار جسے بندہ خود بھی جانچ سکتا ہے، دیکھ سکتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا سب کو اگر اللہ سے نسبت ہوگی، اللہ سے محبت ہوگی، اللہ سے تعلق ہوگا تو سب کا مقصدِ حیات ایک بن جائے گا اور اس میں سے تفریق اور تفرقہ بازی ختم ہو جائے گی۔ یہ عجیب بات ہے کہ غیر اللہ کی محبت میں رقابت ہوتی ہے اور اللہ جل شانہ کی محبت میں یک رنگی اور ایک اس طرح کی کیفیت ہوتی ہے کہ سارے محبت کرنے والے ایک وجود بنتے چلے جاتے ہیں۔ تو فرمایا، ایک یہ پہچان بھی ہے کہ تفرقہ بازی نہ کرو۔ میں نے پہلے بھی عرض کیا

تھا کہ اختلاف اور تفرقہ کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی حق کو قبول نہ کرے اور اپنی بات منوانے پر اصرار کرے لیکن جو لوگ حق کو قبول کر لیتے ہیں، دین کی ضروریات کا انکار نہیں کرتے، جو لوگ اصول میں متحد ہیں، اگر اس اصول کی تائید میں یا اس کی فرع میں ان میں اختلاف ہے تو یہ اختلاف لغوی ہے۔ لغت میں اسے اختلاف کہیں گے، حقیقت میں یہ اختلاف نہیں ہے۔ دراصل یہ تعمیل ارشاد کی کوشش ہے۔ اگر اسے اپنی اپنی اپروچ (approach) کے مطابق سب نے سمجھ لیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے اختلاف کو امت کے لیے رحمت قرار دیا ہے کہ اس میں آسانی ہے کہ ہر شخص اپنی استعداد اور اپنی اپروچ (approach) کے مطابق خلوص کے ساتھ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے۔ یعنی اللہ کی بات ماننا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ماننا تو ضروری ہے لیکن میری تعبیر ماننا ضروری نہیں۔

ایک بات کی تعبیر میں نے سمجھی ہے، آپ کو بتا رہا ہوں۔ اسی کی ایک تعبیر آپ سمجھ لیتے ہیں۔ جو اس کے اصولوں کے خلاف نہیں ہے۔ تو اللہ کی اطاعت فرض ہے، اللہ کے نبی علیہ السلام کی اطاعت فرض ہے، میری اطاعت فرض نہیں ہے۔ میرے ساتھ اختلاف کرنے کا آپ کو حق حاصل ہے کہ جس انداز میں میں نے اس کی تعبیر سمجھی ہے آپ اس سے بہتر یا دوسرے انداز میں سمجھ رہے ہیں تو ٹھیک ہے۔ اللہ کے ساتھ خلوص ہو، اللہ کے نبی علیہ السلام کے ساتھ خلوص ہو، کوئی ایسی تعبیر نہ سمجھی جائے جو منشائے نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہو، کوئی ایسی تعبیر نہ سمجھی جائے جو ان حدود کے خلاف ہو جو قرآن و حدیث کے سمجھنے کے لیے متعین ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی ایسی ہستی نہیں ہے کہ اس کی بات مانی جائے۔ اور یہی بات آپ کو صحابہ کرامؓ میں نظر آتی ہے جسے آپ اختلاف سمجھ لیتے ہیں۔ یا جن کو اختلاف کہا جاتا ہے، وہ اسی حد تک ہے کہ ہر شخص نے خلوص کے ساتھ اپنی سمجھ کے مطابق اس عمل کو بجا لانے کی کوشش کی۔ تو یہ ایک آزمائش ہو جائے گی کہ اگر مقصد ایک ہے اس مقصد کے ساتھ خلوص ہے تو سب سے اتحاد ہو گا۔ اگر مقصد کا دعویٰ ایک ہی ہے لیکن اس کے ساتھ مخلص نہیں ہے اور مقصد کی آڑ میں اپنی بات منوانا ہے تو فرقہ بازی آ جائے گی، لوگ بٹ جائیں گے۔ لوگ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالیں گے، لوگ ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچیں گے۔ اور آج کی ہماری سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ کچھ لوگ جو تفرقہ بازی کو ختم کرنا چاہتے ہیں یا جن کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ فرقہ بندی کے خلاف ہیں، اتنے لبرل (liberal) ہو گئے ہیں کہ وہ کفر کو بھی اسلام سے الگ نہیں کرنا چاہتے۔ وہ اسے بھی فرقہ بازی سمجھتے ہیں کہ کافر کو کافر کہا جائے اور مومن کو مومن کہا جائے۔

اگر کوئی ایمان کی بنیادی باتوں یعنی ضروریاتِ دین سے انکار کرتا ہے، کتاب اللہ کا انکار کرتا ہے، رسالت کو ویسے نہیں مانتا جیسے اللہ منواتا ہے، اللہ کی ذات کو اس طرح سے نہیں مانتا جس طرح اللہ اور اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ماننے کا حکم دیتے ہیں تو وہ کافر ہے۔ اس میں تفرقہ بازی تو نہیں ہے۔ تفرقہ بازی تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں کئی فرقے بنیں۔ کافر تو ایک الگ قوم ہے اور وہ کافر زیادہ خطرناک ہوتا ہے جو ہوتا کافر ہے اور دعویٰ اسلام کا کرتا ہے۔ وہ زیادہ نقصان دہ ہے کہ کافر سے تو عام مسلمان بچتے

کی کوشش کرتا ہے لیکن اسے مسلمان سمجھ کر دھوکا کھا جاتا ہے۔ تو یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کافروں کو بھی مسلمان کہا جائے۔ یہ کوئی اتحاد نہیں ہے۔ یہ بے دینی ہے اور اسے مداہنت خوشامندانہ صلح کہا جاتا ہے جس میں اپنے ذاتی منافع حاصل کرنے کے لیے خوشامد کر کے صلح کی جائے۔ عموماً یہ ہمارا سیاست دان طبقہ یا خود ساختہ لیڈری کا جنہیں شوق ہوا ہے، وہ یہ کوششیں کرتے رہتے ہیں کہ کوئی کافر ہو یا مسلمان ہمارے ساتھ وہ شامل رہے، ہماری طاقت کا سبب بنا رہے۔ تو کافر کو کافر کہنا فرقہ بازی نہیں ہے لیکن جو لوگ ضروریاتِ دین کا انکار نہیں کرتے، ان میں متفق ہیں، ان کی تعبیر میں اگر اختلاف کرتے ہیں تو انہیں کافر کہنا یا ان پر طنز کرنا یا انہیں برا بھلا کہنا یا ان کے ساتھ جھگڑا کرنا، یہ صحیح نہیں ہے۔ اگر للہیت ہوگی تو از خود یہ جھگڑا ہوگا ہی نہیں۔

تو فرمایا، اس وقت کو یاد کرو، اللہ کی ان نعمتوں کو یاد کرو کہ اسلام نے دنیا سے فساد ختم کر کے دنیا کو اور بالخصوص اپنے ماننے والوں کو، محبتوں کے خزانے عطا کر دیئے۔ **وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ** اللہ کے انعامات کو یاد کرو جو تم پر اس نے لٹائے کہ تم **اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً** سب ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ انسان انسان کو کاٹ کر کھاتا تھا۔ ظلم و جور تھا، بربریت تھی، بے دینی تھی، بدکاری تھی۔ کون سی برائی تھی جو نہیں تھی۔ اور کسی انسان کو کسی سے کوئی ہمدردی، کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ حکومتیں تھیں، انصاف نہیں تھا۔ طاقت والے بھی ظلم کرتے تھے، اور کمزور بھی بدکار تھے۔ اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرما کر، دینِ برحق کو نازل فرما کر **فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا** اس نے تمہارے دلوں میں محبت بھر دی اور تم دیکھتے ہی دیکھتے **فاصبحتم** یعنی فوراً جیسے شب کو آنکھ جھپکی، آنکھ کھلی تو دیکھا تم بدل گئے کہ دشمن سے دوست بن گئے۔ دوست ہی نہیں بھائی بن گئے۔ یعنی جو ایک دوسرے کا گلا کاٹتے تھے، وہ ایک دوسرے کے محافظ بن گئے، جو ایک دوسرے کے دشمن تھے، وہ ایک دوسرے کا بھلا چاہنے والے بن گئے **وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ** اور تم تو دوزخ کے کنارے کنارے پھرا کرتے تھے یعنی تمہارے اعمال ایسے تھے کہ دوزخ میں اور بنی آدم میں صرف موت حائل تھی۔ کنارے پر پھر رہے ہوتے تھے، جس کا دم ٹوٹتا تھا وہ دوزخ ہی میں گرتا تھا۔ **فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا** اللہ نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے، اللہ کے دین نے تمہیں وہاں سے اچک لیا۔

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ اللہ اپنی آیات، اپنے دلائل، اپنی بات، اس طرح کھول کر بیان فرماتا ہے تاکہ تمہیں ہدایت نصیب ہو، سیدھے راستے پر چلنا نصیب ہو۔ اور یہ ایک ہی معیار کے دو پہلو آ گئے۔ ایک پہلو تو یہ کہ آپس میں لڑائی نہیں ہوگی، ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش نہیں ہوگی، ایک دوسرے پر الزام لگانے کی کوشش نہیں ہوگی، اور یہ عین اسلام ہوگا۔ کوئی ایسی جماعت، کوئی ایسی محفل، کوئی ایسا طبقہ افراد کا نظر آئے جو یہ جذبہ دے سکے کہ ہر چھوٹے بڑے میں محبت پیدا ہو جائے انسان ایک دوسرے پر مسلط ہونے کی کوشش نہ کرے بلکہ سارے مل کر اللہ کی اطاعت کے لیے محنت کریں تو یہی اہلِ حق کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ لیکن آپ اگر کسی جماعت میں جاتے ہیں، کسی طبقے میں جاتے ہیں، کسی گروہ کے ساتھ شامل ہوتے ہیں۔ وہ مزید تقسیم در تقسیم کر کے لڑائی میں اور مزید نفاق میں اور مزید دشمنیوں میں الجھا دیتا

ہے تو یہ خصوصیت حق کی نہیں ہے۔ یقیناً پیچھے کسی انسان کی خواہشیں کار فرما ہیں، کوئی انسانی ضرورتیں کار فرما ہیں، کوئی اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر اپنی بات منوانا چاہتا ہے۔ نام اللہ کا لیا جاتا ہے، نام کتاب کا لیا جاتا ہے، نام اسلام کا لیا جاتا ہے لیکن منوانا اپنی چاہتا ہے تو فرقہ بازی شروع ہو جاتی ہے۔ یہی ایک معیار اور سب سے بڑا معیار ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ تعلق پیدا ہو کہ یہ کیفیت دل میں آ جائے کہ آدمی دوسرے مسلمان کو بحیثیت مسلمان برداشت کرے۔ اور اتنا نرم بھی نہ ہو جائے کہ کفر میں اور اس میں کوئی تفریق نہ رہے کہ کوئی کفر بھی کرتا رہے تو اس کو بھی برداشت کر جائے۔

اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (الفتح:29) آپس میں محبت پیدا ہو اور کفر کے لیے شدت پیدا ہو۔ کسی بھی گروہ یا کسی بھی مجلس یا کسی بھی قوم کے حق پر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ حق کے ساتھ، نیکی کے ساتھ، نیک کاموں کے ساتھ، نیک لوگوں کے ساتھ تو محبت بڑھے اور برائی کے ساتھ، ظلم کے ساتھ، کفر کے ساتھ، صلح کی خواہش نہ رہے۔ کفر کو برداشت کرنے کی گنجائش نہ رہے۔ آدمی اس سے سمجھوتہ نہ کرے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ برائی اگر ہو رہی ہو تو بندے کو چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ سے روکے، اس کے خلاف جہاد کرے، میدانِ عمل میں آئے۔ اگر وہ خود کو کمزور سمجھتا ہے اور اتنی جرأت نہیں کرتا تو اس کی زبان سے تردید تو کرے۔ برائی کو برا تو کہے۔ غلطی کو غلط تو کہے۔ کفر کو کفر تو کہے۔ اگر اس میں یہ جرأت بھی نہیں ہے تو اپنے آپ کو اس ماحول سے الگ کر لے اور فرمایا ذالک اضعف الایمان یعنی ضعیف نہیں اضعف، بہت ہی کم تر آخری درجہ ایمان کا یہ ہے کہ کم از کم برائی کے ساتھ سمجھوتہ تو نہ کرے۔ اور اگر کسی نے برائی کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا، دنیوی منافع دنیوی مصالح یا اپنی کمزوریوں کی بنا پر تو یہ تو کم تر ایمان، جو رائی کے دانے کے برابر آپ ایمان کہیں گے، اس سے بھی محروم ہے۔ اس میں تو وہ سب سے ادنیٰ درجے کا ایمان بھی نہیں ہے۔

تو مومن ایک عجیب ہستی بن جاتا ہے کہ ایک ہی لمحے میں اس میں اتنی شدت، اتنی سختی ہوتی ہے کہ اس کی کاٹ تلوار کی کاٹ سے تیز ہوتی ہے اور اسی لمحے اس میں پھولوں کی سی نرمی، شگفتگی تازگی اور خوشبو موجود ہوتی ہے۔ یعنی وہ کبھی ون سائیڈڈ (ایک طرفہ) نہیں ہوتا۔ اس کی زندگی کا ایک ہی رخ نہیں رہتا۔ اگر وہ سخت ہے تو برائی کے لیے کفر کے لیے۔ گناہ کے لیے اس میں اتنی شدت آ جاتی ہے کہ وہ اس کے لیے تیغ بے نیام بن جاتا ہے۔ لیکن اسی لمحے اس میں وہ نرمی، وہ شفقت، وہ محبت نیکی کے لیے موجود ہوتی ہے جو پھولوں سے بھی زیادہ خوبصورت اور پھولوں سے بھی زیادہ خوشبودار اور پھول کی پتی سے بھی زیادہ نرم ہوتی ہے، یہ معیار ارشاد فرمایا رب العالمین نے بندے کے لیے۔ ایک شیشہ، ایک آئینہ، جس طرح دفاتر کے باہر لگا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی وردی جانچ لے یا ڈریس (Dress) دیکھ لے۔ بجائے اس کے کہ کوئی اسے دیکھے، خود پہلے اپنے آپ کو دیکھ کر باہر نکلے۔ یہ وہ شیشے فٹ کر دیے ہیں رب العالمین نے کہ خود کو مسلمان کہلوانے والا اپنا چہرہ ان آئینوں میں

دیکھے۔اس سے پہلے کہ موت اس کے سامنے اس کا چہرہ بےنقاب کر دے۔اس سے پہلے کہ میدانِ حشر میں اس کے چہرے کا نقاب اتر جائے۔ان آیاتِ مبارکہ کے سامنے اپنے آپ کو کھڑا کر کے وہ اپنا اندازہ لگائے۔ہماری ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ جہاں ہماری کسی ضرورت کا سوال آتا ہے، جہاں ہمیں کچھ مل رہا ہوتا ہے، جہاں ہماری کوئی خواہش پوری ہو رہی ہوتی ہے، وہاں ہم سارا اسلام نافذ کر دیتے ہیں کہ جناب ایسا کرنے والا اتنا گنہگار ہے۔یہ بات نہ ماننے والا اتنا خطا کار ہے۔اور جب ہمیں پلے سے کچھ دینا پڑ رہا ہوتا ہے تو اس وقت ہم کہتے ہیں کہ جی بندے ہیں، خطا کار ہیں، خیر ہے اللہ معاف کرنے والا ہے۔یہ دین نہیں ہے۔کسی سے ہم ذاتی طور پر خفا ہو جائیں تو اس کے عقیدے، اس کے ایمان، اس کے عمل پر کیچڑ اچھالنے لگتے ہیں۔کسی سے دوستی ہو تو وہ بتوں کو بھی سجدہ کر آئے تو خیر ہے یار انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔تو یہ ساری چیزیں دین نہیں ہیں۔دین ہے یہ تو کہ ہر بات اللہ کے لیے کی جائے، اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے نہیں۔دوستی ہو یا دشمنی، کسی کے ساتھ محبت ہو یا عداوت، کسی کے ساتھ تعلق مضبوط کرنا ہو یا کسی سے تعلق قطع کرنا ہو تو یہ ساری باتیں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہو جائیں۔تب جا کر دین کی حلاوت نصیب ہوتی ہے۔اور یہ آیاتِ مبارکہ بتاتی ہیں کہ وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام آج قابلِ عمل نہیں ہے اور دنیا میں بہت زیادہ برائی ہو گئی ہے لہٰذا اس کے ساتھ سمجھوتہ کر لینا چاہیے، یہ ایمان کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

وہ لوگ وہ یہ دیکھ لیں کہ جب اسلام کا ظہور ہوا تھا تو لوگ گویا دوزخ میں بستے تھے۔اسلام نے عملاً ثابت کر دیا کہ جہنم زار سے بنی آدم کو اٹھا کر اس نے انہیں جنت کے سبزہ زاروں میں پہنچا دیا۔اور کون سا ازم، کون سا طرزِ حکومت اور کون سا قانون اور کون سا طریقہ معاشرت اور کون سی تہذیب انسانی تاریخ میں ہے یا صفحۂ ہستی پر موجود ہے؟ لائیے اور پیش کیجیے کہ فلاں تہذیب نے انسانیت کو فلاں برائیوں سے نجات دلا کر فلاں خوبصورت معاشرہ تشکیل کیا۔اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ ہر معاشرے میں کوئی نہ کوئی خوبی ہے۔کہیں معاشی ترقی ہے، کہیں سیاسی استحکام ہے، کہیں فوجی برتری ہے۔لیکن اس ایک خوبی کو دیکھ کر آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ساری انسانیت کا وہاں جنازہ نکل چکا ہے۔یعنی کوئی بھی خوبی جانچنے کے لیے بنیاد یہ ہے کہ انسان بحیثیت انسان یہ خوبی حاصل کرے۔اس میں انسانیت تو باقی رہے۔اگر انسان سے انسانیت ہی کی نفی ہو گئی تو پھر اس کی فوجی قوت بڑھ بھی گئی تو کیا فائدہ ہوا۔وہ تو درندوں کی قوت ہے اور یہی آپ بوسنیا ہرزگوینا میں دیکھ نہیں رہے۔یہ فوجی قوت ہے یا یہ درندگی ہے یا جو ہندوستانی فوجیں کشمیر میں کر رہی ہیں کیا یہ فوجی طاقت کا مظاہرہ ہے یا درندگی ہے۔فوجی طاقت کا مظاہرہ تو یہ ہے کہ فوجی طاقت کو شکست دی جائے۔مقابلہ کیا جائے۔میدانِ کارزار میں نہتوں کو قتل کرنا، عورتوں کی آبروریزی کرنا، بچوں کو خون میں نہلانا، یہ فوجی قوت کے مظاہر ہیں؟ فوجی قوت تو آئی لیکن انسان انسانیت سے محروم ہو گئے، درندے بن گئے۔اسی طرح معاشی ترقی ہے۔انسانوں کے پاس نہ عقیدہ ہے۔نہ انسانی اخلاق ہے نہ انسانی محبتیں ہیں نہ

انسانی رشتوں کی پہچان ہے۔ ان کے پاس بہت سی دولت ہے تو کیا حاصل ہوا۔ یعنی جو اوصاف انسانیت کے لیے چاہیے تھے، وہ نفی ہو گئے۔ دولت آ گئی تو یہ ایک خوبی ہے کہ جاپان کی اکانومی (Economy) کا بہت زور ہے یا امریکہ کے پاس بہت سی فوجی طاقت ہے یا برطانیہ کا بہت سیاسی استحکام ہے۔ تو اس ایک ایک خوبی کے ساتھ جو انسانی اوصاف اس معاشرے سے نفی ہو گئے ہیں، وہ خوبی انسانوں کے پاس تو نہیں ہے۔ وہ تو انسانیت سے محروم مجسموں کے پاس ہے، اس کا کیا فائدہ ہوا۔ اسلام نے جب مالی استحکام بھی بخشا، جب فوجی قوت بھی بخشی تو اس کے ساتھ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بنی آدم کو انسانیت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ اسلام کو ہم چھوڑ رہے ہیں۔ اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ رکھنے کے باوجود اور ان کافروں کے پیچھے چلنے کو تیار ہیں جہاں کوئی ایک خوبی ہمیں نظر آتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کوئی ایک خوبی ہے لیکن اس ایک خوبی کے بدلے جتنی انسانیت کی قربانی دی گئی ہے، اس سے تو اس بندے کا محتاج ہونا اور اس خوبی کا نہ ہونا بہتر تھا۔ جاپانی بھوکے رہتے، ان میں انسانیت تو ہوتی، وہ اللہ کو تو پہچانتے، ماں، بہن کو تو پہچانتے، کسی بڑے چھوٹے کو تو پہچانتے۔ وہاں تو کوئی کسی کا کچھ نہیں لگتا، صرف روبوٹ زندگی گزار رہے ہیں۔ یہی حال باقی معاشروں کا بھی ہے۔

تو اسلام نے لوگوں کو نفرت کے بھڑکتے شعلوں سے اٹھا کر محبت کے سمندروں میں ڈبو دیا۔ اسلام نے جہنم کے بھڑکتے شعلوں سے اٹھا کر انسانیت کو جنت کے گلزاروں میں پہنچا دیا اور اس کے ساتھ فوجی طاقت بھی دی، حکومت و سلطنت بھی دی، معاشی ترقی بھی دی اور انسانیت کا احترام بھی سکھایا۔ اللہ کریم فرماتا ہے، اس بات کو یاد رکھو، ان لمحوں کو یاد کرو، اللہ کے ان انعامات کو یاد کرو تو توقع کی جا سکتی ہے کہ تم پھر سیدھے راستے پر آ جاؤ **لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ**۔

تفصیل کے لئے ان آیات کی تفسیر کا مطالعہ اسرار التنزیل اور اکرم التفاسیر سے کیجیے۔

☆ ☆ ☆

سبق نمبر۱۴: سورۃ النساء

آیت نمبر۱۴

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ

اور جو شخص اللہ اور اس کے پیغمبر کی نافرمانی کرے گا اور اس (اللہ) کی حدود سے نکل جائے گا

يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا ۖ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿١٤﴾

وہ اس کو دوزخ میں ڈالیں گے وہ اس میں ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہوگا۔

جس طرح پہلے سبق میں گزرا ہے کہ اللہ کی کتاب اور حدوداللہ کی نگہداشت جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم فرمائی ہے، اس طرح سے کرنا ہی کامیابی کی ضمانت ہے اور اس کے برعکس یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی نہیں کرے گا تو بری بات ہے، کامیاب نہیں ہوگا۔ کامیاب نہ سہی، ناکام سہی لیکن دین کے معاملے میں ایسا نہیں ہوتا۔ دین کے معاملے میں جیسا ہمارے کل کے سبق میں تھا کہ جو کسی کے بس میں نہیں ہے، اس کے بارے میں پوچھا ہی نہیں جائے گا۔ وہ مکلف ہی نہیں۔ لیکن جو وہ کرسکتا ہے اور نہیں کرتا، وہ صرف ناکام نہیں ہوگا بلکہ ناکامی کا معنی یہاں عذاب الٰہی میں گرفتاری ہے۔ انسانی زندگی کی منازل دو ہیں۔ ایک اللہ جل شانہ کی رضامندی، اس کا قرب اس کے انعامات۔ دوسری اللہ کا غضب، اس کے عذاب اور اس کی گرفت۔ اس لیے کہ انسانی زندگی کوئی عام اور معمولی چیز نہیں ہے۔ انسان کو اللہ جل شانہٗ نے شعور سمجھنے اور سوچنے کی وہ قوت اور عمل کی وہ طاقت دی ہے جو کسی دوسری مخلوق کو عطا نہیں فرمائی۔ حتیٰ کہ انسان خود ذاتِ باری کی عظمت کو سمجھ سکتا ہے اور خود ذاتِ باری کا طالب بنتا ہے۔ دوسری کوئی مخلوق یہ جرأت نہیں کرسکتی۔ اس وجہ سے اللہ جل شانہٗ نے دوسری ساری مخلوق کو انسان کی خدمت پر لگا دیا۔ سورج چاند ستارے آسمانی مخلوق یا زمینی ہر ذرہ ہوا کا ہر جھونکا اگنے والا ہر تنکا ہر پتا، پیدا ہونے والا ہر جانور کسی نہ کسی طور انسان کی خدمت پر لگا ہوا ہے بلکہ جن چیزوں کو ہم مضر سمجھتے ہیں، وہ بھی مفید ہیں۔ ہمارے سمجھنے میں قصور ہے۔

طب کا ایک قاعدہ ہے کہ دنیا میں زہر نہیں ہے۔ کوئی چیز بھی جو رب العالمین نے پیدا فرمائی ہے، وہ باطل نہیں ہے۔ انسان کی خادم ہے۔ تو پھر زہر کھانے سے بندہ مرتا کیوں ہے؟ اس کے لیے طبیب یہ کہتے ہیں کہ ہر شے کی جو خوراک یعنی ڈوز (dose) ہے، وہ مختلف ہے۔ اب دودھ تو زہر نہیں ہے لیکن کسی آدمی کے پیٹ میں آپ دس سیر دودھ ٹھونس دیں، اس کے لیے زہر بن جائے گا۔ اسی طرح جسے آپ زہر کہتے ہیں، اس کی خوراک انتہائی قلیل ہے۔ آپ ذرا زیادہ کھالیں تو وہ زہر

بن جائے گی۔ تو وہ کہتے ہیں کہ جو تعین اس کی ڈوز (Dose) کا ہے، اس میں فرق ہے۔ زہر کچھ بھی نہیں ہے، ہر چیز انسان کی خادم ہے۔

جس طرح یہ سیارے اور ستارے ہیں۔ ان کے طلوع وغروب، ان کی گردش اور جو کچھ انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام نے فرمایا، اسی کی تائید سائنس بھی کرتی ہے کہ یہ سارے انسانی خدمت پر لگے ہوئے ہیں۔ سیارے یا ستارے کی گردش، اس کا طلوع وغروب، زمین پر مختلف تبدیلیاں پیدا کرتا ہے۔ کہیں بہار اور کہیں خزاں، کہیں گرمی اور کہیں سردی، کہیں روشنی اور کہیں تاریکی، کہیں روئیدگی اور کہیں فصلوں کا پکنا اور کہیں مرجھا جانا، بارش کا ہر قطرہ، ہوا کا ہر جھونکا، غرض کائنات کی ہر شے کی توجہ زمین کی طرف ہے۔ آسمانی مخلوق، فرشتے، بارش برسانے پر، روزی تقسیم کرنے پر، موت وحیات پر، پھلوں کے اگانے پکانے پر جو لگے ہوئے ہیں، کیا انسانی خدمت نہیں کر رہے؟ ہر چیز کو اللہ کریم نے انسان کی خدمت پر لگا دیا۔

انسان کو یہ استعداد بخشی ہے کہ وہ اپنی ذات کے حوالے سے، اپنی حیثیت کے مطابق، خود اللہ کو پہچان سکتا ہے۔ اسے جان سکتا ہے۔ اب ناکامی کا مطلب یہ ہے کہ اتنی مخلوق سے انسان نے خدمت بھی لے لی اور اس کے پاس اللہ کو پہچاننے کی جو قوت تھی، اس کو بھی ضائع کر دیا۔ تو یہ صرف ناکام نہیں ہوگا بلکہ اسے اس سارے کا جواب بھی دینا ہوگا کہ اتنی مخلوق سے خدمت تو لیتے رہے اور خود صرف اللہ کو پہچاننے کا کام کرنے سے انکار کر دیا۔ خود اتنا تکلف بھی نہ کیا کہ جان لے کہ میرا ایک مالک بھی ہے۔ تو یہ صرف ناکامی نہیں ہوگی بلکہ فرمایا۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ جس نے اللہ ہی کی اطاعت کا انکار کر دیا۔ اب انکار کا واضح مطلب یہ ہے کہ اس نے اللہ کو اللہ سمجھا ہی نہیں۔ اگر کوئی اللہ کو اللہ سمجھتا ہے، جیسا وہ ہے۔ خالق بھی ہے، مالک بھی ہے، رازق بھی ہے، منعم حقیقی بھی، ہے رحم وکرم فرمانے والا بھی ہے تو پھر نافرمانی کا راستہ اختیار نہیں کرتا۔ خطا ہو جانا، غلطی ہو جانا اور بات ہے اور اطاعت سے انکار کر دینا یا ذات ہی کا انکار کر دینا، یہ بالکل الگ بات ہے۔ اور اللہ کا اقرار کرنا یہ نہیں ہے کہ ہم جیسا چاہیں، ویسا اللہ کو مانیں اور جو تعلیمات نبوی ہیں، ان کی پروا نہ کریں۔ فرمایا اللہ کا انکار یہی ہے کہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا انکار کر دیا جائے۔ عقائد میں بھی، نظریات میں بھی، اعمال میں بھی۔

تھوڑا بہت اختلاف جو علماء میں ہوتا ہے وہ اختلاف نہیں ہے۔ وہ اختلاف سمجھ کا، اپنے اپنے مزاج کا، اپنی اپنی اپروچ (appoach) کا ہوتا ہے۔ مثلاً جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خندق سے واپس تشریف لائے تو زرہ کھولنے سے پہلے اللہ کا حکم آیا کہ آپ یہود کی خبر لیجیے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ عصر کی نماز بنی قریظہ میں جا کر پڑھی جائے۔ تو کسی نے زرہ نہیں کھولی اور سارے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین دوڑ پڑے۔ چار پانچ کوس کا فاصلہ بنتا ہے۔ تو راستے میں عصر کی نماز کا وقت ہو گیا۔ کچھ نے کہا کہ ہمیں نماز وہاں پہنچنے تک مؤخر کرنی چاہیے۔ دوسروں نے کہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد

فرمانے کا یہ تھا کہ جلدی پہنچو، نماز کو مؤخر کرنے کا حکم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں دیا۔ اب یہ دو اپروچ (approach) بن گئیں۔ یعنی دونوں اس بات کو مان رہے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا یہ ہے کہ وہاں جلدی پہنچو۔ اور دونوں اس بات پر تیار تھے کہ ہم وہاں جا رہے ہیں۔ اب اپروچ اپنی اپنی ہے کہ ایک گروہ نے کہا نماز کو مؤخر کرنے کا فائدہ نہیں۔ دوسرے نے کہا کہ نماز مؤخر ہوتی ہے تو ہوتی رہے، ہم پہلے وہاں پہنچیں گے۔ تو دونوں نے اپنی اپنی رائے پر عمل کیا تو جب وہاں پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کا حکم سے انکار نہیں سمجھا۔

اللہ جل شانہٗ کی اطاعت، اللہ کی معرفت، وہی حقائق ہیں جو اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حکم سے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ اب اگر کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات نہ مانی جس طرح میں پہلے عرض کر رہا تھا کہ صرف جنت پانا مقصد نہیں ہے۔ مقصد قرب الٰہی ہے۔ اسی طرح جو نا کامی ہے، یہ معمولی بات نہیں کہ ایک امتحان میں رہ گئے پھر دوبارہ بیٹھ جائیں گے، اگلے سال محنت کر لیں گے۔ یہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہاں کا گزرنے والا ہر لمحہ اپنی ایک حیثیت رکھتا ہے۔ جس طرح علماء فرماتے ہیں کہ رمضان میں اگر آپ نے روزہ چھوڑ دیا تو آپ اس کو رمضان میں قضا نہیں کر پائیں گے۔ کیونکہ پھر جب رمضان آئے گا تو اس کے اپنے روزے فرض ہوں گے۔ آپ کا قضا پھر غیر رمضان میں ہی ہوگا۔ اسی طرح جو لمحہ بیت جاتا ہے، اس لمحے میں ہم آسمان سے لے کر زمین تک کی ہر شے سے شعوری یا غیر شعوری طور پر خدمت لے رہے ہوتے ہیں۔ جس ہوا میں ہم سانس لے رہے ہیں، اس کو ہم جانتے پہچانتے نہیں، اسے ہم شمار نہیں کرتے۔ جو نگاہ کی قوت ہم استعمال کرتے ہیں، شمار نہیں کرتے۔ جو مختلف قوتیں بدن میں اللہ نے سمو دی ہیں۔ ہمیں ان کا اندازہ نہیں ہے۔ یہ فضا اور اجرامِ سماوی ہم پر اثرات جو مرتب کر رہے ہیں۔ یہ معمورۂ عالم جس طرح ایئر کنڈیشن کیا گیا ہے۔ یہ کہیں گرمی، کہیں سردی، انسانی ضرورت اور نشوونما کی ضرورت کے مطابق، اس سارے سے جو فائدہ ہم اٹھا رہے ہیں، اسے ہم شمار ہی نہیں کرتے۔ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں کو شمار میں لے آتے ہیں کہ آج کھانا نہیں ملا، مجھے جی بڑی تکلیف ہے، آج میری نوکری چلی گئی۔

امریکہ سے مجھے ایک فون آیا کہ جی بڑی بری خبر ہے، میری نوکری چلی گئی۔ میں نے کہا کہ میں سمجھا اللہ نے تمہاری روزی بند کر دی۔ اگر ایسی بات ہے پھر تو بری خبر ہے۔ اس نے بند نہیں کی۔ یہ تو ایک نظام ہے، ایک جگہ سے شاید نوکری کا جانا تمہارے لیے کسی دوسری بہتر نوکری کے ملنے کا سبب بن جائے۔ اس میں تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ گھبرانے کی بات تو یہ ہے کہ آج تم ہوا میں سانس نہیں لے سکتے۔ آج تمہیں سورج کی دھوپ نظر نہیں آ رہی۔ آج تمہیں موسم کی گرمی سردی کا پتہ نہیں۔ تم پر یہ چیزیں اللہ بند کر دیں۔ اگر نہیں تو پھر فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو نظامِ کائنات ہے۔ اگر ایک جگہ سے ملازمت گئی ہے تو شاید کسی بہتر ملازمت کا پیش خیمہ بن جائے۔ یوں چھوٹی چھوٹی چیزیں ہم شمار کرتے ہیں۔

لیکن اتنے بڑے فلسفے کا ایک اصول ہے کہ اگر کوئی شخص تنہا بیٹھ کر یہ سوچے کہ صرف میں روئے زمین پر ہوں تو پھر وہ

اندازہ کرے کہ اس ایک فرد کے لیے یہ کتنا وسیع نظام گردش کر رہا ہے۔ یہ ایک ایک بندے کے لیے ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم سب کے لیے ہے۔ ہم سب کے لیے تو تب ہے کہ اگر سب نہ ہوں تو اسے بند کر دیا جائے۔ اگر سب نہ رہیں ایک بندہ بھی رہ جائے تو یہ سارا نظام اسی طرح چلتا رہے گا تو اس کا مطلب ہے کہ ایک ایک بندہ اس پورے وسیع نظام سے استفادہ کر رہا ہے۔ اتنی خدمت بھی لے رہا ہے۔ پھر اللہ نے اسے شعور بھی بخشا پھر اسے دلائل دیے (دیکھیں اللہ حکم دینے کا مجاز ہے اللہ کی یہ شان ہے کہ صرف حکم دے لیکن اس نے اپنے ہر حکم کے ساتھ دلائل دیئے) عقلی بھی اور نقلی بھی۔ پہلی قوموں کی مثالیں دے کر پہلے لوگوں کے کردار کو بیان کر کے، بہت وسیع مضامین قرآن حکیم میں سمو دیئے کہ نافرمانی کا کتنا بڑا وبال ہے۔ ان سب کو بھی آدمی چھوڑ دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ جل شانہ نے اپنے سارے کمالات سمو دیے ہیں۔ جتنی صنعت تھی اس کی، اس نے اس کا کمال بنا دیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ ایک فردِ واحد ایک طرف، ساری کائنات ایک طرف۔ اس ایک بندے کی مثال کائنات میں نہیں ملتی۔ اس بندے کو جو قرب بخشا، اس کے علاوہ کسی کو نہیں بخشا۔ اسے جو نور بخشا، اس کے علاوہ کسی کو نہیں بخشا۔ جو درجہ علم کا اسے بخشا، اس کے علاوہ کسی کو نہیں بخشا۔ جو درجہ حسن کا اسے بخشا، اس کے علاوہ کسی کو نہیں بخشا، ہر پہلو پر جو حسن اسے دیا، وہ کسی کو نہیں دیا۔ اب جو حسن کا معیار رب العالمین کا ہے اور جس کا سمبل (Symbol) ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اسے بندہ چھوڑ دے اور اپنی رائے پر حسن کا معیار قائم کرے۔ کبھی دولت کو، کبھی شہرت کو، کبھی حکومت کو، کبھی سلطنت کو، کبھی جائیداد کو۔ ان کے لیے اُس معیارِ حسن سے دستبردار ہو جائے جو رب العلمین نے کائنات میں یکتا پیدا کیا، تو آپ خود فرمائیے! اگر آپ کے ہاتھ میں فیصلہ ہو تو کیا اس جُرم پر آپ اسے صرف فیل ہی کریں گے، سزا کوئی نہیں دیں گے؟ آدمی سوچے کہ اطاعت نہ کرنا کتنا بڑا جرم ہے، کتنی بڑی گستاخی ہے۔ کتنی بڑی جرأت ہے کہ ساری کائنات میں جو اپنی تخلیق کا شاہکار رب العلمین نے بنا دیا، بندہ کہتا ہے مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ جو مٹی کا کھلونا میں بنا رہا ہوں، میرا وقت اِس پر تو لگ سکتا ہے، اُس کی طرف فرصت نہیں ہے۔ کئی خطوط آتے ہیں کہ نماز کے لیے جی نہیں کرتا، ذکر کرتا ہوں تو طبیعت نہیں لگتی، تہجد کے لیے اٹھا نہیں جاتا۔ تو میرے پاس سوائے اس بات پر دکھ محسوس کرنے کے اور دعا کرنے کے کوئی جواب نہیں ہوتا۔ خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس بندے کو کیا سمجھاؤں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد میں اسے کیا کہوں کہ اس کی غلامی کر لو! یہ میرے کہنے کی بات ہے؟ کسی کے کہنے کی بات ہے بھلا؟ یعنی بندہ کسی نہ کسی کے پیچھے تو چلتا ہے۔ کائنات میں جب آتا ہے تو وہ بے علم و بے بس، لاچار محض ہوتا ہے۔ کوئی پتہ نہیں کھانا کیا ہے، پینا کیا ہے، نفع کس میں ہے، نقصان کس میں ہے، برائی کیا ہے، غریبی کیا ہے، امارت کیا ہے، جانتا ہے بندہ کچھ؟ نہیں۔ **لا یعلم شیئاً** کچھ نہیں جانتا۔ کسی نہ کسی سے تو سیکھتا ہے۔ اس جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے پیچھے چلتا ہے۔ اب جس بندے کی اپنی استعداد ہی اتنی گر گئی کہ اس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر

کسی اور کے پیچھے چلنا اپنا لیا، میری دعا اس پر کیا اثر کرے گی۔ میں اسے کیا سمجھاؤں۔ ایک آدمی سورج کے سامنے دیا جلا کر بیٹھ جاتا ہے، اسے کون سمجھائے کہ دیے کی ضرورت نہیں۔ سورج جو نکلا ہوا ہے، سورج کو دیکھو۔ کہتا ہے نہیں! دیے کی روشنی ہے، سورج کی نہیں، اسے آپ کیا سمجھائیں گے۔ یہ دعا اور وظیفوں کی بات نہیں ہے، یہ انسانی شعور کی بات ہے۔

اسی لیے اللہ نے دین کسی پر جبراً مسلط کرنے کا حکم نہیں دیا۔ فرمایا، جو میرے اتنے مظاہر کو دیکھ کر، اور پھر میں نے حد کر دی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کر کے ان بندوں کی طرف اپنا قاصد بنایا۔ بنانے والے کو دیکھو، بلانے والے کو دیکھو، اور جس کو بلایا جا رہا ہے اس کی حیثیت دیکھو اب اس کو مزید Pressurize کیا جائے اور اسے مجبور کیا جائے کہ ضرور مانو، فرمایا نہیں! اب اس سے پوچھا جائے گا کہ تمہاری حیثیت کیا تھی نہ ماننے کی! یعنی عین انصاف ہی یہ ہے کہ اب اس سے پوچھا جائے کہ تم کون ہوتے ہو نہ ماننے والے تو فرمایا وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ جس نے اللہ کی نافرمانی کی اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کی پروا نہ کی اور اللہ کی حدود کو روندتا ہوا چلا گیا۔ يُدْخِلْهُ نَارًا وہ تو جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور جہنم ہمارے تصورات سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہمارے علم وفہم اور ادراک سے بھی زیادہ ڈراؤنی ہے۔ اور جتنی بھی انسانی استعداد اور علم ہے، اس کی سمجھ سے زیادہ تکلیف دہ اور عذاب دہ ہے۔ آپ ایک بات سے اندازہ کیجیے کہ جہنم اپنے رہنے والوں کو اپنا اثر دنیا میں پہنچاتی ہے۔ کوئی بھی وہ شخص جسے ایمان نصیب نہیں ہے، کبھی اطمینان کا سانس نہیں لیتا۔ اس کے اندر جہنم کا اثر پہنچ رہا ہے۔ پوری کافر دنیا میں آپ پھر کے دیکھ لیجیے۔ بڑے بڑے سائنس دان، بڑے بڑے فلاسفر، بڑے بڑے ڈاکٹر بڑے بڑے انجینئر ہیں، لیکن جہنم ان کو بھگائے پھرتا ہے۔ انہیں نیند نہیں آتی، اکیلے بیٹھ نہیں سکتے، اور آج کے عالمِ کفر کا سب سے بڑا مرض ہے The Fear of Unknown جسے دیکھو وہ ڈرتا ہے۔ کیوں ڈرتے ہو؟ کہتا ہے کوئی پتہ نہیں کس سے ڈرتا ہوں، لیکن مجھے ڈر لگتا ہے۔ یہ جہنم کا خوف ہے جو ان کے تعاقب میں ہے۔ جسے وہ ٹریس (trace) نہیں کر پا رہے، جسے وہ سمجھ نہیں رہے۔ آج مغرب کی سوسائٹی میں سائی کیٹرسٹ (ماہر نفسیات) سب سے امیر ہے۔ وہ کرتے کیا ہیں۔ صرف کچھ مریض کی بات سنتے رہتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کوئی کسی کی بات سننے کا بھی روادار نہیں۔ اتنی فرصت بھی نہیں ہے کسی کے پاس کہ وہ دوسرے کی بات ہی سن لے۔ اور مجھے بہت افسوس اس وقت ہوتا ہے جب ہمارے مسلمان اور کلمہ گو کو بھی اسی مرض کا شکار دیکھتا ہوں۔ ان لوگوں کے پاس اپنے دین کو سمجھنے کی، اپنے رب کو یاد کرنے کی، اپنے نبی علیہ السلام کا اتباع کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ ان کو اس بیماری میں جو اللہ سے غفلت اور جہنم کے ساتھ تعلق کا نتیجہ ہے، مبتلا دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔

آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو لاعلاج امراض ہیں، یہ محض اتفاقاً پھوٹتے ہیں؟ یہ ایڈز اور یہ کینسر ویسے ہی آ جاتے ہیں؟ نہیں! یہ سب وہ پھل ہے جو اس معاشرے میں جہنم کے قرب کی وجہ سے، اور مسلسل سینکے جانے کی وجہ سے ان وجودوں میں یا خلیات میں پیدا ہوتے ہیں اور اس کا کوئی علاج نہیں سوائے توبہ کے۔ حیرت یہ ہوتی ہے کہ مسلمان اس دردناک معاشرے،

اس سارے جہنم زار میں جانے کے لیے اس لیے تیار بیٹھا ہے کہ وہاں دولت ملتی ہے۔ یہاں کسی سے کہہ دو، وہ گھر مکان زمین بیچ کر جانے کو تیار بیٹھا ہے۔ میرے جیسا بندہ آج کہہ دے کہ دس دس لاکھ دو، میں پچاس بندے لے جاؤں گا۔ شام تک پیسے یہاں جمع ہو جائیں گے۔ حالانکہ شرعاً یہ ہے کہ ایسے معاشرے میں اگر اسے اللہ نے یہ توفیق دی ہے کہ وہاں جا کر کسی کو دینی تبلیغ کر سکتا ہے یا کسی کو جہنم میں گرنے سے بچا سکتا ہے تو اس کے لئے جانا واجب ہے۔ اور جو یہ نہیں کر سکتا، اس کے لیے وہاں سے ہجرت کر کے آنا واجب ہے۔ فرض ہے اس پر کہ اس معاشرے کو چھوڑ دے اور اس معاشرے میں جا بسے جہاں کم از کم اس کا دین محفوظ ہو اور یہ بات فرشتے عندالموت پوچھتے ہیں۔ قران حکیم نے بتایا ہے کہ جب بندے کو موت آتی ہے تو فرشتہ کہتا ہے کہ تیرا دعویٰ کیا تھا؟ تیرے وجود پر تو کوئی ذرّہ نور ایمان کا یا عمل کا نظر نہیں آتا، کیا کرتا رہا؟ تو پھر لوگ کہتے ہیں **کُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِی الْاَرْضِ** (النساء:97) یار ہم تو غریب لوگ تھے اور ایسے معاشرے میں پھنس گئے تھے جہاں بڑے بڑے لوگ سارے بدکار تھے، عیاش تھے۔ ہم غریبوں کی کیا حیثیت تھی۔ ہم بھی ان جیسے رنگ میں رنگے گئے۔ تو فرشتہ ان سے کہتا ہے۔

اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا (النساء:97) اے اللہ کے بندے! اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی؟ آج جب تو ساری کائنات چھوڑ رہا ہے، اس وقت تو شہر اور ملک نہیں بدل سکتا تھا۔ جہاں تیرے لیے دین تھا، تو وہاں چلا جاتا۔ تو بے دینوں میں کیوں پھنسا رہا۔ **اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً** کیا اللہ کی زمین وسیع نہیں تھی **فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا** تو بدکار اور بے دین معاشرے کو چھوڑ کر دیندار ماحول کی طرف کیوں نہیں چلا گیا۔ یہاں معیار الٹ گئے ہیں۔ کسی کو اللہ کا نام سکھاؤ تو اس کے لیے دلائل دو لیکن اسے کلب لے جاؤ تو اس کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ یہاں ہمارے معیار کا آپ اندازہ کریں کسی کو آپ پکڑ کر سینما لے جائیں۔ تو مولوی اور واعظ سے لے کر اس کے گھر کے والدین اور، اعزہ و اقارب، تک آپ سے کوئی نہیں پوچھے کہ اسے سینما لے جانے کی آپ کے پاس کیا دلیل تھی؟ اسے کلب کیوں لے گئے؟ کلب لے جانے کی دلیل نہیں پوچھیں گے۔ بازار لے جانے، ہوٹل پر بیٹھنے کی کوئی دلیل نہیں پوچھیں گے۔ اسے آپ اللہ کا نام لینا سکھا دو، تو سب پوچھتے ہیں کیا دلیل ہے تمہارے پاس، کیوں لیتے ہو اللہ کا نام۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، یہ ساری دانشمندیاں ہیں؟ نہیں! یہ عذاب الٰہی کے مظاہر ہیں۔ یہ اللہ کی ناراضگی کے سبب ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرب کی طرف بلاؤ تو اس پر آپ کی شریعت جاگ اٹھتی ہے یعنی کیا خوب شریعت کا مصرف نکالا۔

کل مجھے ایک خط آیا کہ ہمارے مولوی صاحب کہتے ہیں کہ اس طریقے سے ذکر کرنا صحیح نہیں ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ ان سے کہو کہ وہ جس طریقے سے صحیح سمجھتے ہیں، اس طریقے سے کرتے رہیں۔ لیکن یہ کیا طریقہ ہے کہ خود بھی نہیں کرتے اور ہمیں بھی روکتے ہیں، یہ تو کوئی طریقہ نہیں۔ اگر وہ خود کرتے ہی نہیں جب کہ قرآن میں کرنے کا حکم موجود ہے تو یہ سوال کرنا کہ کیا یہ سنت سے ثابت ہے، یہ خود جہالت ہے۔ جس کام کا براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرنے کا حکم دیا گیا

ہے قرآن میں وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ (المزمل:8) اس میں خطاب ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کہ اپنے رب کے ذاتی نام کی تکرار کیجیے۔ اب کوئی کہے کہ ثابت کرو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ثابت کرو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پر عمل کرتے تھے؟ یہ تو بجائے خود گستاخی ہے۔ اب اگر کوئی نہیں کرتا تو اس کا معاملہ اس کے رب کے ساتھ ہے، لیکن جو کرتا ہے اسے روکنے کا اسے کیا حق حاصل ہے۔ جب کہ وہ کسی کو سینما جانے سے نہیں روکتا، کلب جانے سے نہیں روکتا، دیار مغرب میں جانے سے نہیں روکتا، ڈانس کرنے سے نہیں روکتا۔ کیا یہ مسلمانوں کی بیٹیاں نہیں ہیں جو ٹی وی پر ڈانس کرتی ہیں، گانے گاتی ہیں۔ یہ اسی فیصد بلکہ نوے پچانوے فیصد ٹیلی ویژن کے پروگرام جو ہیں اس میں ساری خواتین بچیاں اور بیٹیاں ہی ہوتی ہیں۔ کوئی اداکاری کر رہی ہوتی ہے، کوئی گانا گا رہی ہے اور کوئی ڈانس کر رہی ہے۔ کبھی کسی نے دلیل پوچھنے کی زحمت کی کہ اس کی کیا دلیل ہے۔ صرف اس بات کی دلیل چاہیے کہ اللہ کا نام کیوں لیتے ہو۔ یہ فطرت میں جو تبدیلیاں ہیں، یہ جہنم کی تپش سے پیدا ہوتی ہیں۔ یہ جلنے کے آثار ہیں جیسے کوئی کھانا جب جلنے لگتا ہے تو وہ مختلف قسم کی ناگوار بوئیں چھوڑتا ہے۔ انسانی ضمیر جب جلنے لگتا ہے تو اس قسم کے ناگوار اعتراضات جنم لیتے ہیں۔ اور جہنم اتنی سخت ہے کہ اس کی طرف ایک قدم چلو تو اس کی تپش دنیا میں محسوس ہوتی ہے۔ تو پھر اندازہ کر لو ان کا کیا حال ہوگا جنہیں اس میں جانا اور وہاں رہنا ہے۔

فرمایا کہ اللہ کی اطاعت کو چھوڑ نا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی نہ کرنا، یہ معمولی بات نہیں ہے۔ جہاں نافرمانی ہے اللہ کی، جہاں نافرمانی ہے اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی، وہاں اس انسانی عظمت کا ضیاع بھی ہے جس عظمت کے لیے ساری کائنات انسان کی نوکری کر رہی ہے، اس کی خدمت کر رہی ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے ایک لقمہ کھایا لیکن ایک پورا نظام اتنی گردش کرتا ہے کہ کہیں کوئی ذرہ چاول بنا، کہیں کوئی ذرہ گنا بنا پھر اس سے رس نکلا تو وہ چینی بنی، کہیں کوئی ذرہ ایک تنکا بنا کسی جانور نے چرا پھر اس کے پیٹ میں دودھ اور وہ دودھ سے مکھن اور گھی بنا کتنی منڈیوں میں گھوما۔ پتہ نہیں کتنے سال پہلے چلایا ہوا قدرت کا ایک ذرہ آج شام کی افطاری میں میرا مقدر بنتا ہے۔ اس پر کتنا پہلے پیچھے کام ہوا، اس کو ہم کبھی نہیں دیکھتے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بس ایک لقمہ کھایا۔ کتنے ذرات کتنے ایٹم استعمال ہوئے دال میں، سبزی میں، مرچوں میں، نمک بننے میں، یہ ساری مادے کے ذرات (Atoms) کی مختلف صورتیں ہیں۔ ان کو کہاں کہاں کس کس بھٹی میں تپایا گیا، کتنا وقت لگا۔ ایک چٹان کو نمک میں تبدیل ہونے میں کتنا وقت لگا، اور کتنا وقت لگا اس ایک چاول کے دانے میں وہ ذرات سموئے جانے میں جو تمہارے یا میرے بدن کا حصہ بننے تھے۔ دوسرا بندہ اس دانے کو نہیں کھا سکتا۔ وہ ذرات جو والد کے پیٹ میں جا کر تقسیم ہوتے ہیں کہ پیدا ہونے والے کے ذرات والد کے صلب میں چلے جاتے ہیں، والد کا گوشت اور ہڈی نہیں بنتے۔ وہ قادر مطلق دوسروں کے ساتھ مکس (Mix) نہیں ہونے دیتا۔ یعنی ہم جو ایک لقمہ کھاتے ہیں، اس کے پیچھے کارگاہِ حیات کا کتنا نظام سرگرم عمل ہوتا ہے۔ اتنی بڑی خدمت اللہ کی کائنات ادا کر رہی ہے اور آدمی کی کتنی بڑی عظمت ہے، کتنی حرمت ہے کہ کافر

بھی ہو جائے تو اس کی توہین کرنے کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔ اس کی دل آزاری کی اجازت نہیں دی۔ اسے بے آبرو کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس سے مال چھیننے کی اجازت نہیں دی اسے ناحق قتل کرنے کی اجازت نہیں دی کہ انسان ہے، کافر بھی ہو جائے تو اس کی انسانی عظمت بحال رکھی ہے۔ رب کتنا کریم ہے اور پھر مرتے دم تک واپسی کا دروازہ اس پر کھلا رکھا ہے۔ فرعون بن جائے تو اس کے پاس بھی نبی بھیجتا ہے کہ بس کر اپنی حیثیت میں رہ۔ چھوڑ دے اس اکڑ کو آ جا واپس۔ پھر بھی آدمی واپس نہ آئے تو پھر وہ جہنم میں نہ جائے تو کہاں جانا چاہیے۔

فرمایا یہ معمولی بات نہیں ہے کہ لوگ کہہ دیتے ہیں کہ جی فرصت نہیں ہے۔ جی تو چاہتا ہے نماز پڑھیں پر فرصت ہی نہیں ملتی۔ دل تو چاہتا ہے ہم بھی قرآن سیکھیں پر فرصت ہی نہیں ملتی۔ دل تو چاہتا تھا کہ ہم بھی درود شریف پڑھتے، ہم بھی روزہ رکھتے پر فرصت نہیں ملتی۔ جس دن فرصت ہوگی اس دن کچھ کر لیں گے۔ فرصت تو تب ہی ہوگی جب تو دنیا سے اٹھ جاؤ گے۔ وہ وقت کرنے کا نہیں، وہ وقت تو بتانے کا وقت ہوگا کہ کیا کیا۔ تو اللہ اتنا کریم ہے۔ فرماتا ہے کھاؤ لیکن اس طرح سے کھاؤ جس طرح میں کہوں۔ وہ چیز کھاؤ جس کے کھانے کی اجازت دے دوں۔ جس سے روکوں اس سے رک جاؤ۔ اب آدمی یہ بھی نہ کرے تو اس سے بڑی گستاخی کیا ہوگی۔ اور عبادات صرف رشتہ مضبوط کرنے کا سبب ہیں کہ عمل کی توفیق آسان ہو جائے۔ ہر سجدہ اللہ سے قریب تر کر دیتا ہے۔ یہ سجدے بیکار نہیں ہیں، یہ مصیبت نہیں ہیں، یہ کوئی غیر ضروری بوجھ نہیں ہیں بلکہ یہ بندے اور اس کے پروردگار کے درمیان فاصلوں کو کم کرتے ہیں۔ وہ تو قریب ہے، ہم دور چلے جاتے ہیں۔ جب اس کی بات ہوتی ہے، وہ کہتا ہے **نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ** (ق:١٦)

حضرت رحمۃ اللہ علیہ ایک شعر پڑھا کرتے تھے:

تو فگندی تیر فکرت رابعید   نحن او رب گفت من حبل الورید

اس نے تو تیری شاہ رگ سے بھی قریب ہونے کا اعلان کر دیا تیری فکر کے تیر دور دوسری چیزوں کی طرف چلے گئے ہیں تیری نگاہ بھٹک رہی ہے اور تو اس کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں پار ہا وہ تو تیرے قریب تر ہے۔ اس آیت میں یہ سبق دیا گیا ہے کہ دیکھو خالی دوزخ نہیں ہوگی **وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ** لوگوں کو دوزخیوں میں بھی ذلیل اور رسوا کیا جائے گا جو یہاں اللہ کی اطاعت اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو اپنی کسر شان سمجھتے ہیں اور نافرمانی پر فخر کرتے ہیں اور کفر پر بضد ہیں، انہیں صرف جہنم کے عذاب ہی نہیں، عذاب مھین ذلت آمیز جہنم کے عذابوں سے گزرنا پڑے گا۔ اللہ کریم اس سے اپنی پناہ میں رکھے دین کی سمجھ اور توفیق عمل عطا فرمائے۔

مزید تفصیل کے لئے ان آیات کی تفسیر کا مطالعہ اسرار التنزیل اور اکرم التفاسیر میں دیکھئے۔

☆ ☆ ☆

سبق نمبر۱۵: سورۃ المومنون

آیت نمبر: ۱ تا ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم کرنے والے ہیں

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ

بے شک ایمان والے کامیاب ہوئے۔ جو اپنی نماز میں عجز و نیاز

خٰشِعُوْنَ ۝۲ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝۳

کرنے والے ہیں۔ اور جو بے ہودہ باتوں سے منہ موڑتے رہتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝۴ وَالَّذِيْنَ هُمْ

اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اور جو اپنی

لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ

شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں یا

مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝۶ فَمَنِ

کنیزوں سے (مباشرت کرنے میں) پس یقیناً (اس میں) ان پر کوئی الزام نہیں۔ پھر جو

ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝۷ وَ

اس کے علاوہ (اس کام کا) طلب گار ہو سو ایسے لوگ حد (شرعی) سے نکلنے والے ہیں۔ اور

الَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸ وَ

جو لوگ اپنی (سپرد کی گئی) امانتوں اور اپنے وعدوں کا خیال رکھتے ہیں۔ اور

الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝٩ اُولٰٓئِكَ هُمُ

جو لوگ اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔ یہی لوگ

الْوٰرِثُوْنَ ۝١٠ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا

وارث ہیں۔ جو فردوس کے وارث ہوں گے (اور) وہ اس میں

خٰلِدُوْنَ ۝١١

ہمیشہ رہیں گے۔

اسلام کوئی ایسا فلسفہ نہیں رکھتا جس سے وہ دنیا کی زندگی ماحول اور معاشرے سے الگ کر کے انسان کا سارا رخ آخرت کی طرف پھیر دے۔ پہلے مذاہب میں ایسا تھا۔ بعض مذاہب ایسے بھی تھے جن میں یہ فخر کی بات تھی کہ کوئی نذر مانتا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کو نذر کے طور پر مسجد کو دے دیا گیا۔ حضرت مریمؑ کی والدہ نے نذر مانی تھی کہ جو بھی اولاد ہوگی، اس کو مسجد کا خادم بنا دیں گے۔ یہ باتیں پہلی امتوں میں عبادت سمجھی جاتی تھیں۔ کوئی بات نہ کرنے کا روزہ رکھ لیتا کہ میں مہینہ بھر بات نہیں کروں گا۔ یا چپ رہوں گا یا لوگ اور گوشہ نشینی اختیار کر لیتے یا جنگلوں اور ویرانوں میں چلے جاتے، وہاں زندگی گزارتے اور آخرت کی طرف متوجہ رہتے۔ اسلام چونکہ پوری انسانیت کا مذہب ہے اور ہمیشہ کے لیے تھا وہ مذاہب وقتی تھے اور خاص قوموں کے لیے تھے۔ اسلام میں اور دیگر مذاہب میں ایک بہت بڑا فرق ہے کہ پہلے مذاہب چونکہ مخصوص قوموں، مخصوص علاقوں اور مخصوص اوقات کے لیے تھے، اس وقت ان لوگوں کی ضرورت شاید یہ بھی رہی ہو کہ وہ تنہائی میں گوشہ نشینی میں زیادہ استفادہ کر لیں۔ چپ کا روزہ رکھ کے کچھ کما لیں، اسلام چونکہ پوری انسانیت کے لیے ہے۔ ہمیشہ کے لیے، سارے زمانوں کے لیے ہے۔ اسلام میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ تعمیرِ آخرت کا ہر کام اپنے دو پہلو رکھتا ہے۔ ایک تو اس سے آخرت بہتر ہوتی ہے اور دوسرا اس سے معاشرے کی تطہیر کا کام بھی ہوتا ہے اور ایک خوبصورت معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ ہماری آج کی قومی سطح پر جو ناکامیاں ہیں، ان کا سبب ہی یہ ہے کہ ہم یکطرفہ ہو گئے ہیں۔ جو معاشرے کی تشکیل میں لگے ہیں وہ دین سے واقف نہیں۔ وہ اپنی پسند کے کام کرتے ہیں۔ اور جنہوں نے دین سیکھا انہوں نے معاشرے کی تشکیل سے اپنے آپ کو الگ کر لیا۔ اور مساجد اور معابد میں بیٹھ گئے اور معاشرے کے فیلڈ ورک (feeld work) سے اپنے آپ کو الگ کر لیا۔ یہ ہماری کمزوری کا سبب بن گیا۔ تو یہاں فنا فی اللہ کی اور اللہ کا بندہ بننے کی بات ہو رہی تھی تو ان کا تعارف تھوڑا اس طرح بھی کرا

دیا کہ وہ صرف جنت کے مکیں نہیں ہیں بلکہ جب وہ دنیا میں ہوتے ہیں تو انکے دم قدم سے دنیا میں بھی بہار ہوتی ہے۔ معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے اور انسان اور انسانی معاشرے کو ان سے بے پناہ فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ خواہشات و منکرات ختم ہوتی ہیں اور نیکی پھیلتی ہے۔ تکلیف دہ چیزیں ہٹتی ہیں اور آرام دہ باتیں رواج پاتی ہیں۔ تو یہاں ان کا ذکر ہو رہا تھا فرمایا **قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ**۔ کامیاب تو وہی ایمان والے ہوئے **اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ**۔ سب سے پہلی بات ان کی یہ ہے کہ ان کی عبادت کوئی رسم نہیں، بوجھ نہیں، ایک علامت نہیں رہی کہ وہ مسلمان ہیں اور وہ گلے پڑی ہوئی ہے۔ اور ہمیں ضرور عبادت کرنی ہے، نہیں! بلکہ انہیں اب اس عبادت میں لطف آنے لگا ہے۔ خشوع آنے لگا ہے اور اللہ کا حضور نصیب ہونے لگا ہے۔ وہ عبادت اس لیے نہیں کرتے کہ ان پر کوئی بیگار ڈال دی گئی ہے بلکہ وہ اس لیے عبادت کرتے ہیں ہیں کہ ہر سجدہ اک نئی کیفیت دے جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ فنا فی اللہ کا اظہار قبر میں جا کر یا موت کے بعد ہی ہوگا بلکہ اللہ کا بندہ بننے سے دنیوی زندگی پر دنیوی محسوسات پر اور انسانی (Feelings) پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ **هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ** ان عبادات میں ان کا دل لگتا ہے۔ خشوع ہوتا ہے دل کا وہ حال کہ دل کسی لذت میں کھو جائے۔ اتنا کھو جائے کہ بندے کو اس کے ظاہر سے بیگانہ کر دے۔ اہل اللہ میں، تابعین میں، تبع تابعین میں، اکابر صحابہؓ میں، ایسے بے شمار واقعات ملتے ہیں کہ حضرت زین العابدین رحمتہ اللہ علیہ کے بارے میں ملتا ہے کہ وہ ایک مسجد میں عبادت کر رہے تھے کے ایک کونے میں آگ لگ گئی۔ لوگوں نے شور و واویلا کیا۔ پانی لائے اور اس آگ کو بجھایا۔ جب آپؒ نماز سے فارغ ہوئے تو پوچھا کہ شور کیسا تھا؟ لوگوں نے بتایا کہ حضرت آگ لگ گئی تھی۔ انہیں پتہ ہی نہیں چلا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک مرتبہ تیر لگا وہ ایسی جگہ پہ تھا کہ اگر اس کو کھینچتے تو تکلیف ہوتی۔ کسی پٹھے میں یا کسی ہڈی کے حصے میں گھس گیا۔ جب نکالنے کا ارادہ کیا گیا تو ایک صحابیؓ نے کہا کہ انہیں نماز شروع کرنے دو جب نماز میں ہوں گے تو یہ نکال لیں گے اور واقعی جب وہ نماز میں تھے تو انہوں نے جھٹکا مار کر نکال لیا اور وہ نماز ادا کرتے رہے۔ نماز کے بعد پوچھا کہ وہ تیر کیا ہوا۔ کہنے لگے کہ نکال لیا گیا ہے۔ تو یہ ایک کیفیت ہوئی۔ چلو اتنی نہ سہی لیکن کم از کم اتنی تو ہو کہ نماز اور عبادت بوجھ نہ رہے اور اس کو بیگار سمجھنا کہ ہم تو اس مصیبت میں پھنس گئے۔ بھاگتے دوڑتے آئے۔ وضو کیا آدھے اعضاء گیلے آدھے خشک، جلدی جلدی ٹھونگیں ماریں، اٹھے بیٹھے اور بھاگ گئے، یہ ایمان کی نشانی نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سب سے برا چور وہ ہے۔ جو نماز کا چور ہے۔ پوچھا گیا کہ نماز میں بھی چوری ہوتی ہے؟ تو فرمایا ارکان پورے ادا نہ کرنا، بھاگتے دوڑتے آنا، سجدے قیام و رکوع کے حقوق ادا نہ کرنا، تو یہ نماز میں چوری ہے۔ یہاں ارشاد ہوتا ہے کہ فنا فی اللہ یا ایمان دار یا ایمان والے۔ (میں ترجمہ بامحاورہ کر رہا ہوں اس لیے کسی کو یہ نہ ہو کہ لفظ کچھ اور ہے اور ترجمہ کچھ اور۔ میں محاوراتی زبان میں بات کر رہا ہوں کہ محاورے میں ایمان دار اسی کو کہیں گے جسے اللہ کے ساتھ فنا نصیب ہو۔) تو ایسے لوگ وہ ہیں کہ انہیں عبادت میں ایک کیفیت محسوس ہوتی ہے اور ان کا جی چاہتا ہے کہ

نماز پڑھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مومن جب ایک نماز سے فارغ ہوتا ہے تو اس کو دوسری نماز کا انتظار رہتا ہے۔ یہ کیفیت عنداللہ اسے کبھی نماز سے فارغ نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس طلب کے صدقے اس کو اس حال میں لکھتے جاؤ کہ یہ نماز ہی پڑھتا جا رہا ہے۔ یہی بات صحابہؓ کے متعلق ارشاد ہوئی کہ **تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا** (الفتح:29) کہ اے مخاطب تو جب بھی انہیں دیکھے تو وہ رکوع یا سجود میں ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہ دنیا کے سارے کام کرتے تھے۔ لیکن ہر سجدے میں یہ تڑپ رہتی تھی کہ کب اگلے سجدے کا وقت آئے۔ **وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ** یہ دونوں باتیں جمع نہیں ہوسکتیں کہ اللہ کا حضور بھی نصیب ہو اور فضولیات کی طرف بھی توجہ ہو لہذا وہ خرافات سے کٹ جاتے ہیں۔ بے فائدہ اور لغو کام اسے کہتے ہیں جس کام پہ سرمایہ بھی لگے، وقت بھی لگے، محنت بھی لگے اور اس کا حاصل کچھ بھی نہ ہو۔ اس میں سرمایہ لگاؤ تو اس کا ضیاع، محنت لگاؤ تو اس کا ضیاع اور وقت لگاؤ تو اس کا ضیاع۔ جیسے آپ نے بٹیر لڑا دیا۔ آپ اس کے ساتھ محنت کرتے رہے ،آپ اس کے ساتھ راتوں کو جاگتے رہے، اب اس کو تیار کیا۔ اب بٹیر لڑا تو کیا طوفان آ گیا۔ بھئی اگر بٹیر نہ لڑتا تو کیا ہوتا۔ اتنی محنت اگر آپ کسی انسان کی تعمیر پر لگاتے۔ کسی بچے کو پڑھانے پر لگاتے، کسی بیمار کے علاج پر لگاتے تو کتنا تعمیری کام ہوسکتا تھا۔ تو سرمایہ، وقت یا محنت جو کسی ایسے کام پر لگا دی جائے جس کا حاصل کچھ نہ ہو وہ لغو ہوگا۔ فرمایا کہ جنہیں اپنے اللہ سے تعلق نصیب ہوتا ہے وہ ایسے لاحاصل اور لغو کاموں پر اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۔ وہ دنیا میں دولت تو کماتے ہیں لیکن دولت کی محبت کے اسیر نہیں ہوتے۔ زکوٰۃ پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ ایک ایسا فعل ہے کہ جو دولت کی محبت کو دل میں جاگزیں نہیں ہونے دیتا۔ انسان محنت کر کے، کوشش کر کے دن رات لگا کر کماتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو حصہ غرباء کا رکھا ہے، اس کو اپنی دیانت سے الگ کر کے دے دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اس دولت کی نسبت اس کے حکم کا زیادہ شیدائی ہے تو فرمایا جنہیں اللہ کے ساتھ مضبوط رشتۂ ایمان نصیب ہوتا ہے وہ دولت کی محبت کے اسیر نہیں ہوتے بلکہ دولت کو اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔ مال و دولت کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا بھی ایک بات ہے لیکن سب سے مضبوط جذبہ منجملہ حیوانوں میں اور انسانوں میں شہوت ہے۔ بندہ نوافل بھی پڑھ سکتا ہے۔ بندہ خیرات بھی کرسکتا ہے لیکن جنس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ اچھا بھلا شریف آدمی اس میں ملوث ہو جاتا ہے۔ کافر معاشرے کی تو بات نہ کریں وہ تو (Sex Free) معاشرہ ہو گیا ہے۔ جس طرح جنگلوں میں خنزیر بستے ہیں، جنس کے اعتبار سے کافر معاشرے کا وہی حال ہے۔ ہندو معاشرے میں جنس کو عبادت کا درجہ حاصل ہے اور اسی طرح اسلام کے نام پر شیعیت کی جو تحریک چلی اس میں بھی جنس کو عبادت کا درجہ دے دیا گیا۔ اس لیے کہ اس جذبے میں اتنی طاقت ہے کہ باقی تمام ایمان کے تقاضوں کو یہ مجروح اور پامال کرسکتا ہے۔ جتنے لوگوں نے بھی، جتنے باطل مذاہب نے بھی اور جتنے فرقوں نے بھی بندوں کو اللہ سے دور کرنا چاہا انہوں نے یا جنس کی آزادی دے دی جیسا کہ اہل

مغرب نے، اور جو ان سے بھی بدتر ہو گئے، اور آگے نکلے انہوں نے جنس کو عبادت قرار دے دیا اور یہ ایک بہت بڑا ظلم ہے جو اسلام اور مسلمان کے ساتھ ہی نہیں بلکہ انسانیت کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ اس لیے اسلام نے جنس پر کوئی دیوار نہیں کھڑی کر دی اور جنسی تقاضے پورے کرنے سے روکا نہیں بلکہ ان کو ایک خوبصورت رخ دے دیا ہے۔ جنس وہ جذبہ ہے جو جہاں سب سے زیادہ بندے کو مغلوب کرتا ہے وہاں سب سے زیادہ رقابت اور دشمنی بھی پیدا کرتا ہے۔ ایک بندے کی جنس کی تکمیل دوسرے کی آبرو کا اجڑنا ہوتا ہے۔ ایک بندے کی خواہش کا پورا ہونا دوسرے کی تباہی ہوتا ہے۔ ایک بندہ بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے آپ کو اللہ کا رسول مانا۔ اللہ کو وحدہ لاشریک مانا۔ نماز روزہ عبادات اور ساری اطاعت کروں گا لیکن مجھے خواتین کے معاملے میں آزادی دے دیں۔ اور میں چونکہ عورتوں کا بڑا شیدائی ہوں لہٰذا مجھ پر یہ پابندی نہ لگائی جائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو برداشت کرتا ہے کہ تیری ماں، تیری بیوی، تیری بہن یا تیری بیٹی کے ساتھ کوئی دوسرا بندہ ملے۔ کہنے لگا کہ یا رسول اللہ یہ تو میرے لیے ممکن نہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ تو جو دوسروں کے لیے اجازت لینا چاہتا ہے تو یہ دوسروں کے لیے کیسے ممکن ہوگا۔ اجازت کا مطلب تو یہ ہے کہ تو دوسروں کی عزت سے کھیلے۔ کہنے لگا کہ مجھے بات سمجھ آ گئی کہ جنس کی تکمیل صرف یہ نہیں کہ ایک شخص کی صرف خواہش پوری ہو جائے بلکہ دوسرے کی آبرو کا مسئلہ ہوتا ہے جس پر وہ مرمٹنا چاہتا ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ مغرب کی (Sex Free) سوسائٹی میں بھی لوگ اس پر لڑتے ہیں۔ انسانی مزاج تو اپنی جگہ ہے۔ اسلام نے اس میں ایسی خوبصورت تبدیلی کی کہ شرعی نکتۂ نظر سے جب کوئی نکاح کرتا ہے تو بجائے دشمنی کے محبتیں بڑھتی ہیں۔ یعنی وہ جذبہ جو انسانیت میں اور انسانوں میں دشمنی کا سبب تھا اور قتل و غارت گری کا سبب تھا اور سب سے بڑا جھگڑے اور فساد کا جو سبب تھا اسے بھی محبتوں کا امین بنا دیا۔ کسی کی جنس پر قدغن نہیں لگائی تا کہ جنسی جذبے کی تسکین بھی ہو اور معاشرے میں محبت بھی بڑھے۔ اس سے دوستیاں قائم ہوں اور تعلقات بڑھیں۔ تو کتنی خوبصورت تبدیلی کی ہے۔ فرمایا کہ اللہ کے بندے تو وہ ہوتے ہیں جو جنسی جذبات پر بھی قابو رکھتے ہیں اور ان کو اس طریقے سے پورا کرتے ہیں جس طریقے سے پورا کرنے کی اللہ نے اجازت دی ہے۔ اور یہی مفہوم بنے گا اس آیت کا کہ **وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ O اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ** ان جائز ذرائع سے بڑھ کر اگر کوئی چاہے **فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ** اللہ سے بغاوت کرنے والا ہوگا وہ اللہ کا بندہ نہیں ہوگا۔ پھر وہ اللہ کا باغی ہوگا حدود کو توڑنے والا ہوگا پھر وہ حدود سے تجاوز کرنے والا ہوگا۔ یہاں ضمناً ایک بات آ گئی شاید ہمارے کسی اور سبق میں نہ آئے کہ یہاں اللہ تعالیٰ ازواج (منکوحہ عورتیں) اور **مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ** (جو ان کی کنیزیں اور غلام ہیں) مغرب میں اس بات پر بڑا طنز کیا جاتا ہے کہ اسلام نے غلاموں اور لونڈیوں کو رواج دیا ہے کہ لونڈیاں مالک کے لیے بغیر نکاح کے حلال کر دی ہیں۔ یہ بڑا ظلم ہے۔ زیادتی یہ ہے کہ یہ جانے بغیر کہ کوئی غلام یا لونڈی کیسے بنتا ہے۔

غلام قبل اسلام بھی تھے۔ لونڈیاں قبل اسلام بھی تھیں۔ وہ غلام یا لونڈی بنانے کا طریقہ سادہ سا تھا۔ ہر طاقتور غریب کی بیٹی اٹھا لیتا۔ ہر طاقتور غریب کا بیٹا اٹھا لیتا اسے بیچ دیتا۔ وہ لونڈی اور غلام بن جاتے۔ اسلام نے جو تصور دیا، اس میں نام کی مماثلت آ گئی لیکن اسلام نے ان لوگوں کو جو دینِ حق کے خلاف میدان جنگ میں صف آراء ہوئے اور وہاں شکست کھاتے، انہیں یہ سزا دی کہ ان کی آزادی سلب کر دی۔ ان کے بیوی بچوں کو یہ سزا دی کہ ان کی آزادی سلب کر دی۔ اب جو میدانِ جنگ میں مارے گئے ان کی بیویاں قید ہوئیں تو کنیزیں بن گئیں اور جو میدانِ جنگ میں گرفتار ہوئے ان کی آزادی سلب کر لی اور ان کو غلام بنا لیا۔ اس کا موازنہ اگر اقوامِ عالم کے ساتھ کریں تو جب دوسری قوموں کے سامنے میدان جنگ میں کوئی شکست کھاتا ہے تو شکست کھانے والے بندے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ اس کے خاندان کا کیا حشر ہوتا ہے۔ اس کا گھر کیسے اجاڑا جاتا ہے۔ ان شہروں کا کیا حشر ہوتا ہے اور کس طرح آبروریزی کی جاتی ہے، ان مظلوم خواتین کی جو میدانِ جنگ میں شکست کھائے والوں کے گھروں میں بھی بیٹھی ہوئی ہاتھ آ جاتی ہیں۔ پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لی جائے۔ آج سے نہیں، جب سے یہ معمورۂ عالم آباد ہے، کافروں کی فتوحات کے حالات پڑھیے اور پھر دیکھیے کہ اسلام نے اتنے بڑے جرم کی سزا کیا دی ہے محض اس بندے کی آزادی سلب کر لی ہے اور اس عورت کی آزادی سلب کر کے ایک وقت میں ایک مرد کے لیے حلال کی ہے۔ ایک وقت میں کوئی کنیز سب مسلمانوں پر حلال نہیں ہے۔ اگر اسے بھی جابرانہ سزا کہا جائے تو انصاف کہاں ملے گا؟ کیا وہ انصاف ہے جو کافر طاقتیں آج کشمیر میں کر رہی ہیں؟ کیا جو بوسنیا میں یا فلسطین میں یا دنیا کے دوسرے حصوں میں ہو رہا ہے، یہ انصاف ہے؟ اسلام نے ہر طاقتور کو یہ اجازت نہیں دی کہ کسی کمزور کو پکڑ کر غلام بنا لے بلکہ جنہیں غلام بنایا انہیں ان کے انسانی حقوق دیے۔ کسی غلام یا کنیز کو مذہب تبدیل کرنے پر نہ مجبور کیا گیا اور نہ تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مدینۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں رہ کر غلاموں نے بتوں کی پوجا کی، آگ کی پوجا کی اور کسی نے ان کو منع نہیں کیا۔ اسلام نے انسانی حقوق غلام کو بھی دیے کہ جو خود کھاتے ہو وہ غلام کو بھی کھلاؤ، جو تم خود جانتے ہو غلام کو بھی سکھاؤ، اور جو کام وہ نہیں کر سکتا اس کا اسے حکم بھی نہ دو اور اگر کوئی خطا ہو جائے تو غلاموں کو آزاد کرو۔ اللہ اس سے بہت راضی ہوتا ہے حالانکہ صرف اسلام ہے کہ جس کی تاریخ میں موجود ہے کہ جنگی قیدی آئے غلام بنائے گئے اور تربیت پا کر مسلمان ہوئے اور مسلمانوں کے پیشوا بنے امام بنے، اولیاء اللہ بنے، حکمران بنے، بادشاہ بنے۔ خود اس برصغیر میں خاندانِ غلاماں کی تاریخ صرف مسلمانوں کے پاس ہے اور کسی قوم کے پاس دکھائیے؟ اس پر بھی اسلام کو اور مسلمانوں کو الزام دیا جاتا ہے۔ تُف تو ان مسلمانوں پر ہے جنہوں نے اس کو جاننے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی اور مغرب کے درندوں کو جواب دینا ضروری ہی نہیں جانا۔ کم از کم مسلمان کو تو یہ جاننا چاہیے تھا کہ اسلام کیسے غلام اور کنیزیں بناتا ہے اور ان کی حدود و قیود کیا ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے جنسی جذبے کی جائز طریقے سے تکمیل کی اجازت ہی نہیں دی بلکہ فرمایا ہے کہ ان سے تو محبتیں بڑھتی

ہیں، رشتے داریاں بڑھتی ہیں۔ تعلقات بڑھتے ہیں اور معاشرے کی تعمیر ہوتی ہے۔ اگر کوئی ان حدوں کو توڑے تو وہ اللہ کا بندہ نہیں ہے، اللہ کا باغی ہے، زیادتی کرنے والا ہے۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ وہ لوگ جو اپنے عہد اور امانت کی پاسداری کرتے ہیں۔ سب سے بڑا عہد تو اللہ سے ہے لا الٰہ الا اللّٰہ دوسرا عہد ہے اللہ کے رسول سے۔ محمد رسول اللّٰہ۔ سب سے بڑا عہد بندے کا اللہ تعالیٰ سے ہے کہ وہ اس عہد کی پاسداری کرے۔ جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وعدہ کر کے پورا نہیں کرتا اس پر اعتبار کرنا اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ وہ کوئی جھوٹ بھی بول سکتا ہے اور کوئی بد دیانتی بھی کر سکتا ہے۔ لیکن اللہ کے بندے وہ ہوتے ہیں جو نہ صرف اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کی پاسداری کرتے ہیں بلکہ کسی بندے سے بھی وعدہ کر لیں تو حتی الامکان اس کو ایفاء کرتے ہیں اور ان کے پاس امانت رکھی جائے تو امانت داری کا حق ادا کرتے ہیں۔ وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَوٰتِهِمْ یُحَافِظُوْنَ وہ لوگ جو اللہ کی عبادت کے قیام اور بقاء کا سبب بن جاتے ہیں اور دوسروں کو عبادت کا قائل کرتے ہیں۔ دوسروں کو عبادت کا طریقہ سکھاتے ہیں دوسروں کے جذبات میں عبادات کی لذات سمو دیتے ہیں۔ اللہ کی عبادت پر حفاظت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو عبادت کرنا سکھایا جائے اور اس پر معلومات فراہم کی جائیں اور اس کے فوائد بتائے جائیں اور اس کے نہ کرنے کے نقصانات سے آگاہ کیا جائے۔ اور سب سے کمال درجہ یہ ہے کہ کسی میں اس کی کیفیات سمو دی جائیں۔ کبھی اگر اس کی نماز چھوٹے تو اس کا درد اس کو محسوس ہو۔ اور وہ سجدہ کرے تو اس کی لذت اور انوارات اس کو محسوس ہوں۔ یہ سب سے بڑا مقام اور درجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اتنی عبادت کی توفیق نصیب کرے تو گویا وہ اللہ کی عبادت کی چوکیداری کرتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ الَّذِیْنَ یَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ۔ گویا جنت ایسے لوگوں کی میراث ہے۔ جس طرح والدین کی وراثت کے بارے میں کسی کے اچک لینے کی فکر کسی کو نہیں ہوتی، اس طرح یہ لوگ جن میں مندرجہ بالا خصوصیات پائی جاتی ہیں، اللہ کے بندے اللہ سے ایمان رکھتے ہیں، اللہ کی عبادات میں لذت پاتے ہیں، فضولیات سے اجتناب کرتے ہیں، مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اپنے جنسی جذبے تک کو اللہ کے احکام کے تابع کر دیتے ہیں اور اپنے کئے گئے وعدوں کو پورا کرتے ہیں اور اللہ کی عبادت کے محافظ اور ان کے چوکیدار بن جاتے ہیں۔ یہی لوگ جنت کے وارث ہیں۔ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ جنت کا کمال ہے کہ داخل ہونے والوں کو کبھی اس سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ جنت جنہیں نصیب ہوگی ان کا داخلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہوگا۔ ابدالآباد تک کے لیے ہوگا وہ زندگی دائمی ہے۔ ابدی ہے۔ نہ وہ زندگی ختم ہوگی نہ جنت کی رہائش ختم ہوگی اور نہ وہ نعمتیں، بلکہ ہر لمحے ان میں ترقی ہوتی رہے گی۔ تو یہ ہے وہ صحیح راستہ جس پر چلنے کی وجہ سے نہ صرف جنت نصیب ہوگی بلکہ اسلام نے اس کو معاشرے کی عمدہ تعمیر کا ذریعہ بھی بنادیا۔ اور جب تک انسان اسلامی احکام پر عمل نہیں کرے گا وہ دنیا میں کبھی سکھی نہیں رہ سکتا۔ اس کی بڑی مثال یہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ اس معاشرے کو چھوڑیں، ہم کیا اور ہمارا معاشرہ کیا۔ چلیں اہل مغرب کے معاشرے میں۔ تو جو خوبی اس

معاشرے کی آپ کو نظر آئے گی، وہ خوبی انہوں نے اسلام سے لی ہے۔ یعنی قوم سے وفا کرو حکومت سے بد دیانتی نہ کرو، قومی مفادات کی نگہداشت کرو۔ امانت داری کا حکم کس نے دیا۔ اور جس وقت یہ سبق سکھایا جا رہا تھا تو اس وقت یہ لوگ جنگلوں کے باسی اور درندے تھے۔ اور وحشت میں سرگرداں تھے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جہاں جہاں انہوں نے اسلامی احکام کو توڑا، مثلاً معاشی نظام میں انہوں نے اس نظام کو قبول نہیں کیا اور اپنا سودی نظام رائج کیا۔ آپ وہاں جا کر دیکھیں، وہاں کا ہر شہری معاشی اعتبار سے پس رہا ہے۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ پیدا ہونے والے بچے کا خرچ حکومت دیتی ہے۔ بچے کو وظیفہ دیتی ہے اور اگر ماں ملازمہ ہو تو تنخواہ سمیت چھٹی دیتی ہے اور جب تک بچہ بالغ نہیں ہو جاتا، اس کی تعلیم کے اخراجات دیتی ہے۔ اس کے سکول کے اخراجات دیتی ہے۔ بیمار کو وظیفہ دیتی ہے۔ روزگار چھوٹ جائے تو وظیفہ دیتی ہے۔ بوڑھا ہو تو 60 سال کی عمر میں پنشن دے دیتی ہے، خواہ وہ کاشتکار ہی ہو۔ سرکاری ملازم ہو یا نہ ہو، اسے پنشن ہو جاتی ہے۔ 60 سال سے زائد عمر کے بندے کو بس میں آدھا کرایہ، ہوٹل میں آدھا کرایہ اور دوائی آدھے ریٹ پہ ملتی ہے۔ وہ (Senior Citizens) بن جاتے ہیں یعنی بزرگ شہری۔ اتنی سہولتوں کے باوجود کسی ایک بندے کو معاشی طور پر مطمئن دکھا دیجیے! کوئی ایک بندہ معاشی طور پر مطمئن نہیں ہے۔ ہر بندہ جوتا ادھار لیتا ہے قسطوں پر۔ کپڑا ادھار لیتا ہے قسطوں پر۔ گھر ادھار لیتا ہے قسطوں پر۔ گاڑی ادھار لیتا ہے قسطوں پر۔ ٹی وی۔ وی سی آر ادھار لیتا ہے قسطوں پر۔ ادھار اور سود کی قسطیں ادا کرتے کرتے مر جاتا ہے۔ جس کو وراثت میں وہ چیزیں ملتی ہیں، اس کو ادھار ادا کرنے پڑتے ہیں یا بیچنے والی کمپنیاں اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ہم جس جگہ بیٹھے ہیں عموماً یہاں ان میں سے کوئی سہولت نہیں ہے۔ ہم کماتے ہیں اور کروڑوں چھوڑ کر مرتے ہیں۔ کوئی غریب ہو جو ادھار میں مر گیا ہو ورنہ ہر آدمی آسودہ حال جاتا ہے۔ کسی کی چارپائی روکنے والا کوئی نہیں ہوتا کہ ہمارا ادھار دو پھر چارپائی لے کر جانا۔

پھر ایسا کیوں ہے؟ کیونکہ انہوں نے وہاں معاشی نظام قائم کرنے کی کوشش تو کی لیکن ان کا معاشی نظام اسلام کے خلاف ہے۔ اور یہاں جو برکتیں ہیں، یہ حکومت کی نہیں ہیں۔ یہاں کسی سیاسی پارٹی کی وجہ سے برکت نہیں ہے۔ یہاں برکت ان غریبوں کی وجہ سے ہے جنہوں نے اسلام کا معاشی نظام اپنا رکھا ہے کہ سود نہیں کھاتے۔ جو تجارت اور مزدوری کرتے اور حرام سے اجتناب کرتے ہیں۔ اگر کسی پر خوشحالی یا فارغ البالی ہے تو اس کا سبب یہ غریب ہیں جن کی نہ سیاسی سطح پر کوئی حیثیت ہے اور نہ ملکی سطح پر کوئی اہمیت ہے اس ملک میں سیاستدان یا حکمران کسی شاباش کے مستحق نہیں ہیں بلکہ یہ عموماً بدترین لوگ ہیں جو مغرب کے سودی نظام کے اسیر ہیں اور اس کی تعریف کرنے والے ہیں اور ایک اسیر ملک کو چلا رہے ہیں۔ بہترین لوگ وہ ہیں جو مخلص ہیں، فقیر ہیں، غریب ہیں۔ جو سود نہیں کھاتے۔ حرام نہیں کھاتے۔ جھوٹ نہیں بولتے چوری نہیں کرتے اور اپنے معاشی نظام کی حلت و حرمت کو اس انداز پر استوار کر رکھا ہے جو اسلام سے متعلق ہیں۔ وہ لوگ حکمران نہیں

ہیں، وہ رعیت ہیں۔ پھر بھی ان کی برکات معاشرے میں موجود ہیں جبکہ مغرب سارے فلاحی اقدامات کرنے کے باوجود آسودہ حال نہیں۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ایک آدمی دو دو جگہ کام کرتا ہے۔ امریکی معاشرے کی یہ روٹین (Routine) ہے کہ آٹھ آٹھ گھنٹے دو دو جگہ کام کرتے ہیں۔ یہ وہاں پر ایک عام بات ہے۔ اگر وہاں پر کوئی بیمار پڑ جائے تو لوگ دو دو مہینے چوبیس گھنٹے ملازمت کرتے ہیں تاکہ فالتو رقم کما کر وہ بجٹ پورا کیا جائے۔ ان کا سونا اور کھانا یہ ہوتا ہے کہ دفتر جاتے ہوئے راستے میں کھڑے کھڑے کھالیا یا تھوڑی دیر سو گئے، سیٹ پر بیٹھے بیٹھے سو گئے۔ ٹائم ہو گیا تو دفتر چلے گئے۔ عورتوں کو میں نے دیکھا ہے کہ سڑک پر کھڑے ہو کر پڑیا سی نکال کر میک اپ کر رہی ہوتی ہیں۔ گھر میں اتنا فالتو وقت بھی نہیں کہ اپنا حلیہ ہی ٹھیک کرلیں۔ اس معاشرے میں مرد ہوں یا عورتیں، بس کام کی چکی میں پس رہے ہیں۔ کوئی انسانی اقدار نہیں ہیں۔ کیا اس سے بڑی بھی کوئی مصیبت ہوگی۔ یہ اس لیے ہے کہ ان کا معاشی نظام اسلام کے خلاف ہے۔ کوئی کسی کی بیٹی، ماں یا بہن نہیں ہے۔ مرد، مرد ہے اور عورت، عورت۔ اس لیے کہ ان کا جنسی نظام اسلام کے خلاف ہے۔ جس معاشرے پر ہم فدا ہیں، اس میں اگر کوئی خوبی ہے تو اس نے وہ ادا یقیناً اسلام سے اپنائی ہے۔ اور ہر کام کے دو فائدے ہوتے ہیں۔ ایک ظاہری اور فوری یعنی دنیوی اور دوسرا اخروی۔ دنیوی فائدہ کافر کو بھی ہوتا ہے۔ اگر کافر کھانا کھائے تو پیٹ اس کا بھی بھر جاتا ہے، کھانا اچھا ہو تو اسے بھی صحت ملتی ہے۔ کھانا خراب ہو تو وہ بھی بیمار ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلامی ضابطوں کا بھی اثر ہے جہاں کافروں نے ان کو اپنایا، ان کو بھی دنیوی فائدہ ہوا اور جہاں ہم نے ان ضابطوں کو چھوڑا تو ہمیں بھی نقصان اٹھانا پڑا۔

مزید تفصیل کے لیے ان آیات کی تفسیر کا مطالعہ اسرار التنزیل میں کریں۔

☆ ☆ ☆

سبق نمبر۱۶: سورۃ النور

آیت نمبر: ۵۵تا۵۷

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا

جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور نیک کام

الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ

کریں اللہ ان سے وعدہ فرماتے ہیں کہ (اتباع کی برکت سے) ان کو ملک میں ضرور حکومت عطا

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى

فرمائیں گے جیسا ان سے پہلے (اہل ہدایت) لوگوں کو حکومت بخشی تھی اور ان کے لیے ان کے دین کو جسے ان

لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ

کے لیے پسند فرمایا ہے ضرور مستحکم (اور پائیدار) فرمائیں گے اور خوف کے بعد ان کو ضرور امن بخشیں گے۔ وہ

لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ

میری ہی عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں گے۔ اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے

هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ

ہی لوگ بدکردار ہیں۔ اور نماز کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیا کرو اور

اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ

پیغمبر کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم فرمایا جائے۔ (اے مخاطب!) کافروں کے بارے یہ خیال نہ کرنا

كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَ

کہ وہ زمین (کے کسی حصہ) میں (بھاگ کر ہم کو) ہرا دیں گے اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور

لَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۵۷﴾

بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔

سورۃ النور کی ۵۵ نمبر آیت مبارکہ کو آیتِ استخلاف کہتے ہیں یعنی وہ آیت جس میں خلافت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ خلیفہ نائب کو اور خلافت نیابت کو کہتے ہیں۔ اصطلاحِ شریعت میں خلافت سے مراد وہ نیابت ہے جو پورے اقتدار اور اختیار کے ساتھ ہو۔ اللہ جل شانہ نے انسان کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَہ ۔ (سورۃ البقرہ آیت نمبر 30) ترجمہ: میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں۔ تو جتنی طاقتیں زمین پر اس کی نیابت کے لیے ضروری تھیں، وہ اس کے اختیار میں دے دیں۔ جب کسی قوم میں خلافت کی بات آتی ہے تو اس سے مراد اس قوم میں وہ اختیار جسے آپ حکومتی اختیار کہتے ہیں یا جسے آپ اقتدار اعلیٰ کہتے ہیں، وہ مراد ہوتا ہے۔ اس آیۂ مبارکہ میں اللہ کریم نے اقوام عالم میں اپنے ایک خاص معیار، ایک خاص سٹیٹس، ایک خاص کوالیفیکیشن (qualification) رکھنے والے بندوں کو ایک وعدہ دیا ہے۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔ تم میں سے وہ لوگ جو اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کرتے ہیں، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے مدعی ہیں، وہ لوگ جو صرف کہتے نہیں، واقعی اللہ پر یقین رکھتے ہیں اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ کے ساتھ ان کا رشتہ مضبوط ہے۔ اور وہ عملی زندگی میں اطاعت کرتے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بامحاورہ ترجمہ میں نے کیا ہے **وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** کا کیونکہ کسی عمل میں صالحیت تب پیدا ہوتی ہے کہ وہ عمل اللہ کے حکم کے مطابق ہو، اللہ نے کرنے کا حکم دیا ہو یا کرنے کی اجازت ہو اور اسے اس طرح کیا جائے جس طرح کرنے کا طریقہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا۔ تو اللہ کریم وعدہ فرما رہے ہیں۔ کہ یہ وعدہ ہے اللہ کا ان لوگوں سے جن کا یقین محکم، ایمان پکا اور کھرا ہے اور انہوں نے اعمال میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حق ادا کیا۔

لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ میں انہیں زمین پر اقتدار و اختیار دوں گا۔ زمین کی حکومت سپرد کر دوں گا۔ کیسے؟ **کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ** جس طرح پہلے اپنے بندوں کو میں نے زمین پر اقتدار و اختیار دیا تھا اور اس کا اثر یہ ہوگا۔

وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ کہ ان کا وہ دین جو ان کے لیے اللہ نے پسند کر لیا ہے وہ محکم و پائیدار اور مستحکم ہو جائے گا۔ **وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا** اور کفر کا ان پر جس طرح غلبہ رہا ظلم و جور سے وہ جس قدر خوف زدہ اور پریشان رہے، وہ سارا خوف ختم ہو کر کائنات میں انہیں پورا پورا امن نصیب ہوگا اور پھر انہیں کوئی روکنے والا نہیں ہوگا۔

یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا اس کا شکر وہ اس طرح ادا کریں گے کہ صرف میری بارگاہ میں ان کی پیشانیاں جھکیں گی۔ میری عبادت کریں گے اور کسی کو میرا ہمسر نہیں جانیں گے۔ **وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ** اس کے بعد بھی اگر کوئی ناشکری کرے، اقتدار و اختیار میں بددیانتی کرے یا اس اقتدار اعلیٰ کو قبول نہ کرے جو اللہ کے نام پر ہو جو نبی علیہ السلام کی سنت پر ہو، جس میں حقیقی اسلامی حکومت ہو جو اس کی مخالفت کرے گا" **فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ** ایسے لوگ بہت ہی سخت گناہگار،

بہت بدکردار اور بہت ہی برے لوگ ہوں گے۔ وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ان عظمتوں کو پانے کے لیے تمہارے پاس ایک ہی راستہ ہے۔ اللہ کی عبادت کرو، اپنے مال کو اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرو اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا حق ادا کرو۔ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ تاکہ تم پر اللہ رحم فرمائے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیسے ممکن ہے کہ ایک قوم جو پس رہی ہو، جو مظلوم ہو، جس میں کوئی قوت اور طاقت نہ ہو اور جو کسی کو جواب دینے کی اہلیت نہ رکھتی ہو، روئے زمین پر اقتدار حاصل کرلے۔ یہ سوال آج کا نہیں ہے۔ آج سے زیادہ یہ سوال اس وقت اپنی طاقت رکھتا تھا جب یہ آیۂ مبارکہ نازل ہوئی۔ جب ظہور اسلام ہوا، تو اس وقت روئے زمین پر ہر حکومت، ہر سلطنت، ہر اقتدار، ہر اختیار کافر مشرک اور بے دین کے پاس تھا۔ مال و دولت اور دنیوی ذرائع اور اسباب کفار اور مشرکین کے قبضے میں تھے۔ بڑے بڑے لاؤ لشکر اور فوجیں اور افرادی قوت کافروں کے پاس تھی۔ روئے زمین پر کافروں کا قبضہ تھا حتیٰ کہ جس شہر میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اس شہر میں بھی اقتدار و اختیار مشرکوں اور کافروں کا تھا۔ اور مسلمانوں کو بالآخر وہاں سے ہجرت پر مجبور ہونا پڑا۔ گھر چھوڑنے پڑے۔ بیوی اور بچے چھوڑنا پڑے اور مزید ظلم کی بات یہ ہے کہ مسلمان مادی اعتبار سے اتنے کمزور تھے کہ انہیں شہر چھوڑنے سے بھی روک دیا جاتا تھا اور بسا اوقات ان کے لیے شہر اور ملک اور گھر چھوڑ کر کہیں بھاگنا بھی مشکل ہو جاتا تھا۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ لوگ جو مٹھی بھر ہیں اور جن کے پاس کوئی وسائل نہیں اور جن کے پاس جو گھر تھے وہ بھی ان سے چھین لیے گئے۔ ان کا شہر چھن گیا، ان کے دوست احباب، ان کے سارے وسائل چھن گئے۔ اب وہ خود مہاجر ہو کر دوسروں کے دروازے پر جا پڑے اور دوسروں کی مہربانی سے انہیں سر چھپانے کی جگہ ملی۔ ان سے یہ وعدہ کیا جارہا ہے۔ سب سے پہلے اس وعدۂ الٰہی کے مخاطب تو وہی لوگ تھے جو نزول قرآن کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ عالیہ میں موجود تھے اور جنہیں صحابہ کرامؓ کہتے ہیں۔ تاریخ یہ بتاتی ہے، ہمارا عقیدہ ہمارا ایمان اور قرآن کی بات اپنی جگہ، یہ قرآن مسلمان کے لیے دلیل ہے، کافروں کی لکھی ہوئی تاریخِ عالم بھی بتاتی ہے کہ وہ مٹھی بھر خانہ بدوش بالآخر پوری دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کے حکمران بن گئے۔ وہ ان پڑھ لوگ روئے زمین پر بسنے والی انسانیت کے استاد اور علم پھیلانے والے بن گئے۔ وہ کمزور پوری دنیا میں طاقت کا سمبل (SYMBOL) بن گئے اور کوئی بڑے سے بڑا طوفان ان کے سامنے نہ ٹھہر سکا۔ ان میں کمال کیا تھا؟ کیا انہیں کوئی مادی قوت نصیب ہوئی یا مدینہ منورہ آ کر کسی حکومت کا تعاون نصیب ہو گیا؟ یا کسی سلطنت نے ان کا ہاتھ بٹایا یا کہیں سے انہیں دولت ملی یا کسی حکومت نے اسلحہ دیا؟ کیا قوت تھی ان کے پاس۔ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ صرف ایک قوت تھی کہ انہوں نے ماننے کا حق ادا کر دیا۔ اور یوں مانا کہ جب انہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ تم ہاتھ نہیں اٹھاؤ گے تو وہ مار کھاتے رہے۔ نہ صرف انہوں نے ہاتھ نہیں اٹھایا بلکہ کسی دوسرے کے حق میں بد دعا بھی نہیں کی۔ تیرہ برس مکی زندگی میں دنیا کا ہر ظلم ان پر توڑا گیا۔ گرم لوہے سے وجودوں کو داغا گیا۔ گرم ریت پر لٹا کر گئی گئی

من وزنی پتھر اوپر رکھ دیے گئے۔ کوڑوں سے مارا گیا۔ شہید ہو گئے، دم توڑ گئے لیکن آپ پوری تاریخ سے گزر جائیے اور دکھائیے جو یقیناً آپ نہیں دکھا سکتے کہ کہیں کسی صحابیؓ نے مار کھاتے ہوئے ان ظالموں کے حق میں بددعا بھی کی ہو۔ ماننے کا حق ادا ہو گیا۔ نہ یہ سوال ہی کیا گیا کہ ہم کیوں نہ ہاتھ اٹھائیں۔ اگر ہم کمزور ہیں تو ہم ان کے لیے بددعا تو کر ہی سکتے ہیں۔ ہم انہیں کوسنے تو دے ہی سکتے ہیں۔ ہر مظلوم نے اللہ کی توحید کا نعرہ لگایا۔ سینہ پھٹنے لگا تو اس سے احد احد نکلا، کسی کے حق میں بددعا بھی نہیں کی۔ اور اس بے بسی اور بے کسی، ظلم وجور کے برداشت کے بعد اگر اللہ نے ہاتھ بھی پکڑا اس نے رحم بھی فرمایا تو اس نے کہہ دیا تم شہر چھوڑ دو۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک بندے کا عقیدہ ہو کہ میرا نبی علیہ السلام، تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہے۔ اللہ کا برحق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اس کی نبوت ساری انسانیت کے لیے ہے ابدالاباد کے لیے ہے۔ اسے غالب بھی ہونا ہے۔ وہ نبی علیہ السلام بندے سے اس اللہ کا تعارف کرائے جو ہر چیز پہ قادر ہے۔ ہر وقت سنتا ہے۔ بندے کی ہر بات جانتا ہے۔ اس کی ہر ضرورت سے آگاہ ہے۔ **وَاِذَاسَالَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ** (البقرہ:186) میرا کوئی بندہ میرے بارے پوچھے تو حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اسے کہہ دیجیے کہ تیرے اپنے گمان سے بھی میں تیرے قریب تر ہوں اور صرف قریب نہیں ہوں۔ **اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ** (البقرہ:186) جب کوئی دعا کرتا ہے تو میں اس کی دعا سنتا بھی ہوں۔ تو اس عقیدے کا بندہ یہ نہیں کہتا کہ ہم ہی سے شہر چھڑواتا ہے کافروں کو مغلوب کیوں نہیں کرتا۔ لیکن ان کا رشتہ اللہ کے ساتھ مشورہ دینے کا نہیں تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے مشورے دینے کے لیے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں مانا۔ انہوں نے تعمیلِ ارشاد کے لیے مانا تھا۔ کسی نے سوال نہیں کیا۔ فرمایا گھر چھوڑ دو۔ انہوں نے کہا **الحمد للہ** گھر چھوڑ دیئے۔ ماننے کا حق ادا کیا۔ یہ ساری باتیں وہ بھی سوچ سکتے تھے۔ وہ بھی کہہ سکتے تھے کہ اللہ تو غالب ہے۔ اگر فرعون اور اس کی آل کو غرق کر سکتا ہے تو اہل مکہ کو کیوں نہیں ڈبو دیتا۔

بلکہ مشرکین نے تنگ آ کر کعبہ شریف کے پردے سے لٹک کر دعا کی تھی کہ یا اللہ اگر تیرا یہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی سچا ہے اور ہم غلطی پر ہیں۔ **فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَۃً مِّنَ السَّمَآءِ** (الانفال:32) تو پھر ہم پر عذاب نازل کر، ہم پر آسمان سے پتھر برسا۔ **اَوِئْتِنَابِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ○** یا ہم پر کوئی بہت تباہ کن عذاب بھیج دے کہ ہم مار مار کر تھک گئے ہیں۔ یہ مقابلے میں بددعا بھی نہیں کرتے۔ یہ ہماری بات بھی نہیں سنتے۔ جان دے دیتے ہیں، نبی علیہ السلام کے ارشاد سے نہیں پھرتے۔ یہ بھوک پیاس برداشت کر لیتے ہیں اور یہ چھوٹا دعویٰ بھی نہیں کرتے۔ زور لگا کے بھی ہم تھک گئے ہیں کہ دل سے ہماری بات نہ مانو زبان سے تو کہہ دو کہ ہم نے نبی علیہ السلام کا دامن چھوڑ دیا، ہم تمہارے ہیں۔ یہ اتنا بھی نہیں کہتے۔ پھر اگر یہی سچے ہیں تو ہمیں ہی تباہ کر دے۔ قصہ تو ختم ہو۔ یہ ہی جیت گئے۔ اللہ کریم فرماتا ہے۔ **مَاکَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ وَاَنْتَ فِیْھِمْ** میرا رسول رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم بھی وہاں ہو اور اس شہر، اس زمین پر میں عذاب بھی بھیجوں، یہ میری شان کے خلاف ہے۔ نہ صرف یہ

کہ انہوں نے ان کے حق میں بددعا نہ کی بلکہ ان کے تعصب اور عذاب الٰہی سے ان کے بچاؤ کی ڈھال بھی بنے رہے۔

اس سے بھی عجیب تر صورت حال سامنے آتی ہے جب انہی کمزوروں، بیماروں، وسائل سے محروم بندوں سے کہہ دیا جاتا ہے کہ شہر سے باہر نکلو اور اہل مکہ کا مقابلہ کرو۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انہیں یہ پوچھنے کا حق حاصل نہیں تھا کہ اگر کل ہمارے پاس وسائل نہیں تھے اور ہمیں مکہ چھوڑ کر آنا پڑا، ہمیں گھر بار مال جائیداد ہر شے چھوڑنا پڑی تو۔ آج ہمارے پاس کونسے وسائل ہیں کہ مکہ والوں کا مقابلہ کریں کوئی ہماری افرادی قوت ہے یا ان کے مقابلے میں ہمارے پاس دولت آ گئی ہے یا ان کے مقابلے میں ہمارے پاس گھوڑے اچھے ہیں یا زر ہیں زیادہ ہیں یا تلواریں اچھی ہیں یا ہمارے پاس لڑا کا جوان زیادہ ہیں۔ کیا وجہ ہے؟ ہم مقابلہ کیسے کریں۔ کسی نے نہیں پوچھا۔ جتنے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم پہنچا، ان میں سے ہر ایک کی کوشش یہ تھی کہ مجھے ساتھ جانے کی اجازت دی جائے تین سو تیرہ کا انتخاب ہوا۔ ان میں بچے بھی تھے اور ان بچوں کے بھی سیرت کی کتابوں میں عجیب واقعات ملتے ہیں کہ ایک بچہ جو قد کاٹھ میں ذرا مضبوط تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جانے کی اجازت دے دی تو دوسرا پیش ہو گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اسے کشتی میں گرا سکتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اچھا پھر کشتی کرو تو اس کے کان میں اس نے کہا کہ گر جانا۔ یعنی اتنا ساتھ تو میرا دے دو کہ مجھے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب میدان جہاد میں جانے کی اجازت مل جائے۔ میں تجھ سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا میں تو ایک حیلہ کر رہا ہوں کہ اس طرح شاید میری جان، میرے خون کا کوئی قطرہ اس بارگاہ میں کام آ جائے.........کتنا فاصلہ ہے

آج مسلمانی کا مدعی صرف اس لیے مسلمان ہے کہ اسے دم کر دو، اس کی بیماری ٹھیک ہو جائے۔ آج کے مسلمان کی عقیدت اس لیے ہے کہ اس کو وظیفہ بتاؤ، اسے پیسے زیادہ مل جائیں۔ اس کے لیے دعا کرو، اسے برکت ہو جائے۔ ارے اسلام تو یہ ہے کہ کوئی موت بھی تلاش کرے۔ صحابہؓ نے وظیفے نہیں مانگے، دنیا کی دولت پیدا کرنے کے لیے تسبیحات نہیں مانگیں، بیماری کا علاج نہیں پوچھا۔ وہ تو حیلہ کرتے تھے کہ کاش اس مقصد پہ قربان ہو جائیں۔

غزوہ احد کے لیے جب تیاری ہو رہی تھی اور لوگ چھانٹے جا رہے تھے تو عمرو ابن الجموع رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی ایک ٹانگ لنگڑی تھی، تھوڑا سا پاؤں ان کا گھسٹتا بھی تھا۔ ان کے چار جوان بیٹے تھے وہ سارے احد میں جا رہے تھے وہ بھی پیش ہوئے تو ان کے بیٹوں نے درخواست کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم نے ابا سے منت کی ہے۔ ہماری بہنیں ہیں، بیویاں ہیں، بچے ہیں۔ ہم چاروں بھائی جا رہے ہیں اور کوئی انہیں سودا لا کر دینے والا نہیں ہے۔ کوئی ان کے لیے باہر سے پانی لانے والا نہیں۔ ہم نے ابا کی منت کی ہے کہ ہم بھی آپ ہی کے وجود کا حصہ ہیں۔ ہماری قربانی، آپ ہی کی قربانی ہے اور اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ کوئی گھر کی بھی دیکھ بھال کرے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے ہیں۔ آپ

صلی اللہ علیہ وسلم انہیں فرمائیے کہ یہ گھر میں رہیں۔ انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف سے مجھے نہ کہیے گا۔ اولاد تو یہ میری ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ میں اس ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو جنت میں گھسیٹ کر چلوں کیا مجھے حق حاصل نہیں ہے۔ اور واقعی احد میں شہید ہو گئے۔ جب کفار مکہ بھاگ گئے۔ مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن قیام فرمایا۔ کچھ شہداء احد میں دفن کر دیے گئے۔ کچھ لوگوں کو اٹھا کر مدینہ منورہ ان کے ورثاء لے گئے وہ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔ تو عمرو بن الجموع کے بیٹوں نے بھی انہیں ساتھ لے جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دے دی۔ انہوں نے اٹھا کر باپ کے وجود کو اونٹ پہ رکھا۔ اونٹ نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ سارا زور انہوں نے لگایا۔ اونٹ نہیں اٹھ رہا تھا۔ پھر بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم ویسے اونٹ کو اٹھاتے ہیں، اٹھ جاتا ہے۔ باپ کا وجود اس پر لادتے ہیں، نہیں اٹھتا۔ دو بندے چار بندے بیٹھ کر اٹھاؤ تو اٹھ جاتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس کے کسی ساتھی کو بلاؤ تو ایک صحابیؓ کو بلایا گیا۔ انہوں نے کہا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کل ہم دونوں اکٹھے تھے تو اس نے مجھے کہا تھا کہ کوئی دعا اگر چاہتے ہو تو کرو۔ ہم اللہ کی راہ میں نکلے ہیں اور اس راہ کے مسافروں کی دعا سنی جاتی ہے۔ تم کرو میں آمین کہتا ہوں۔ تو میں نے دعا کی تھی کہ یا اللہ مجھے فتح دے اور میرے ہاتھ سے فلاں کافر قتل ہو۔ اس کا مال مال غنیمت میں آئے کہ وہ مکہ میں بڑا اکڑتا تھا، یہاں وہ ذلیل و رسوا ہو اور اس کی رسوائی کی نشانی میرے پاس آئے۔ اس کی زرہ، اس کا اسلحہ مجھے حاصل ہو۔ تو انہوں نے آمین کہی اور کہا تم آمین کہنا میں دعا کرتا ہوں۔ تو انہوں نے دعا کی کہ اللہ مجھے صبح اپنی راہ میں قبول فرما اور ایسا قبول فرما کہ میرا جسد اسی میدان کا حصہ بن جائے میرا مدفن بھی یہیں بنانا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پھر تمہارا اونٹ اسے کیونکر لے جا سکتا ہے۔ یعنی انہوں نے مر کر بھی وہاں سے ہٹنے کا نہیں سوچا۔ کتنا فرق ہے ان کے اور ہمارے اسلام میں۔ ہماری اور ان کی مسلمانی میں۔

اگر آپ لوگوں کو یہ یقین دلا دیں کہ جو پیروں بزرگوں کے عرسوں پر نہیں جاتے، ان کو روزی بھی ملتی ہے، اولاد بھی ہوتی ہے۔ اس جانے نہ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تو دوسرے دن یہ سارے مزار اجڑ جائیں گے۔ لوگ تو دنیا کے حصول کے لیے جاتے ہیں۔ آج کی مسلمانی یہ ہے کہ دنیوی اغراض پوری کرنے کا ذریعہ اسلام بنا ہوا ہے۔ اور وہ لوگ اسلام میں حیات نہیں، موت تلاش کرتے تھے اور ہر ایک کی تمنا ہوتی تھی کہ میرا مال کام آئے، میری جان کام آئے، میرا گھر کام آئے، کوئی چیز تو میری کام آئے۔

حضرت خنساء رضی اللہ تعالیٰ عنہا شاعرہ تھیں، صحابیہ تھیں۔ خواتین ویسے بھی حساس ہوتی ہیں اور شاعر ایک حساس طبقہ ہوتا ہے۔ خاتون بھی ہو پھر شاعرہ بھی ہو۔ ان کا ایک صخر نامی بھائی جوانی میں فوت ہو گیا تھا تو انہوں نے اس کے مرثیے میں ایک شعر کہا تھا۔ "**واذکرنی طلوع الشمس صخرہ**" "سورج طلوع ہوتا ہے تو مجھے صخر کی یاد دلاتا ہے۔" **واذکرہ**

لکل غروب شمسہ'' اور سورج تو تھک ہار کر چلا جاتا ہے میں بیٹھی بھائی کو یاد کر رہی ہوتی ہوں۔ اتنی حساس خاتون نے اسلام قبول کیا۔ اللہ نے اولاد دی۔ چار بیٹے ان کے قادسیہ کے میدان میں کام آئے۔ خود ساتھ تھیں، آپ کو اطلاع ملی کہ آپ کے چاروں بیٹے شہید ہو گئے۔ کمر دوہری ہو چکی تھی، بوڑھی تھیں۔ خیمے سے باہر نکلیں اور آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر شکر ادا کیا کہ بارالہامیں تو اس لیے یہ خزانہ لیے پھرتی تھی کہ میری گود کے پالے ہوئے جگر گوشے کاش تو قبول کر لے اور تیرا احسان ہے کہ آج تو نے مجھے اس قابل کر دیا کہ روزِ حشر میں بھی ان ماؤں کی صف میں کھڑی ہو سکوں جن کے بیٹے شہید ہوئے ہیں۔

یہاں تو سارے خیر کے طالب ہیں۔ ان لوگوں کا سرمایہ فارن ایڈ (Foriegn aid) نہیں تھی۔ مادی وسائل نہیں تھے۔ کسی حکومت کی طاقت نہیں تھی۔ ان کا سرمایہ یہ تھا کہ ان کے ''پاس کچھ نہیں تھا''۔ اور وہ یہ کچھ بھی نہیں اللہ ہی کو لوٹانا چاہتے تھے۔ علامہ ابن کثیر رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی تفسیر میں ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ قیامت کے دن جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے۔ میزانِ عدل لگایا جائے گا تو صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت اس حال میں اٹھے گی کہ وجودوں کے پرخچے اڑے ہوئے ہوں گے، خون بہہ رہے ہوں گے، لباس خون آلود ہوں گے، اسلحہ پاس ہوگا، اس کٹے پھٹے وجود سے جا کر وہ جنت کے دروازے پہ دستک دیں گے تو جنت کا خادم رضوان عرض کرے گا کہ حضور ابھی تو حشر قائم ہوا ہے، ابھی تو اعمال کا وزن ہوگا۔ ابھی سوال جواب ہوں گے۔ پھر فیصلہ ہوگا کہ کسے جنت میں جانا ہے۔ آپ ابھی سے کھٹکھٹا رہے ہیں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرے وہ خدام تلواریں پھینک کر کھڑے ہو جائیں گے اور بارگاہِ الوہیت میں عرض کریں گے۔ کہ اللہ تیرے ہم پر بڑے احسانات تھے، تو نے ہمیں وجود دیا، قوت دی، جوانی دی، مال و دولت دیا، پھر تیرا احسان کہ تو نے ہمیں ایمان دیا، ہمیں نبی علیہ السلام کی صحبت دی۔ تو نے بے شمار انعامات دیے اور ہم نے جو بھی تو نے دیا تھا، تیری راہ میں لٹا دیا۔ گھر قربان کر دیے، اولاد ذبح کرا دی، مال لٹوا دیا، ملک چھوڑ دیا، وجود بچا تھا دیکھ اس کے کتنے ٹکڑے لے کر یہاں پہنچے ہیں۔ یہ تیرا فرشتہ حساب کس بات کا مانگتا ہے۔ حساب تو اس چیز کا ہونا چاہیے جو ہم نے بچالی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حکم ہوگا کہ ان کے لیے جنت کے سارے دروازے کھول دو۔ یہ ان کی پسند ہے کہ یہ کس سمت سے داخل ہوتے ہیں، کہاں تک جاتے ہیں۔ تو ان کے پاس اگر کوئی وسیلہ تھا، کوئی دولت تھی، کوئی اسلحہ تھا۔ اگر چھوٹا سا وجود تھوڑی سی طاقت تھی تو بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قربان کرنا چاہتے تھے۔ اگر بڑی طاقت چوڑا سینہ تھا تو بھی وہ اسلام پر اسے کٹوانا چاہتے تھے۔ انہیں زندہ رہنے کی نہیں، اسلام پر قربان ہونے کی تمنا تھی اور خلوصِ دل سے تھی۔ پھر دیکھا آپ نے، کتنی کتنی بڑی طاقتیں تھیں کافروں کی، لاکھوں سپاہیوں سے تیس ہزار صحابہؓ مقابلہ کرتے رہے۔ تین دن جنگ ہوتی رہی۔ جب بالکل تاریکی چھا جاتی، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا، مجبوراً تلواریں رک جاتی تھیں۔ روشنی ہوتی، پل پڑتے تھے۔ اور رومیوں کو یہ ناز تھا کہ ہماری فوج ساڑھے تین لاکھ ہے۔ وہ تیس ہزار کو مارنے کے بجائے خود گنتی کے لوگ باقی بچے تھے۔ سینکڑوں، ہزاروں کی تعداد میں

مرے تھے۔ اور برسوں بعد اس میدان سے لوگ گزرتے تو وہاں مختلف روشنیاں نظر آتیں۔ لاشوں کی ہڈیوں کے جو فاسفورس بن گئے تھے وہ وادی کو روشن کیے رکھتے تھے۔ یہ تاریخ کا حصہ ہے۔ تیس ہزار مسلمانوں کو ساڑے تین لاکھ شکست نہ دے سکے۔ تین دن تین رات طویل ترین دست بدست جنگ تاریخ انسانی میں ہے۔

ان کے پاس کیا تھا، وہ مرنے کے لیے آئے تھے، کوئی انہیں مار نہیں سکتا تھا۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سالار لشکر تھے۔ میدان میں فوجیں صف آرا ہو رہی تھیں۔ ایک صحابیؓ گھوڑا دوڑاتے ہوئے آئے۔ وہ کہنے لگے مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بچھڑے بڑا عرصہ ہو گیا ہے۔ میں جا رہا ہوں یا امیر! کوئی پیغام ہو تو دے دیجیے۔ کیسے عجیب لوگ تھے اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے بندے نے اس پر اعتراض نہیں کیا کہ یہ تو خودکشی ہے۔ فرمایا میرا اسلام بھی عرض کرنا اور یہ بھی عرض کرنا کہ جو جو وعدے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیے تھے، اللہ نے سارے پورے کر دیے۔ یمن کے خزانے بھی آپ کے غلاموں کے قدموں میں ہیں۔ اور قیصر و کسریٰ کی ریاستیں بھی ان کے قبضے میں ہیں۔ اور وہ بندہ پلٹا اور کافروں کے لشکر میں گھس گیا اور لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔

اور پھر تاریخ نے دیکھا کہ وہ مٹھی بھر خانہ بدوش تاریخ انسانی کی عظیم ترین قوت بن گئے۔ اور زمین ان کے لیے سمٹ گئی۔ دریا اور سمندر ان کے لیے پایاب ہو گئے۔ بڑے بڑے پہاڑوں کی چوٹیاں ان کے پاؤں کی ٹھوکروں میں تھیں۔ حیران ہوتا ہے انسان جب تاریخ پڑھتا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایران کا یہ سارا شمالی حصہ فتح کر لیا۔ پھر افغانستان کو لے کر افغانستان کے شمال مشرقی کونے سے نکل کر چین تک اور چین سے واپس وہ ہندوستان کی طرف پلٹے اور ساری برف پوش چوٹیاں، سولہ، سترہ ہزار فٹ کی بلندی، ان صحراؤں کے رہنے والوں نے کیسے مسخر کیں۔ ان کے باپ دادا صحراؤں میں دفن ہو گئے۔ جن کی عمر صحرا کے تپتے ہوئے موسموں میں گزری۔ جو وہاں پیدا ہوئے۔ جن کی ساری غذا۔ جن کا سارا سونا جاگنا، جن کا سارا زندگی کا پیٹرن (pattern) صحرا (DESERT) کا تھا۔ انتہائی بلند چوٹیوں کو انہوں نے کیسے روند ڈالا۔ کوئی پہاڑ انہیں نہیں روک سکا۔ جنہوں نے ساری زندگی نخلستانوں میں پھوٹتے ہوئے پانی کے قطروں کی تلاش میں گزاری تھی، انہوں نے گھوڑے سمندر کی پہنائیوں میں ڈال دیے۔ سمندروں کی وسعتیں سمٹ گئیں اور وہ گھوڑوں پر اور لکڑی کے تختوں پر تیر کر سمندروں کو عبور کر گئے۔ نہ انہیں زمین کی وسعتیں روک سکیں نہ انہیں سمندر کی گہرائیوں نے روکا نہ پہاڑوں کی بلندیاں ان کے راستے میں حائل ہو سکیں۔ یہ کیا بن گئے تھے۔ یہ کیا لوگ تھے، انہوں نے کیا کھایا تھا، انہیں ہوا کیا تھا۔

دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہ رشتہ الفت ہو گیا تھا کہ وہ جینا نہیں، مرنا چاہتے تھے۔ ان سے موت بھی کانپتی تھی اور بھاگتی تھی۔ ان سے بیماریاں بھی ڈرتی تھیں۔ زمین کی وسعتیں اور پہاڑوں کی بلندیاں ان کی پاؤں کی ٹھوکروں میں تھیں۔ اس لیے وہ مرنا چاہتے تھے انہوں نے اسلام کو زندگی کی دوا نہیں، شہادت کا راستہ سمجھ کر اپنایا تھا۔

دیکھ چکی ہے اب بھی باز آ جا اس لیے کہ" **ان معی قوی** میرے پاس ایسے لوگ ہیں **یحبون الموت کما یحبون الفارس الخمر**" جس طرح تیرے ایرانی شراب کے رسیا ہیں اس سے زیادہ یہ موت کے طالب ہیں۔ جس بے تابی اور بے چینی سے تم شراب کے طالب ہو، اس سے زیادہ لذت ان کے لیے مرنے میں ہے، یہ مرنا چاہتے ہیں، تم انہیں مار نہیں سکو گے۔

تو ابوبکر و عمر و عثمان و حیدر رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین خلافتِ راشدہ کی روشن مثال اور مثالی مسلمان ہیں۔ سارے مفسرین اس آیۂ مبارکہ کا اطلاق خلافتِ راشدہ ہی پہ کرتے ہیں۔ لیکن قرآن صرف خلافت راشدہ، صرف صحابہؓ کے لیے، صرف ایک عہد کے لیے نہیں ہے۔ اپنے نزول سے لے کر قیامت تک کے ان لوگوں کے لیے ہے جو اسلام کے مدعی ہیں۔ یہ وعدہ میرے ساتھ بھی ہے، آپ کے ساتھ بھی ہے۔ ہمیں حکومت، ہمیں دنیا میں اقتدار کیوں نہیں ملتا۔ اس لیے کہ ہمارا رشتہ یہ ہے کہ ہم اسلام سے زندگی مانگتے ہیں، وہ اسلام کو زندگی دینے والے تھے۔ وہ اسلام پر موت کے متلاشی تھے اور ہم نے اسلام کو زندگی کا ذریعہ سمجھا ہے۔ ہم وظیفے پڑھتے ہیں بیماریوں سے بچنے کے لیے، ہم تسبیحات پڑھتے ہیں روزی فراخ ہونے کے لیے، دعائیں مانگتے ہیں نوکری اور ملازمت میں ترقی کے لیے، وہ دعائیں مانگا کرتے تھے، خدایا تھک گیا ہوں اس بوڑھی ٹانگ کو گھسیٹ گھسیٹ کر، اب مجھے میدان سے واپس نہ بلانا، مجھے وہیں شہادت بھی دے۔ وہیں میری قبر بھی بنا کہ قیامت کو میں احد کے میدان سے اٹھوں اور میں یہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ گھسیٹا ہوا میدانِ حشر میں اکڑ تا کافروں کے سامنے سے گزروں اور انہیں میں بتا سکوں کہ اسلام حق تھا اور تم باطل تھے۔ تو یہ وعدہ آج بھی ہے **وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** آج بھی تم میں سے کسی کو یقین کامل حاصل ہو۔ آج بھی تم اسلام کے نام پر مرنا چاہو۔ آج بھی تم میرے نبی علیہ السلام کی غلامی میں جان دینا چاہو۔ اللہ فرماتا ہے میرا وعدہ ہے کہ میں تمہیں روئے زمین پر سلطان بنا دوں گا اور ایسے ہی بناؤں گا جیسے تم سے پہلی قوموں کو اور تم سے پہلے لوگوں کو بنا دیا تھا۔ ہمیں اسلام پر فخر نہیں ہے۔ ہمارا معذرت خواہانہ اسلام ہے جبکہ صحابہؓ کو سارا کفر بھی دھمکی دیتا تھا کہ یا اسلام چھوڑ دو یا تمہیں مٹا دیں گے تو کہتے تھے کہ یہ کام تم جتنا جلدی کر گزرو گے، اتنا جلدی ہم اپنا مقصد پا لیں گے۔ **وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ** ۔ جب اللہ نے ان کے لیے پسند فرما لیا، انہیں استحکام طاقت قوت حکومت سلطنت نصیب ہوگئی۔ مسلمان کی حکومت اس کی ذات کی حکومت نہیں ہوتی۔ اس کی خواہشات کی حکومت نہیں ہوتی۔ مسلمان کو اگر سلطنت ملے گی تو اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کو نہیں ملے گی بلکہ مسلمان کی حکومت، اس کے دین کی حکومت اسلام ہوگی اس کے عقیدے کی سلطنت ہوگی۔ مسلمان کا اقتدار اس کے ایمان کا اقتدار ہوگا۔ **وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا** اور کافر دھمکیاں دے دے کر بڑھکیں مار مار کر دبک جائیں گے۔ پھر ان پر کوئی بڑھک مارنے والا، کوئی ان کو رعب دینے والا، کوئی ان پر خوف مسلط کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔ بلکہ مسلمانوں کو اتنا امن نصیب ہوگا کہ ان کے زیرِ سایہ کافر بھی ان کے طفیل امن سے رہ سکیں گے۔ اور یہ تاریخ کا حصہ ہے۔ اور وہ لوگ اقتدار و اختیار میں آ کر بھی میری عظمت کو بھولیں

گے نہیں بلکہ جس کی حکومت سائبریا سے افریقہ تک اور ہسپانیہ سے چین تک ہوگی، وہ میرے نبی علیہ السلام کی مسجد کا امام بھی ہوگا۔ یَعْبُدُوْنَنِیْ وہ جن کے نام سے بڑے بڑے سلاطین کو پسینے آ جائیں گے اور اُن کے تخت بھی تھرا اُٹھیں گے وہ تپتے ہوئے صحراؤں میں مجاہدوں کو نمازیں بھی پڑھا رہا ہوگا۔ لَا یُشْرِکُوْنَ بِیْ شَیْئًا ۔ کسی شے کو میرے مقابلے میں پر کاہ وقعت نہیں دیں گے اور جو اس کی ناشکری کریں جو ان کی مخالفت کریں۔ وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ ۔ مفسرین فرماتے ہیں یہ کافر کون تھے جنہوں نے اسلامی ریاست کے امیر کو ظلماً شہید کیا۔ عثمان رضی اللہ عنہ، فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قاتلوں صرف یہ سازش نہیں کی کہ امیر المومنین کو شہید کیا بلکہ ان بے دینوں نے اسلامی نظریات وعقائد کے خلاف سازش کا تانا بانا بھی بنا اور اسلامی امیر کو شہید بھی کیا۔ میں ضمنی بات کرتا چلوں۔ زندگی مستعار ہے اس کی ڈور اللہ کے دستِ قدرت میں ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم ہر سال اکٹھے ہوں اور ہم میں سے ہر ایک موجود ہو تو جو لمحہ بات کرنے کے لیے نصیب ہو جائے، وہ غنیمت ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس ظلم سے شہید کیے گئے کہ تاریخ انسانی کوئی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی کہ اتنا طاقتور حکمران چند سو افراد نے اس طرح بے دردی سے شہید کر دیا۔ جس کی طاقت اتنی ہے کہ اس کی فوجیں افریقہ فتح کر چکی ہیں۔ چین پر دستک دے رہی ہیں۔ سارا افغانستان روند کر نکل چکی ہیں۔ ہندوستان کا بیشتر حصہ لے چکی ہیں۔ سمندروں پر اس کی سلطنت موجود ہے۔ براعظموں پر اس کی حکومت موجود ہے اور اس روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کا اکیلا حکمران ہے اور اسے چند سو باغی شہید کر دیتے ہیں اور وہ اف نہیں کرتا، کیوں؟ کم وبیش چالیس روز کے قریب اس کا پانی بند رہتا ہے اور وہ پیاس برداشت کرتا ہے اور عجیب بات ہے مکان کی بالکونی میں کھڑا ہو کر کہتا ہے، پانی روکنے والو! مجھے جانتے ہو؟ میں وہ عثمان ہوں کہ جب یہود مسلمانوں کو پانی نہیں دیتے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ کوئی میرے ساتھ سودا کرے۔ یہ کنواں خرید کر مسلمانوں کو دے دے۔ اس کے بدلے مجھ سے جنت کی نہریں اور جنت کے محلات لے لے۔ میں نے یہ کنواں خرید کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تھا جس کنویں کا پانی آج تم میرے گھر آنے سے روک رہے ہو۔ تو اس نے اپنے خادموں کو، اپنے سپاہیوں کو، اپنے جرنیلوں کو، اپنی فوج کو حکم کیوں نہ دے دیا؟ ہزار نہ سہی بارہ سو سہی، کئی سو سہی، ان کے پرخچے اڑا دیے جاتے۔

یہ لوگ تھے کون؟ آپ کو پتہ ہے کہ اسلام کی سب سے زیادہ مخالفت یہود نے کی۔ مکہ کے مشرک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض سیکھنے مدینے میں یہود کے علماء کے پاس آتے تھے وہ انہیں سکھا کر بھیجتے تھے کہ یہ سوال جا کر کرو۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو سب سے زیادہ مخالفت یہود نے کی حتیٰ کہ بدر واحد کا سبب بھی وہی بنے۔ پھر غزوۂ احزاب یا خندق میں یہود کی ریشہ دوانیوں سے سارے کفار جمع ہو کر مدینہ پر حملہ آور ہوئے۔ یہود نے وعدہ کیا تھا کہ مدینہ پر اگر حملہ ہوا تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیں گے لیکن مشرکین کا ساتھ دیا اور مخبری بھی کی اور انہیں پیچھے سے حملہ کرنے کی دعوت بھی دی۔ تو اللہ نے مشرکین کو شکست

دی اور اپنے نبی علیہ السلام کو حکم دیا کہ زرہ مت کھولیے، پہلے بنو قریظہ کی خبر لیجیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصل دشمن یہ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حدیبیہ کے مقام پر تھے اللہ نے حکم دیا کہ مشرکین مکہ سے فی الوقت صلح کر لیجیے واپس لوٹ جایے اور پہلے یہود کی خبر لیجیے، پہلے خیبر فتح کیجیے، مکہ آپ کا ہے، فتح ہو جائے گا۔ یہ محض مشرک ہیں جبکہ وہ سازش کا گڑھ ہے۔ پہلے اسے ختم کیجیے۔ پھر قیصر و کسریٰ کو بھڑکانے والے یہودی تھے جو جزیرہ نمائے عرب سے خانہ بدر کیے گئے۔ انہوں نے جا کر انہیں بھڑکایا کہ یہ طاقت تمہیں ہڑپ کر جائے گی یہ تمہارے مقابلے میں ابھر رہی ہے اسے تباہ کر دو۔ ہر طاغوتی طاقت کو جب مروا چکے تو انہوں نے یہ سمجھا کہ اب میدان میں کھڑا ہونا ممکن نہیں۔ اب زیرِ زمین کوئی چال بُنا جائے تو انہوں نے خلاف اسلام ایک تحریک بنائی۔ جس کا تانا بانا عبداللہ ابن سبا نے بُنا جو یہودیوں کا بہت بڑا عالم تھا۔ اور اس نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا لیکن وہ منافق تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد سب سے پہلا جو کام اس نے کیا کہ اہلِ بیتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے، بہت زیادہ غلو کی حد تک عقیدت کا اظہار کرتے کرتے اس نے اپنا حلقۂ اثر قائم کیا۔ پھر اس نے یہ بات ایجاد کی کہ خلافت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حق تھا، انہیں نہیں دی گئی۔ اس نے ریشہ دوانی سے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف پوری تحریک منظم کی کوفہ میں بصرہ میں اور مصر میں، یہ قاتلان حضرت عثمانؓ وہاں کے باغی تھے۔ ابنِ سبا کے سکھائے ہوئے سوالوں کو لے کر مدینہ منورہ آئے۔ طبری میں بھی موجود ہے ان کے سوالوں کے جواب امیر المومنین نے مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں دیے لیکن انہیں قتل نہیں کروایا کیوں کہ بصیرتِ عثمانی دیکھ رہی تھی کہ ان لاشوں پر ایک نئے مذہب کی بنیاد پڑ جائے گی۔ اسلام میں اختلاف کا دروازہ کھل جائے گا اور انہیں پروپیگنڈہ کرنے کا موقع مل جائے گا کہ واقعی یہ خلافت کے غاصب تھے جنہوں نے اعتراض کیا، انہیں قتل کروا دیا۔ وہ حادثہ، وہ پلیٹ فارم جو شہادتِ عثمانؓ کے برسوں بعد حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سادگی انہیں دے گئی، بصیرتِ عثمانی نے ان بے ایمانوں کو نہیں دیا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک پل میں انہیں قتل کروا سکتے تھے لیکن اسی قتل پر مرثیے شروع ہو جاتے، اسی پر نوحہ خوانی ہوتی اور وہیں سے خلاف اسلام نیا مذہب شروع ہو جاتا۔ ان کی بصیرت نے چالیس دن پیاسا رہنا گوارا کر لیا۔ یکہ و تنہا قرآن پڑھتے ہوئے شہید ہونا، سارا گھر لٹوانا گوارا کر لیا۔ قوت سلطنت، اقتدار و اختیار کے باوجود لیکن کسی بے دین کو خلافِ اسلام کوئی تحریک منظم کرنے کا موقع فراہم نہ کیا۔ وہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس کے متعلق اللہ کا نبی علیہ السلام فرماتا ہے کہ اس سے تو اللہ کے فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔ وہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس نے کتنی مرتبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جنت میں گھر خریدے۔ وہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یکے بعد دیگرے دو بیٹیاں نکاح کر کے دیں اور فرمایا اگر میری اور بیٹیاں ہوتیں اور وہ عثمانؓ کے عقد میں فوت ہوتی جاتیں میں یکے بعد دیگرے اس کو دیتا چلا جاتا۔ وہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسا تو نہیں تھا جیسے آج کے معترض سمجھتے ہیں کہ وہ حالات کو نہیں سمجھتا تھا اور آج کا مُلّا جس سے ایک مسجد کا انتظام نہیں سنبھالا جاتا، اعتراض کرتا ہے اس عظیم ہستی پر جو فاتح ہے افریقہ

سے لے کر ہسپانیہ تک کا اور ہسپانیہ سے چائنہ تک کا۔ وہ ان حالات کو نہیں سمجھ سکا؟ بڑا سمجھتا تھا اور بڑی مشکل قربانی تھی جو اس نے دی کہ اتنی بڑی طاقت ہو کر چند سو آدمیوں کے ہاتھوں بے بسی سے شہید ہونا گوارا کر لے لیکن انہیں خلاف اسلام پروپیگنڈہ کرنے کا پلیٹ فارم مہیا نہ کرے۔ اس کی کتنی بڑی قیمت دی حضرت عثمانؓ نے۔ یہ اُنہی کا حوصلہ، اُنہی کا جگر، اُنہی کا دردتھا، جو اتنی قیمت دے گیا۔

اور پھر انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر دھوکے سے انہیں بلا کر ظلماً شہید کر کے ایک پلیٹ فارم بنالیا۔ خانوادۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت اس لیے تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کلمہ اسلام سکھایا **لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ** شہادت کے بعد اس میں تین جملوں کا اضافہ ہو جائے؟ اس لیے تھی کہ اسلام کے مقابل ایک باطل دین بنالیا جائے اور عبادات کی جگہ رونا پیٹنا شروع ہو جائے اور برائیوں کو عبادت قرار دے دیا جائے؟ اور عبادت کرنے والوں پر طنز کی جائے، صحابہؓ کو گالیاں دینا عبادت ہو جائے، اور قرآن کو اللہ کی کتاب ماننے سے انکار کر دیا جائے؟ یہ حاصل ہے کربلا کا؟ اور اس لیے جان دی تھی خانوادۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تو پھر یہ سازشی ٹولے کی کامیابی تھی کہ انہوں نے حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر، انہیں دھوکا دے کر، ظلماً شہید کر کے، ان کے بچوں کو، ان کے خاندان کو شہید کر کے ان ظالموں نے اسلام کے خلاف ایک تحریک منظم کی اور ایک نیا مذہب بنا دیا۔ ہاتھ دھونے سے لے کر مرنے اور جینے تک۔ حلال اور حرام، نکاح اور طلاق، جنازہ کوئی چیز آپ دیکھ لیجیے ہر چیز میں انہوں نے اسلام سے الٹ بنا کر رکھ دی۔ بلکہ اس تحریک کا اصول یہ ہے، آپ ان کی فقہی کتابوں میں دیکھیے کہ کہیں کوئی ان کا اپنا عالم نہ ہو اور مسئلہ بتانے والا کوئی نہ ہو تو کسی سنی عالم سے پوچھ لو تو جو وہ کہے، اس کے الٹ کر لو، وہ تمہارا مذہب ہے۔

اور وہ مسلمان تھے اسی لیے اللہ نے انہیں سلطنت دی کہ روئے زمین کا اقتدار رکھتے ہوئے بے بسی سے ذبح ہونا گوارا کر لیا لیکن دین کے خلاف پلیٹ فارم مہیا نہیں کیا۔ کوئی لٹا سکتا ہے اتنا کچھ؟ کتنے حوصلے کی بات ہے۔ اس لیے اس ٹولے کی یہاں مثال دی گئی۔ **مَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ**۔ ایسی ریاست کے خلاف جو تانے بانے سازش کے بنے گا وہ کافر نہ صرف کافر ہوگا، بدکار ہوگا **فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ** بدترین کافر ہوگا۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ ۔لوگو! اللہ کی عبادت کا حق ادا کرو عبادت کو رسم نہ بناؤ، عبادت کو اس طرح کرو کہ وہ اللہ کی عبادت ثابت ہو اور مال کی محبت کے اسیر نہ ہو جاؤ۔ اس کی راہ میں لٹانا سیکھو، ختم نہیں ہوگا۔ وہ تمہیں بن مانگے اتنا دے گا کہ تم سے ختم ہی نہیں ہوگا۔ تم اس کی راہ پر لٹا کر تو دیکھو۔ صحابہؓ نے گھر چھوڑ دیئے، مال لٹا دیئے، پھر مدینہ کی گلیوں میں اللہ نے سونے چاندی اور جواہرات کے انبار لگا دیئے۔ ساری دنیا کی دولت سمیٹ کر ان کے قدموں میں ڈھیر کر دی۔ بڑے بڑے شہنشاہوں کے وہ تاج جو ظلم و جبر سے انہوں نے لوگوں سے دولت چھین چھین کر جواہرات سے مرصع کئے تھے، ہتھوڑوں

اور چھینوں سے توڑ توڑ کر مدینہ کی گلیوں میں فقراء پر بانٹے گئے۔

وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۔ نبی علیہ السلام کی غلامی کر کے تو دیکھو۔**لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ** ۔جن کے پاس ماڈرن ٹیکنالوجی ہے، جدید وسائل اور ذرائع ہیں، بہت بڑی فوجیں ہیں۔جن کے فوجی بہت معروف ہیں۔اللہ کریم فرماتے ہیں، **لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ** اور کافرو یہ گھمنڈ نہ رکھو کہ دنیا پہ تمہارا غلبہ رہے گا۔دنیا تمہارے باپ کی بنائی ہوئی نہیں ہے۔یہ طاقتیں تمہاری نہیں ہیں۔ارے تم دنیا کو روتے ہو۔**وَمَاْوٰھُمُ النَّارُ** تمہارے لیے تو دوزخ کا منہ کھلا ہوا ہے۔تم تو دنیا میں تب موج کر رہے ہو کہ مسلمان کوئی نہیں رہا۔کاش کوئی میرا بندہ ہوتا، کاش کوئی مجھے پکارتا، کاش کوئی میرے نبی علیہ السلام کی غلامی کا حق ادا کرتا تو تمہیں تو دھکیل کر جہنم میں پھینکتا جو تمہارے لیے منہ کھولے کھڑی ہے۔تم کہاں کی سپر پاور بنے پھرتے ہو، تمہاری حیثیت کیا ہے۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ. کافرو! کان کھول کر سن لو، اس گھمنڈ سے نکل جاؤ کہ زمین پر تمہارا ہی غلبہ رہے گا اور تم اللہ کو بھی عاجز کر چکے اور اب تمہارا اللہ بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔تمہیں اس لیے فرصت ہے کہ کوئی میرے نبی علیہ السلام کی غلامی کا حق ادا نہیں کر رہا اور اللہ کو کیا ضرورت ہے کہ ایک بدکار کو دوسرے بدکار پر فتح دے۔یہ تو وسائل کی بات ہے۔ایک کے پاس وسائل زیادہ ہیں، وہ پیٹے گا۔دوسرے کے پاس زیادہ نہیں؛ وہ پٹے گا۔لیکن اگر ایک طرف اللہ کا اپنا بندہ، اللہ کے نبی علیہ السلام کا غلام ہو تو وہاں وسائل کی نہیں، وہاں قدرت باری کی طاقت اس کے ساتھ ہوگی۔تو فرمایا کافر و تم سپر پاور نہیں ہو۔تم موج اس لیے کر رہے ہو کہ دنیا سے مسلمان گئے۔تمہاری ٹیکنالوجی نہیں، تمہاری دولت مندی نہیں، تمہاری عیش کا سبب تمہاری افواج بھی نہیں، تمہاری موج کا سبب یہ ہے کہ دنیا سے مسلمان گئے۔کوئی ہے نہیں دنیا میں ایسا جس کو میں طاقت دوں، جس کی میں مدد کروں، جس کے ساتھ میں فرشتوں کو حکم دوں کہ جاؤ اس کے ساتھ کھڑے ہو کر لڑو۔**مَاْوٰھُمُ النَّارُ** تمہارے لیے تو جہنم کا منہ کھلا ہوا ہے۔**وَلَبِئْسَ الْمَصِیْرُ** اور وہ بدترین ٹھکانہ ہے کافر کے لیے۔

تو یہ کافر کیوں موج کر رہا ہے؟ اس کا باعث کون ہے؟ میں اور آپ، ہماری نمازیں بے اثر، ہمارے سجدے بے ذوق، ہمارے یقین کمزور اور ہمارے کردار قابل نفرت بن گئے۔ہم نے دین کو بھی ذریعۂ معاش بنایا۔عزت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیچ کھایا۔اللہ کے قرآن اور اللہ کے دین کو بیچ کھایا۔

کافر نے جدید ٹیکنالوجی سے دنیا کمائی۔ہم نے بزرگوں کی قبریں اور ہڈیاں بیچیں، ہم نے اللہ کی کتاب کو بیچا، اللہ کے دین کو بیچا۔اس کردار پر بھی ہم یہ امید رکھیں کہ ہمارے ساتھ وہ امداد ہو جو ابوبکر صدیق ؓ کے ساتھ تھی۔ہمارے ساتھ وہ رحمتِ الٰہی ہو جو عثمان شہید ؓ کے ساتھ تھی۔ہم پر اللہ کا وہ کرم ہو جو خلفائے راشدین ؓ پر اور خانوادہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا تھا۔وہ موت کے متلاشی، ہم زندگی کے بھکاری۔وہ سب کچھ لٹانے والے، ہم ایک ایک لقمہ مانگنے والے۔ان کی راتیں اس کا

دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے، ہماری راتیں خوابِ غفلت میں سونے کے لیے۔ لن کے دن گھوڑوں کی پیٹھ پر جہاد میں، ہمارے دن کفار کی خوشنودی کی تلاش میں۔ ان کی تمنائیں اپنوں کو اس کے نام پر کٹوانے کے لیے، ہماری دعائیں اپنوں کو بچانے کے لیے۔ ارے کافر کی آبادی کا سبب ہم بن رہے ہیں۔ میں ہوں اور تم ہو۔ میں شاید دوستوں کو زندگی کی دعا نہ دے سکوں، میں شاید آپ کو فراخیٔ رزق کا کوئی وظیفہ نہ بتا سکوں، میں آپ کو شاید کوئی ایسی تسبیح نہ دے سکوں جو آپ کے عہدے میں ترقی کا سبب ہو لیکن میں آپ کو وہ راستہ ضرور دکھا رہا ہوں جہاں آپ اللہ کی راہ میں جان دے سکتے ہیں۔ اور میں پہلے بھی کہتا ہوں اور میں اب بھی آپ سے کہہ رہا ہوں کہ ہر آنے والے کو اللہ کا نام سکھانا یہ میری ذمہ داری ہے، میری نوکری ہے۔ یہ خدمت میرے ذمے ہے۔ لیکن کن لوگوں کو میں چاہتا ہوں، کنہیں میں اون (OWN) کروں گا، کنہیں میں اپنا سمجھتا ہوں، کن لوگوں کو میں پسند کرتا ہوں کہ میں اللہ کی بارگاہ میں پیش کرسکوں۔ وہ جو مرنے کے لیے آتے ہیں۔ میرے پسندیدہ لوگ یا میرے دوست وہ ہیں جو لٹانا چاہتے ہیں، جو جان دینا چاہتے ہیں۔ زندگی کے طالبوں کے لیے شاید میرے پاس دعا بھی کوئی نہیں۔ اس لیے کہ زندگی ہمیں ملی ہی لٹانے کے لیے ہے۔ لینا ہماری مجبوری نہیں ہے ہمارے مانگنے سے نہیں ملتا۔

ہم نہیں تھے تو باپ کے صلب میں کس کے کہنے پر ہمارے ذرات جمع ہوئے۔ ہم نہیں مانگ سکتے تھے تو ماں کے سینے میں کس کے کہنے پر نہریں جاری ہوئیں۔ ماں کے پیٹ میں ہمیں کس دعا کے بدلے رزق دیتا تھا۔ ہم بچے تھے تو ہماری حفاظت کے لیے کس نے مائیں اور باپ بنا دیئے۔ ہمارے پاس جب کچھ بھی نہیں تھا، جب دانت نہیں تھے دودھ دیا جب دانت دیے تب نہیں دے گا۔ ارے جب مانگنے کے قابل نہیں تھے، سب کچھ دیا۔ اب ہم ساری توجہ، سارا زور مانگنے پر لگائے رکھیں؟ تم لٹا کے دیکھو، دینا اس کا اپنا کام ہے، زندگی ایسا قرض نہیں جو مانگنے سے ملے۔ مل چکی ہے، اب اسے لٹا کے دیکھو۔ اسے مانگنا، اسے بڑھانا، تمہارے بس میں نہیں۔ ہمیں ایک اختیار رب نے دیا ہے، ہم اسے ضائع بھی کر سکتے اور اسے خرچ بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے نام پہ بھی دے سکتے ہیں اور خودکشی بھی کر سکتے ہیں اور فضولیات سے اسے ضائع بھی کر سکتے ہیں۔ اب یہ مانگنے سے بڑھے گی نہیں، جو مانگتے ہیں ان کی بھی بڑھے گی نہیں، خوش نصیب وہ ہیں جو اسے لٹا کے جائیں گے۔

تو یہ مراقبات، یہ ذکر، یہ سلسلے، اس لیے ہیں کہ اللہ سے وہ رشتۂ الفت استوار ہو جائے۔ کہ اس کے نام پر موت قبول کی جا سکے۔ جو موت سے گھبراتا ہے، اسے میں بروقت مطلع کر رہا ہوں کہ بے شک اپنا راستہ بدل لے۔ بے شمار خانقاہیں ہیں، بے شمار دروازے ہیں، بے شمار دربار زندگیاں بانٹ رہے ہیں، بے شک وہاں چلا جائے۔ یہاں موت کی نوید ہے۔ یہاں ان لوگوں کی ضرورت ہے جو زندگی لٹانا چاہتے ہیں۔ یہاں سے وہی لوگ کچھ حاصل کریں گے کہ جو کچھ ان کے پاس ہے، وہ بھی لٹانا چاہیں، ہمارے پاس ایک ہی جذبہ ہے۔ کسی کے اقتدار کے لیے نہیں، کسی کے وقار کے لیے نہیں، کسی دنیوی دولت کے لیے نہیں صرف بقائے اسلام کے لیے، اسلام کے اقتدار کے لیے، اللہ کی حکومت کے لیے اللہ کے دین کی سلطنت کے

لیے، جان کی بازی لگانا چاہتے ہیں۔ ہمیں موت چاہیے اور وہ دوست چاہئیں جو ساتھ مرنا چاہتے ہوں۔ اور یہی مطالبہ ہے اللہ کی کتاب کا، اللہ کے دین کا۔ حیات تو بغیر مانگے مل چکی تم کیا مانگتے ہو، اب تو باری موت کی ہے۔ تو اگر ہمارے پاس اقتدار و اختیار نہیں اور ہماری وجہ سے دین کے پاس اقتدار نہیں۔ اس میں افراد کی بات نہیں ہے کہ مجھے حکومت مل جائے یا آپ کو۔ بات یہ ہے کہ جو جہاں ہے، اقتدار اسلام کا قبول کرلے۔ حکومت وہی کرے، صدارت وہی کرے، وزارت عظمٰی وہی کرے لیکن شیطانوں کے قوانین نافذ نہ کرے، اللہ کے فرامین نافذ کرے۔ اگر یہ نہیں ہو رہا تو پھر ہم میں کمزوری ہے۔ اللہ اپنے وعدے پہ قائم ہے۔ تم اس کا معیار پورا کرو، وہ اپنا وعدہ پورا کرنے پہ قادر ہے۔ کوئی طاقت نہیں روک سکتی، کوئی نظام نہیں روک سکتا دنیا کا کوئی معاشی نظام دنیا کا کوئی سیاسی نظام اللہ کے دین کے نفاذ کا راستہ نہیں روک سکتا۔ یہ روکا ہوا ہے، میں نے، آپ نے مسلمانوں نے، اللہ کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا نہ کر کے ہم نے اسلام کا راستہ روکا ہوا ہے۔ اللہ ہمیں معاف فرمائے، ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرمائے۔ ہمیں وہ جذبہ، وہ قوت، وہ طاقت دے کہ ہم اس کے دین کو سمجھیں، اس کی ذات کی عظمت کو سمجھیں۔ ہمیں وہ رشتۂ الفت دے کہ ہم اس کے نام پر مرسکیں، ہمارے ذرّات بھی جس مٹی میں پنہاں ہوں، اس مٹی سے بھی عظمتِ الٰہی کی روشنی پھوٹے۔ ہماری زندگی، ہمارا جینا، ہمارا مرنا، اس کی ذات کے لیے ہو جائے اور اللہ ایسا موسم دیکھنا نصیب فرمائے کہ اس مملکتِ خداداد پر اور اس کی وساطت سے روئے زمین پر اللہ کے دین کی حکومت قائم ہو۔

اللہ کریم ہماری لغزشوں، ہمارے گناہوں سے درگزر فرماتے ہوئے ہمیں معاف فرمائے اور ہمیں اس قابل بنائے کہ ہم اپنے دین کی سلطنت و حکومت دیکھ سکیں۔ کاش ہم بھی یہ لمحہ آیا ہوا دیکھیں کہ کوئی سر سوائے اللہ کے کسی کے سامنے نہ جھکتا ہو اور کسی کو اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو۔ کسی کی مال، جان آبرو کی طرف نظر اٹھانے کا کوئی سوچ نہ سکے۔ ظالموں کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور غرور و تکبر کی گردن نیچی ہو جائے۔

تفصیل کے لیے ان آیات کی تفسیر کا مطالعہ اسرار التنزیل سے کیجیے۔

☆ ☆ ☆

اسباق حدیث شریف

سبق نمبرا

''عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ''

(متفق علیہ مشکوٰۃ)

ترجمہ: اعمال کی بنیاد نیت پر ہے۔

الحمدللہ! آج ہشت روزہ تعلیمی، تربیتی اور اصلاحی پروگرام شروع ہو رہا ہے جس کا یہ حصہ علم حدیث سے تعلق رکھتا ہے۔ سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ معلوم ہو کہ حدیث کسے کہتے ہیں اور ہم اس کا مطالعہ کیوں کریں۔ حدیث کے لفظی معنی ہیں 'بات'۔ اور اصطلاحِ شریعت میں یہ لفظ ہر بات کے لیے نہیں بلکہ ایک خاص بات کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور وہ خاص بات کیا ہے؟ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول فعل اور پسند و ناپسند کے بیان کو حدیث کہتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ اس کے مطالعہ کی ضرورت کیا ہے۔ تو اس بات پر غور کیجیے کہ اعلان نبوت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم تیئس برس اس دنیا میں جلوہ افروز رہے۔ کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوی زندگی 23 برس کے عرصہ پر پھیلی ہوئی ہے۔ اتنے عرصے میں آپ نے کتنی باتیں کی ہوں گی۔ کتنے کام کیے ہوں گے اور کتنی چیزوں کے پسند و ناپسند کا اظہار کیا ہوگا۔ یہ چیزیں شمار میں نہیں آسکتیں مگر یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے بلکہ لازماً آتی ہے کہ نبوت ایک خاص منصب ہے۔ اس کا ایک خاص مقصد ہے اور نبیؑ کی پوری زندگی اس مقصد کے گرد گھومتی ہے۔ اس لیے نبیؑ کی ہر بات بلکہ ہر حرکت دراصل اس مقصد کی تکمیل کا حصہ ہوتا ہے۔ اور وہ مقصد انسانیت کو ہدایت کا رستہ دکھانا اور نبیؑ کی بات ماننے والوں کو اس راستے پر چلنے کا سلیقہ سکھانا ہے۔ اس کام کے لیے نبیؑ کو اللہ کی طرف سے ایک ہدایت نامہ ملا کرتا ہے، جسے کتاب ہدایت کہتے ہیں۔ ہمارے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کتاب ہدایت ملی، اس کا نام قرآنِ حکیم ہے۔ پس ہر حدیث دراصل قرآنِ حکیم کی علمی یا عملی تفسیر ہوتی ہے۔ جب انسان کے لیے اس کتاب ہدایت کا علم حاصل کرنا ضروری ہے اور وہ علم اس کتاب کے معلم ہی سے سیکھا جاسکتا ہے، اس لیے معلوم ہوا کہ حدیث کے بغیر اس کتاب کو کما حقہ، سمجھا ہی نہیں جاسکتا۔ ہم چونکہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری نبی اور رسول مانتے ہیں، اس لیے حدیث کا مطالعہ ہمارا دینی فریضہ ہے اور ہماری زندگی کی اہم ضرورت ہے۔

دوسری بات یہ سمجھنا ضروری ہے کہ حدیث ہم تک کیسے پہنچی۔ تو ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنیں، انہیں زندگی بسر کرتے دیکھا، جنہوں نے عقیدت اور محبت کی نگاہ سے دیکھا، انہوں نے نبیؐ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں ذہن میں محفوظ رکھیں، ان کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنایا۔ جو لکھنا جانتے تھے، انہوں نے تحریری طور پر بھی محفوظ رکھیں

اور پھر دوسری نسل کو وہ علمی اور عملی ذخیرہ منتقل کیا۔ اس طرح نسل در نسل یہ ذخیرۂ حدیث منتقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچا۔ تو وہ حضرات جنہوں نے سب سے پہلے یہ کام کیا، وہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے براہ راست شاگرد ہیں جن کو صحابہ کرامؓ کہتے ہیں۔ وہ امت کے محسن ہیں۔ امت ان کے احسان کا شکریہ ادا ہی نہیں کر سکتی۔ علم حدیث ان محسنین کی عظمت اور احسان کو پہچاننے کا ایک ذریعہ بھی ہے اور احسان شناسی کا یہ تقاضا بھی ہے۔

سبق کی پہلی حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمل کی قبولیت کا مدار نیت پر ہے۔ ایک ہوتی ہے صورتِ شئے وہ ان سر کی آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے۔ ایک ہوتی ہے حقیقتِ شئے جس کے لیے بصیرت درکار ہوتی ہے۔ انسان جو کام بھی کرتا ہے، دیکھنے والے صرف اس کی ظاہری صورت دیکھتے ہیں۔ یہ جاننا مشکل ہے کہ یہ کام یہ شخص کیوں کر رہا ہے، اس کا مقصد کیا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ اس کے دل میں وہ کون سا جذبہ ہے جو اس سے یہ کام کرا رہا ہے۔ اس جذبے کو نیت کہتے ہیں۔ اگر وہ جذبہ صرف اللہ کی رضا اور اس کی محبت واطاعت کا جذبہ ہے تو اسے خلوصِ نیت کہتے ہیں اور صرف اس کی وجہ سے یہ کام اللہ کے ہاں قبولیت کا درجہ پاتا ہے۔ اگر نیت درست نہ ہو تو ظاہری طور پر وہ کام خواہ کتنا سنوار کے کیا جائے، وہ قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ ہاں! یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ خلوصِ نیت کا سوال ایسے کام کے سلسلے میں پیدا ہوگا جو اللہ کو پسند ہے۔ جو کام اللہ کو پسند ہی نہیں، برا کام ہے، اس میں خلوصِ نیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی تک ہی نہیں کہ آدمی کہے میں خلوصِ نیت سے چوری کر رہا ہوں یا بڑی نیک نیتی سے شراب پی رہا ہوں۔

جب عمل کی قبولیت کا مدار نیت پر ٹھہرا تو معلوم ہوا کہ آدمی کو صرف کام کرنے پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیشہ اپنے دل پر نگاہ رکھنی چاہیے اور نیت میں کھوٹ کو داخل نہ ہونے دے ورنہ ساری محنت رائیگاں جائے گی۔

حدیث نمبر ۲

"عَنْ سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الثَّقَفِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ "قُلْ لِيْ فِي الْاِسْلَامِ قَوْلًا لَا اَسْئَلُ عَنْهُ اَحَداً بَعْدَكَ قَالَ قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ"

(مشکوٰۃ۔ کتاب العلم۔ الفصل الاول)

ترجمہ: کہو میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر قائم رہو۔"

تشریح: اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ ایک صحابیؓ نے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے بارے میں کوئی ایسی جامع نصیحت فرمائیں کہ اس سلسلے میں کسی سے پھر پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں یہ فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پر سچے دل سے ایمان لا۔ تیرا دل بھی یہ کہے اور

زبان بھی یہ کہے کہ میں اللہ پر ایمان لایا۔ یہ بات صرف زبان ہلانے تک نہ ہو بلکہ دل کی گہرائیوں میں یہ حقیقت گھر کر جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے یہ عہد کیا کہ میں اپنی پوری زندگی میں صرف وہی کام کروں گا جس کے کرنے کا اللہ مجھے حکم دے گا۔ اللہ کے مقابلے میں کسی کی بات نہیں مانوں گا۔ پھر یہ کہہ دینا کسی ایک موقع کے لیے یا کسی ایک دن کے لیے یا کسی ایک کام لے لیے نہ ہو، بلکہ زندگی بھر اس عہد پر جمارہ قائم رہ اور ڈٹا رہ، بس سارا دین یہی ہے۔

تعلیم مذہبی کا خلاصہ یہی تو ہے — سب مل گیا اسے جسے اللہ مل گیا

حدیث نمبر ۳

''عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہ عنہ قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ " طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ''

(مشکوٰۃ۔ کتاب العلم۔ الفصل الثانی)

ترجمہ: ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔''

تشریح: مطلب یہ ہے کہ زندگی نام ہے حرکت اور عمل کا۔ اور عمل کے لیے علم ضروری ہے۔ یعنی یہ جاننا ضروری ہے کہ میں کون سا کام کروں اور کیسے کروں۔ اور مسلم وہ ہے جس نے **لاالٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ** پڑھ کر اپنے اللہ سے یہ عہد کیا کہ میں صرف اللہ ہی کی عبادت کروں گا۔ اسی کی بات مانوں گا اور اس طریقے سے مانوں گا جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سکھائیں گے۔ اس لیے مسلم کے لیے یہ ضروری ہوا کہ یہ جاننے کی کوشش کرے کہ میرے اللہ نے کون سا کام کرنے کو کہا ہے اور میرے ہادی نے اس کا کیا طریقہ بتایا ہے۔ اسی کا نام دین ہے اور یہی علم ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ لفظ مسلمان جس طرح مرد کے لیے بولا جاتا ہے اسی طرح عورت کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ دین کا علم حاصل کرنا ہر اس شخص کا فرض ہے جس کے لیے مسلمان کا لفظ بولا جاتا ہے، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ ہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ دین کا علم کسی دیندار ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے ورنہ وہ معلومات ہوں گی، دین کا علم نہیں ہوگا۔

سبق نمبر۲

حدیث نمبر۴:

"عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ" بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ کَھَاتَیْنِ"

(مشکوٰۃ۔ باب قرب الساعہ۔ الفصل الاول)

ترجمہ: میں اور قیامت ان دو کی مانند ہیں۔ بھیجا گیا ہوں میں اور قیامت ان کی دو کی مانند۔

تشریح: نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھا تین یعنی ان دو کی مانند فرما کر اپنی دو انگلیاں ایک دوسری پر ساتھ ملا کر دکھائیں کہ ان دو انگلیوں کی مانند ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بات سمجھانے کا طریقہ یہ ہوا کرتا تھا کہ آپؐ نے ہر وہ ذریعہ اختیار کیا جو انسانی فطرت کے عین مطابق ہو اور انسانی نفسیات کا وہ مطالبہ ہو۔ چنانچہ مثال دے کر بات سمجھانے کا طریقہ ایسا زود اثر اور دل میں اتر جانے والا ہوتا ہے کہ اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا، جب ہی تو اللہ کریم نے اپنی آخری کتاب میں جا بجا مثالوں کے ذریعے حقائق اور بڑے بڑے مشکل مسائل سمجھائے ہیں۔ مثال کے انتخاب میں یہ اصول پیش نظر ہوتا ہے کہ مثال نہایت قریبی ماحول سے ہو اور اس کے متعلق انسانی ذہن میں ایسا پختہ یقین ہو کہ اس سے انکار کرنا ممکن ہی نہ ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اور قیامت کی مثال کے لیے اپنی دو انگلیوں کو باہم ملا کر دکھایا کہ یہ صورت ہے۔ اس میں دو باتیں بالکل ظاہر ہیں۔ اول یہ کہ ملی ہوئی دو انگلیوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ ان دونوں کے درمیان کوئی اور چیز نہیں۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا کہ میرا دور اور قیامت بالکل ملے ہوئے ہیں، ان کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ میرے بعد قیامت تک کوئی نیا نبی نہیں آئے گا۔ یعنی میں آخری نبیؐ ہوں اور تم آخری امت ہو۔ اس سے ایک تو ختم نبوت کی واضح دلیل سامنے آ گئی کہ اب انسانیت کو انسانیت کی ہدایت کے لیے کسی دوسرے کی آمد کا انتظار نہیں کرنا ہوگا، اس لیے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ دوسرا یہ کہ جو دین میں تمہیں دے کر جا رہا ہوں یہ ہر طرح مکمل ہے۔ اس میں کوئی کمی ہوتی تو کسی نئے ہادی کی ضرورت ہوتی۔ اب تمہارا کام یہ ہے کہ میری تعلیمات کو سینے سے لگاؤ اور میری اطاعت اپنا شعار بناؤ تا کہ تمہاری آخرت سنور جائے۔

حدیث نمبر ۵:

عَنْ اَبِی مَالِکِ الاَ شْعَرِی قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلیّٰ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلِّمَ ''اَلقُرَانُ حُجَّۃُ لَکَ اَوْ عَلَیْکَ''

(صحیح مسلم: باب فصل الوضوء)

ترجمہ: قرآن حکیم تیرے حق میں حجت ہے یا تیرے خلاف۔

تشریح: کسی کام کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے کوئی معیار، کوئی کسوٹی ضروری ہے، تا کہ صحیح ہونے کی صورت میں اس کا اجر اور غلط ہونے کی صورت میں اس کی سزا تجویز کی جائے۔

قیامت کے روز جب ہر شخص کا نامۂ اعمال پیش ہوگا تو صحیح یا غلط عمل کا فیصلہ جس معیار کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا وہ قرآن حکیم ہی ہوگا۔ یعنی انسان نے جو کام قرآن کی تعلیمات کے مطابق کیا ہوگا، وہ صحیح قرار دیا جائے گا۔ یعنی قرآن حکیم اس کے حق میں صحیح ثابت ہوگا۔ اور جو کام قرآن کی تعلیمات کے خلاف ہوگا، وہ غلط قرار دیا جائے گا اور آدمی سزا کا مستحق قرار پائے گا۔ گویا فیصلہ قرآن کی شہادت پر ہوگا۔ اگر آدمی کے حق میں قرآن نے شہادت دے دی تو آدمی سرخرو ہو گیا اور اگر قرآن نے آدمی کے خلاف شہادت دے دی تو اسے سزا سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ اب تم خود فیصلہ کرلو کہ قرآن سے بنا کے رکھنی ہے یا بگاڑ کے۔

حدیث نمبر ۶:

عَنْ جَابِرٍ ، عَنْ رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّہٗ قَالَ!

''لِکُلِّ دَاءٍ دَوَاءٌ''

(صحیح مسلم)

ترجمہ: ہر مرض کے لیے دوا موجود ہے۔

تشریح: مرض کا خالق بھی اللہ ہے اور اس کے حکم سے ہی بیماری آتی ہے۔ دوا بھی اسی نے پیدا کی اور دوا میں شفا بھی اسی نے رکھی ہے۔ اس نے ہر بیماری کے لیے دوا پیدا کر دی ہے۔ اگر طبیب نے صحیح دوا تجویز کر دی تو اللہ اسے شفا دے گا۔ دوا میں شفا اللہ ہی نے رکھی ہے۔ جیسا کہ اکبر نے کہا ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ دوا کچھ نہیں کرتی
کہتا ہوں کہ بے حکم خدا کچھ نہیں کرتی

اس لیے معلوم ہوا کہ بیماری کا علاج کرنا نہ تو تقدیر کے خلاف جنگ ہے، نہ کوئی گناہ کا کام ہے بلکہ علاج کرنا

ضروری ہے۔ہاں یہ یقین رکھنا ضروری ہے کہ شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اطبا کو تو اپنی فیس لینا اور دوا دینا

خدا کا کام ہے رحم و کرم کرنا، شفا دینا

جس طرح جسم کی ہر بیماری کے لیے دوا موجود ہے۔اسی طرح روح کی بیماری کے لیے بھی دوا موجود ہے اور روح کی ایک ہی بیماری ہے اور ہے مہلک۔ وہ ہے اللہ کی نافرمانی اور گناہ۔ اس کا علاج بھی ایک ہے اور ہے تیر بہدف اور وہ ہے استغفار یعنی اللہ سے گناہوں کی معافی مانگنا اور پھر گناہ نہ کرنے کا عزم کرنا۔ اللہ تعالیٰ اس کی توفیق دے۔ (آمین)

سبق نمبر ۳

حدیث نمبر ۷:

قَالَ نبی صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وسَلَّمُ

''اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ''

(نوادر الاصول فی احدیث الرسول)

ترجمہ: نماز دین کا ستون ہے۔

تشریح: تہذیب کے رنگ ڈھنگ بدلنے سے بعض پرانی اور سادہ سی باتیں سمجھ میں نہیں آ سکتیں۔ اسی مثال کو لیجیے،، پہلے لوگ عمارت بناتے تو ترتیب یوں ہوتی کہ ستون ہوتے، ان پر شہتیر یا کڑیاں ہوتیں، ان پر بالے ہوتے، اوپر پھسیاں یا سرکنڈا، اور پر مٹی گارا وغیرہ۔ مگر ساری عمارت ستون پر کھڑی ہوتی۔ اگر ستون سرکا دیا جاتا تو ساری عمارت دھڑام سے گر جاتی۔ اب جدید طرز پر بغیر ستونوں کے چھت ڈالی جاتی ہے۔ ستون سامنے ہوتا نہیں، بات کیسے سمجھ میں آئے۔ مگر پھر بھی یہ Pillar System ایسا طرز تعمیر ہے کہ ستون کی اہمیت سمجھ میں آ جاتی ہے۔ اس مثال سے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھایا ہے کہ نماز کی حیثیت ستون کی ہے جس پر آدمی کے دین کی عمارت کھڑی ہے۔ اگر آدمی نماز کی پابندی نہ کرے تو گویا اس نے ستون کھڑا ہی نہیں کیا، دین کی عمارت کیسے کھڑی رہ سکتی ہے؟ نماز کی اہمیت ایک اور مقام پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمائی۔ ''جس نے جان بوجھ کر نماز ترک کی، اس نے کفر کیا'' کفر کے معنی انکار ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جس نے عمداً نماز چھوڑی، اس نے اللہ کو معبود اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے سے انکار کر دیا۔ ایک اور موقع پر فرمایا کہ ''مومن اور کافر کے درمیان فرق صلوۃ ہے'' یعنی نماز کی پابندی اس بات کی علامت ہے کہ انسان مومن ہے اور اس نے اللہ کو معبود اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول تسلیم کر رکھا ہے۔ اور نماز کا ترک کرنا اس بات کی علامت ہوئی کہ وہ ان دونوں امور کو تسلیم

نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے۔

حدیث نمبر ۸:

عَنْ مُعَاذٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ " اَلصَّوْمُ جُنَّۃٌ"

(مشکوٰۃ۔ کتاب الایمان۔ الفصل الثانی)

ترجمہ: روزہ ڈھال ہے۔

تشریح: ڈھال کی حقیقت اور اس کی اہمیت سمجھنا بھی تہذیبی ترقی کی وجہ سے مشکل ہو گیا۔ پرانے زمانے میں جنگ کے لیے بڑا مؤثر اسلحہ تلوار ہوا کرتا تھا۔ اور تلوار کا وار روکنے کے لیے لوہے کا ایک توا سا ہوتا تھا جو سپاہی اپنے بائیں ہاتھ میں رکھتا تھا۔ دائیں ہاتھ میں تلوار ہوتی جس سے دشمن پر وار کرتا اور بائیں ہاتھ میں ڈھال کے ذریعے دشمن کے وار کو غیر موثر بناتا تھا۔ اس طرح اپنے آپ کو دشمن کے حملوں سے بچالیتا۔

اس حدیثِ پاک میں روزے کو جو ڈھال کہا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ایک سپاہی ہے جو ہر وقت، پوری زندگی میدان جنگ میں گزارتا ہے۔ کیونکہ اس کے دو دشمن ایسے ہیں جو نظر بھی نہیں آتے اور کسی وقت حملہ کرنے سے غافل نہیں ہوتے۔ لطف یہ کہ ان کو نہ نیند آتی ہے نہ ہی ضروریاتِ زندگی کی کوئی فکر ہے۔ اور وہ ہیں نفس اور شیطان۔ اور نفس تو ایسا دشمن ہے کہ دشمن بھی اور محبوب بھی۔ اس کے ہر مطالبہ کو پورا کرنے کے لیے آدمی بیقرار رہتا ہے۔ اس لیے ان دشمنوں کے حملوں سے بچنے کے لیے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس ہتھیار کی نشاندہی فرمائی، وہ روزہ ہے۔ مگر روزہ بچاؤ کیسے کرتا ہے؟ سنیئے انسان کی فطرت یہ ہے کہ اس کے دل میں ہر وقت طرح طرح کی خواہشات پیدا ہوتی ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ اس کی ہر خواہش پوری ہو۔ اور خواہش میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ آدمی یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتا کہ یہ خواہش کس قسم کی ہے۔ اس کا پورا کرنا میرے لیے مفید ہے یا مضر ہے۔ اگر معلوم ہو بھی جائے کہ مضر ہے، تب بھی پورا کر کے رہتا ہے۔ سگریٹ، چرس، ہیروئن، شراب، بھنگ وغیرہ کے متعلق کون نہیں جانتا کہ یہ مضر ہیں۔ مگر کوئی ہے جو اس خواہش کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ نفس ایک محبوب دشمن ہے۔ سب سے بری اور خطرناک خواہشیں دو ہیں۔ پیٹ بھرنے کا شوق اور جنسی لذت کا حصول۔ اور روزہ کیا ہے ان دو خواہشوں پر کنٹرول کرنے کی مشق۔ ادھر ان میں سے کوئی خواہش پیدا ہوئی، ادھر روزہ ڈھال بن کے مقابلے میں آ گیا۔ اور آدمی نفس و شیطان کے حملے سے بچ گیا۔ یہ کام ایسا کٹھن اور اتنا ضروری ہے کہ اس کے لیے مسلسل ایک مہینے کی مشق لازمی ہے۔ ہر سال یہ مشق پورے اہتمام اور پابندی سے کی جائے تو خواہشات پر کنٹرول کرنے کا سلیقہ بھی آ جاتا ہے اور ملکہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی کنٹرول کا نام قرآن کی زبان میں تقویٰ ہے۔ اللہ کریم نے روزے کا مقصد یہی بیان فرمایا کہ "لعلکم تتقون" یعنی تم پر روزے اس لیے فرض کیے گئے ہیں تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔

حدیث نمبر ۹:

عَنْ اَبِیْ مَالِکِ الْاَشْعَرِیِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ "اَلطُّھُوْرُ شَطْرُ الْاِیْمَانِ"

(مشکوٰۃ۔کتاب الطہارۃ۔الفصل الاول)

ترجمہ: صفائی اور طہارت ایمان کا حصہ ہے۔

تشریح: گندگی اور غلاظت خواہ کسی قسم یا کسی درجے کی ہو، انسان کی طبیعت اس سے نفرت کرتی ہے۔ وہ گندگی جو بالکل ظاہر ہو اور سر کی آنکھوں سے نظر آتی ہو، اس سے نفرت تو صرف وہی آدمی نہیں کرتا جو پاگل ہو، ورنہ ہر ذی ہوش انسان اس سے لازماً نفرت کرتا ہے۔ ایک گندگی ایسی ہوتی ہے جو نہ ظاہر ہوتی ہے نہ سر کی آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ جیسے بیماری کے جراثیم سمجھ لیجیے کہ نہ ظاہر ہوتے ہیں نہ سر کی آنکھوں سے نظر آتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر کہہ دے کہ اس چیز میں فلاں بیماری کے جراثیم ہیں تو کون ہے جو اعتبار نہ کرے اور نہ مانے۔ کیوں؟ اس لیے کہ ڈاکٹر پر اعتماد ہوتا ہے کہ یہ اس فن کا ماہر ہے۔ جو گندگی نظر آئے اس سے تو ہم خود بچتے ہیں۔ لیکن نظر نہ آنے والی ایک گندگی ایسی ہے کہ اس کے متعلق دنیا کے ایک مقدس ترین اور طاہر ترین انسان نے اپنے رب کے بتانے پر انسانیت کو بتائی۔ جس نے مان لیا، اس نے ثابت کر دیا کہ اس کا اس مقدس ہستی پر ایمان ہے۔ اب اس مقدس ہستی نے جو طہارت اور پاکیزگی کا حکم دیا تو اس کو ماننا ایمان کا حصہ ٹھہرا۔ پھر اس نے عام صفائی اور پاکیزگی کے علاوہ خاص اس وقت کے لیے جب انسان اپنے رب کی ملاقات کے لیے اس کے گھر جاتا ہے، خاص قسم کی طہارت کا حکم دیا جس کو وضو کہتے ہیں یہ تو لازماً ایمان کا حصہ ٹھہرا۔ اس سے انکار ممکن نہیں۔

سبق نمبر ۴

حدیث نمبر ۱۰:

عَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ "کُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ"

(مشکوٰۃ۔باب الاعتصام۔بالکتاب والسنۃ۔الفصل الاول)

ترجمہ: ہر بدعت گمراہی ہے۔

تشریح: بدعت کے لفظی معنی نو ایجاد چیز کے ہیں۔ اصطلاحِ شریعت میں بدعت سے مراد ہر وہ کام ہے جسے دین

یا عبادت یا ثواب کا کام سمجھا جائے مگر اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کام کو نہ دین قرار دیا ہو نہ عبادت۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی کام عبادت یا دین سمجھ کے کیا جائے تو وہ گمراہی کیوں قرار دیا۔

گمراہی کا مفہوم یا حقیقت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب یہ معلوم ہو کہ اصل راستہ کون سا ہے۔ تو اللہ کریم نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا کہ "وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ" (الانعام:153) یعنی یہ میرا راستہ سیدھا راستہ ہے اسی پر چلو دوسرے راستوں پر نہ چلو۔ وہ سیدھا راستہ کون سا ہے۔ جس کے متعلق اللہ کریم نے اعلان فرمایا "اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ"۔ (المائدہ:3) کہ آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا۔ یہی وہ سیدھا راستہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس راستے سے ہٹ کر جب کوئی اور راستہ اختیار کیا جائے گا تو اصل راستہ گم کر دیا جائے گا۔ اس لیے اس کو گمراہی کہیں گے۔

دین میں کوئی نئی بات پیدا کرنا اور اس کو عبادت سمجھ کے کرنا بظاہر ایک اچھا کام نظر آتا ہے اور بدعت کے محبوب ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس میں بڑا مزا اور "سواد" آتا ہے۔ مگر اس کے مردود ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی نئی بات ایجاد کر کے اسے دین کا حصہ بنایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ:

(۱) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کو نامکمل چھوڑ دیا، اب میں دین کو مکمل کر رہا ہوں۔

(۲) یا یہ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین پہنچانے میں سستی کی، میں اس کمی کو پورا کر رہا ہوں۔

اور یہ دونوں باتیں نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت توہین کی باتیں ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ بدعت دراصل نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہی کا نام ہے۔

امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے فرمایا کہ بدعت تو کفر سے بھی بری چیز ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ آدمی کفر سے توبہ کر لے مگر یہ ناممکن ہے کہ آدمی بدعت سے توبہ کرے۔ کیونکہ جب وہ عبادت سمجھ کے کر رہا ہے تو عبادت سے توبہ کیسے کرے گا۔ اگر آپ تمام بدعتوں کا جائزہ لیں تو آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ ہر بدعت کا تعلق یا تو کھانے سے ہوگا یا گانے سے یا دکھانے یعنی Show سے۔ اور یہ تینوں چیزیں نفس کے لیے بڑی مرغوب اور محبوب ہیں۔ اس لیے بدعت میں "سواد" بہت آتا ہے۔ مگر ہر بدعت کی خاصیت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے ایک سنت اٹھ جاتی ہے اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے دوری میں اضافہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بدعت سے محفوظ رکھے۔

حدیث نمبر ۱۱:

عَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ "اَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ"

(مشکوۃ۔ باب التسبیح والتحمید ،الفصل الثانی)

ترجمہ: سب سے افضل ذکر لا الہ الا اللہ ہے

تشریح: ذکر کے معنی ہیں یاد کرنا۔ اور یاد کرنا دراصل دل کا فعل ہے۔ مگر چونکہ زبان، دل کی ترجمان ہے اس لیے جب دل میں کسی کی یاد سما جائے تو زبان پر اس کا نام آ ہی جاتا ہے۔ اور یاد اسے کیا جاتا ہے جس سے محبت ہو۔ اور محبوب کئی ہو سکتے ہیں۔ فانی بھی اور باقی بھی۔ فانی کی محبت بھی فانی ہے اور باقی کی محبت بھی باقی اور دائمی ہے۔ اور باقی صرف ایک ذات ہے۔ اس لیے اس نے بتایا کہ " وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ "(البقرہ:165) یعنی مومن کی نشانی یہ ہے کہ اسے سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت ہوتی ہے۔ اس لیے یاد کرنے اور دل دینے کے قابل اللہ کی ذات ہی ہے۔ خوب کہا اکبر نے:۔

خدا ہی کو فقط حاصل ہے حق دلبری اکبر

دیا دل جس نے دنیا کو حقیقت میں وہ مشرک ہے

تو اس محبوب کو یاد کرنے کے بے شمار طریقے ہیں لیکن محبوب کے محبوب نے بتایا کہ بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس مفہوم کو دل میں جگہ دے کر ان الفاظ کے ساتھ اس محبوبِ حقیقی کو یاد کرو کہ عبادت کے لائق اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ یہ یقین دل میں ہو اور زبان پر یہ الفاظ ہوں "لا الہ الا اللہ۔" اگر دل کی گہرائیوں میں یہ یقین، یہ جذبہ، یہ محبت نہ ہو، صرف زبان پر یہ الفاظ ہوں تو اس سے زبان تو عبادت میں مشغول رہے گی مگر دل پر اثر کچھ نہیں ہوگا۔ اس لیے دل کی توجہ کے ساتھ زبان سے یہ ذکر افضل الذکر ہے۔ اللہ کریم توفیق دے۔ (آمین)

سبق نمبر۵

حدیث نمبر۱۲:

عَنْ كَعْبٍ قَالَ قَالَ اللّٰهُ: يَامُوسٰى "اَنَا جَلِيْسُ مَنْ ذَكَرَنِىْ"

(مصنف ابن ابی شیبہ).

ترجمہ: جو مجھے یاد کرتا ہے میں اس کا ہم نشین ہوں۔

تشریح: یہ حدیثِ قدسی ہے یعنی متکلم خود رب العلمین ہے۔ اسلام کا ہر حکم انسان کی ضرورت اور انسانی فطرت کے

کسی تقاضا کو پورا کرنے کی ایک صورت ہوتی ہے اور وہی بہترین صورت ہوتی ہے۔ اس حدیث قدسی میں بھی اسی کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے۔ یعنی مل جل کر رہنا پسند کرتا ہے اور تنہائی سے گھبراتا ہے۔ اپنی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے دوست، ساتھی، ہم نشین اور ہم مجلس کی تلاش اور انتخاب کے لیے بڑے بڑے پاپڑ بیلتا ہے۔ اکثر اوقات تو یوں ہوتا ہے کہ بڑی کوشش کے بعد کوئی ساتھی ملا بھی تو ایسا کہ بے اختیار کہہ اٹھا کہ اس ساتھ سے تو تنہائی بہتر تھی۔

اللہ کریم نے انسان کی فطرت اور ضرورت کو پورا کرنے کا ایسا عمدہ بندوبست فرمایا جس کی مثال نہیں ملتی۔ فرمایا! تو تنہائی سے گھبراتا ہے اور تجھے بہترین ساتھ اور ہم نشین کی ضرورت ہے۔ تو اس کی تلاش کے لیے کیوں سرگرداں پھرتا ہے۔ میں تیرا رب بلکہ رب العالمین، تیرا خالق بلکہ خالق کائنات، تیرا جلیس اور ہم نشین بن سکتا ہوں اور اس کے لیے کسی بڑی محنت اور تگ و دو کی ضرورت بھی نہیں۔ بس ماسوا سے کٹ کر میرا ذکر شروع کردے، تجھے میری ہم نشینی حاصل ہو جائے گی۔ اور جب تجھے اس کا لطف آئے گا تو کہہ اٹھے گا۔

تم میرے ساتھ ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ہم نشینی کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک ہے حسی یا مادی یعنی اپنے جیسا گوشت پوست کا انسان پاس بیٹھا ہو۔ دوسری معنوی یا کیفی جس کے متعلق غالب نے کہا ہے۔

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں، خلوت ہی کیوں نہ ہو

مگر محشرِ خیال، خیالات کا جنگل ہے جس میں خیالات کے جھاڑ جھنکاڑ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لیے اللہ کریم نے فرمایا کہ تمام خیالات کو ایک مرکز پر جمع کرو اور وہ میری ذات ہو۔ بس اب پوری یکسوئی سے میرا ذکر شروع کردو۔ اس ذکر کے دو اجزاء ہوں۔ ایک یہ کہ دماغ کو ذکر میں لگاؤ۔ دماغ کا کام سوچنا ہے اور سوچ کو ایک نقطے پر مرتکز کرلو۔ پھر دل کو اس کام میں لگاؤ۔ دل کا کام محبت کرنا ہے تو پوری دلی محبت سے میرا ذکر کرو۔ اگر ان شرائط کے ساتھ میرا ذکر کرو تو تم میری ہم نشینی کی کیفیت یوں محسوس کروگے کہ کہتے پھروگے۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

حدیث نمبر ۱۳:

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ "كُلُّ مَعْرُوْفٍ

صَدَقَةٌ"

(رواہ البخاری۔ بلوغ المرام۔ باب البر والصلہ)

ترجمہ:۔ ہر نیک کام صدقہ ہے۔

تشریح:۔ صدقہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی رضا کے لیے اللہ کی مخلوق پر کچھ خرچ کرنا۔ ہر نیک کام صدقہ یوں بنتا ہے کہ کام کا تعلق یا بدن سے ہوتا ہے یا مال سے یا وقت سے۔ یعنی ہر کام کے لیے یا تو بدن کی قوت اور اعضا استعمال کرنے ہوتے ہیں یا مال خرچ کرنا پڑتا ہے یا وقت کی قربانی کرنی پڑتی ہے۔ تو جب بھی کوئی کام کیا، ان تینوں میں سے کسی کی قربانی کرنی پڑے گی۔ پھر وہ لازماً کسی کے فائدے کا ہوگا یا پھر اس میں اللہ کی رضا کا مقصد شامل ہوگا۔ اگر وہ کام اللہ کی خاطر کیا گیا تو وہ صدقہ شمار ہوگا اور نیک کام اسے کہتے ہیں جو اللہ کے حکم کی تعمیل میں نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے۔

حدیث نمبر ۱۴:

''عَنْ عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍ و رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ " بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آيَةً''

(بخاری۔ کتاب العلم۔ الحدیث الاول)

ترجمہ:۔ میری سکھائی ہوئی باتیں لوگوں تک پہنچاؤ خواہ وہ ایک ہی آیت ہو۔

تشریح:۔ اس حدیث میں اللہ کی بات لوگوں تک پہنچانے کا حکم ہے مگر ساتھ ہی سلیقہ بھی سکھایا ہے کہ میری سکھائی ہوئی بات ہو۔ یعنی دین کے تبلیغ کے لیے دین کا علم پہلے حاصل کرو۔ جب تم نے خود کچھ نہیں سیکھا تو آگے کیا پہنچاؤ گے۔ اس لیے جاہل کو اجازت نہیں کہ وہ دین کی تبلیغ کرے۔ دوسری بات یہ بتائی کہ یہ ضروری نہیں دین کا مکمل علم حاصل کر کے اور پورا دین سیکھنے کے بعد ہی دین کی تبلیغ کرو، بلکہ بتایا جا رہا ہے کہ جتنا تم نے سیکھا ہے، اتنا ہی آگے پہنچاؤ خواہ وہ دین کی ایک بات ہو۔ جیسے قرآن حکیم میں سلیقہ سکھایا کہ ''وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ'' (طٰہٰ:132) یعنی اپنے گھر والوں کو نماز کی تلقین کرو۔ اتنا دین ہر مسلمان جانتا ہے۔ لیکن جب تک دین کا ضروری علم نہ ہو، دعوت عام دینے کی اجازت نہیں۔ اسی طرح دوسرا سلیقہ سکھایا کہ ''قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ نَارًا'' (التحریم:6) ''اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ'' یعنی پہلے خود دین کی بات سیکھ کر اس پر عمل کرو پھر اپنے گھر والوں کو سکھاؤ اور ان سے عمل کراؤ۔ اگر عالم ہو تو دعوت عام دو خواہ سارے کرہ ارض پر پھر کر یہ کام کرنا پڑے۔

سبق نمبر ۶

حدیث نمبر ۱۵:

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ نِ الْخُدْرِیْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ "اَکْثِرُوْا ذِکْرَ اللّٰہِ حَتّٰی یَقُوْلُوْا مَجْنُوْنٌ"

(مسند احمد۔ مسند ابی سعید الخدریؓ)

ترجمہ: اللہ کا ذکر اس کثرت سے کرو کہ لوگ کہنے لگیں، یہ دیوانہ ہو گیا ہے۔

تشریح: محبت کے مختلف مدارج ہوتے ہیں جو شناسائی سے شروع ہو کر جنون تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ابتداء میں صرف ایک رجحان ہوتا ہے۔ پھر روابط بڑھنے لگتے ہیں اور اس پسندیدہ چیز یا شخصیت کے متعلق ایک خاص قسم کی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے بڑھے تو اس کی چاہت دل میں گھر کر لیتی ہے۔ جب یہ صورت پیدا ہو جائے تو چاہنے والے کا جی یہی چاہتا ہے کہ محبوب کی پسند کو ترجیح دوں۔ اس درجے میں غیر کے خیال اور محبوب کے خیال میں کشمکش رہتی ہے۔ خواہ فتح دوسرے خیال کی ہو مگر غیر کا خیال کلیتہً محو نہیں ہوتا۔ اس سے آگے جنون کا درجہ ہے جس میں آدمی کو یہ خیال بھی نہیں رہتا کہ اپنے متعلق سوچے یا یہ فکر ہو کہ لوگ کیا کہیں گے بلکہ صرف محبوب کی دھن سمائی رہتی ہے۔ وہ دنیا میں رہ کر دنیا سے بیگانہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ بزعم خود اپنے آپ کو فرزانہ سمجھنے والے اسے دیوانہ کہنے لگتے ہیں۔ اللہ کے ساتھ اسی قسم کا تعلق مطلوب ہے اور وہ ذکر الٰہی کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔

اس سے ایک اور حکمت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ شیطان کا ایک داؤ یہ بھی ہے کہ انسان کے دل میں یہ وسوسہ ڈال دیتا ہے کہ دیکھو یہ کام کرو گے تو نکو بن جاؤ گے۔ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے، پھبتیاں کسیں گے۔ آدمی "دانش ور" ہو تو وہ کام کرنے سے رک جاتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ لوگ زیادہ سے زیادہ دیوانہ ہی کہہ سکتے ہیں تو دیوانگی سے نفرت کی جگہ کیوں نہ اس دیوانگی کی آرزو کو دل میں پالنے لگو۔

اگرچہ بدنامی است نزد عاقلاں
مانمی خواہیم ننگ و نام را

حدیث نمبر ۱۶:

عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ قَالَ اللّٰہُ

تَعَالیٰ "اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ"

(مشکوٰۃ۔کتاب الصوم۔الفصل الاول)

ترجمہ:۔ (نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کریم کا ارشاد سنا رہے ہیں) کہ "روزہ میرے لیے ہے اور اس کی جزا میں خود ہوں یا میں خود دوں گا۔"

تشریح:۔ ہر عبادت کی ایک صورت ہوتی ہے جو ان ظاہری آنکھوں سے نظر آتی ہے۔ مثلاً نماز ہے تو جو شخص نماز پڑھ رہا ہے، وہ کبھی ہاتھ باندھے کھڑا ہے، کبھی رکوع میں ہے، کبھی سجدے میں ہے، کبھی تشہد میں ہے۔ تو ہر دیکھنے والا سمجھ لیتا ہے کہ یہ نماز پڑھ رہا ہے۔ اسی طرح دوسری عبادتیں ہیں۔ مگر روزہ ایسی عبادت ہے کہ کسی دیکھنے والے کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ شخص روزے سے ہے۔ تو گویا ہر عبادت میں ریا، دکھاوے کا شبہ ہو سکتا ہے بلکہ خطرہ ہوتا ہے، مگر روزہ ایسی عبادت ہے جس میں ریا کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ہاں! کوئی آدمی ڈھنڈورا پیٹتا پھرے کہ لوگو میں روزے سے ہوں تو یہ اور بات ہے۔ مگر ایسی حماقت کم ہی کوئی کرتا ہے۔ لہٰذا روزے کا معاملہ خالص اللہ سے ہوتا ہے۔ آدمی لوگوں سے اوجھل ہو کر کھا پی بھی سکتا ہے مگر ایسا نہیں کرتا اس کا معاملہ اللہ سے ہوتا ہے اور اللہ ہر وقت اور ہر حالت میں دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اس لیے اس خالص اور ریا کے خطرہ سے خالی عبادت کا مقام یہ ہے کہ اس کی جزا اللہ کی رضا ہے، اللہ کی محبت ہے اور اللہ خود ہے اور سب مل گیا اسے جسے اللہ مل گیا۔

حدیث ۱۷:

عَنْ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ "لَا تُقْبَلُ صَلٰوۃٌ بِغَیْرِ طَھُوْرٍ"

(مشکوٰۃ۔باب مایوجب الوضو)

ترجمہ:۔ طہارت اور وضو کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی۔

تشریح:۔ نماز کیا ہے؟ اپنے محبوب کی ملاقات کی ایک تقریب ہے اور لطف یہ کہ محبوب خود اپنے گھر بلاتا ہے کہ میرے بندے میرے گھر آ اور مجھ سے باتیں کر اور جی بھر کے کر۔ یہاں یہ نہیں ہوگا کہ ایک تختی پر لکھا ہوا سامنے آ جائے Be brief please بات مختصر کیجیے، بلکہ یہاں تو ایسا اہتمام ہے کہ ملاقاتی یہ حسرت لے کے نہ جائے کہ ہائے موقع ملتا تو میں اور باتیں کرتا۔ یہ فرض کے بعد سنت اور نفل کیا ہے۔ یہی کہ آدمی اپنے محبوب سے جی بھر کے باتیں کرے۔ اتنا مقدس اور پاک محبوب اور اتنی مقدس تقریب تو پھر شرم کی بات ہے کہ آدمی سلیقے سے اس تقریب میں نہ جائے۔ اور سلیقہ کیا ہے؟ یہی کہ صفائی پاکیزگی اور طہارت کا اہتمام کر کے جائے۔ اس اہتمام کی شکل وضو ہے۔ اگر اس کا حکم نہ ہوتا تب بھی محبت کا تقاضا یہ تھا

کہ آدمی اس سلیقے سے محبوب کی ملاقات کو جائے اور جب یہ کہہ دیا گیا کہ اگر تم نے اس سلیقے سے یہ عبادت نہ کی تو تمہارے منہ پر ماردی جائے گی۔ ہرگز قبول نہ ہوگی تو بھلا کون ایسا احمق ہے جو اپنی محنت کو رائیگاں جانے دے۔ اس لیے محسنِ انسانیت نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتباہ کر دیا کہ دیکھو! وضو کے بغیر نماز قبول نہ ہوگی۔

سبق نمبر ۷

حدیث نمبر ۱۸:

عَنْ اِبْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ' اَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ "اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ"

(صحیح مسلم باب تحریم الظلم)

ترجمہ: مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔

تشریح:۔ مثل مشہور ہے کہ اپنا اپنا ہوتا ہے اور غیر غیر۔ اور اپنا کسے کہتے ہیں۔ وہی جس کے ساتھ کوئی خونی یا نسبی رشتہ ہو۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ رشتہ داروں کے ساتھ طبعی اور فطری لگاؤ اور محبت ہوتی ہے گو اس محبت کے درجے مختلف ہیں۔ جو زیادہ قریبی رشتہ ہوتا ہے اس کے ساتھ زیادہ محبت ہوتی ہے مثلاً ماں باپ، بہن بھائی کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے۔ ان رشتوں میں دو خاص باتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو ان میں انسان کے اختیار کو دخل نہیں دوسرا ان کے ساتھ محبت طبعی ہوتی ہے۔

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور رشتے کی خبر دی ہے اور وہ ہے ایمانی رشتہ۔ ایمان کا مقام دل ہے اس لیے اس رشتہ کی خاصیت یہ ہے کہ باہم محبت قلبی ہوتی ہے۔ اس رشتے اور نسبی رشتوں میں فرق یہ ہے کہ نسبی رشتے یہاں کی زندگی تک ہیں۔ یہاں سے جانے کے بعد یہ رشتے کسی کام نہیں آئیں گے۔ قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ قیامت کے دن بھائی ماں باپ بیوی بچے سب ایک دوسرے کو پہچانیں گے بھی نہیں بلکہ ایک دوسرے کو اپنے گناہوں کے لیے موردِ الزام ٹھہرائیں گے۔ جبکہ رشتہ ایمان کا کچھ تقاضا ہے وہ یہ کہ مسلمان اپنے مسلمان بھائی کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ اسے حقیر نہیں سمجھتا اس کے ساتھ زیادتی نہیں کرتا۔ دھوکا نہیں دیتا اور مصیبت میں اسے اکیلا اور بے سہارا نہیں چھوڑتا۔ اگر ایسا نہ ہو تو ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کے دل میں ایمان کی جڑیں مضبوط نہیں، اس کی فکر کرے۔

حدیث نمبر ۱۹:

"عَنْ تَمِیْمِ الدَّارِی رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ' عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ" اَلدِّیْنُ

اَلنَّصِیْحَةُ“

(مشکوٰۃ۔باب الشفقۃ والرحمۃ۔علی الخلق۔الفصل الاول)

ترجمہ:۔ دین نام ہے خلوص اور خیر خواہی کا۔

تشریح:۔ دین کی بنیادی تعلیم یہ ہے اور دینداری کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی کے دل میں خلوص ہو اور خیر خواہی کے جذبے سے اس کا دل لبریز ہو۔ یہ ایک لمبی حدیث کا حصہ ہے۔ جب نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تو صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ خلوص اور خیر خواہی کا برتاؤ کس کے ساتھ ہو؟ تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب سے پہلے اللہ کے ساتھ ہو۔اللہ کے ساتھ خلوص کیا ہے؟ یہی کہ اللہ کی عبادت اور اس کی اطاعت دلی محبت اور عقیدت کے ساتھ کرے۔کسی شرط کے ساتھ مشروط نہ کرے جیسا کہ اللہ کریم نے فرمایا وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰی حَرْفٍ (الحج:11) یعنی کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اللہ کی عبادت اس شرط کے ساتھ کرتے ہیں کہ ان کی مرضی کے مطابق ان کے کام چلتے رہیں تو عبادت کرتے رہیں اور اگر اس کی طرف سے کوئی آزمائش آ گئی تو اللہ سے روٹھ بیٹھے اور عبادت چھوڑ دی۔یہ رویہ خلوص کا رویہ نہیں اقبال نے کہا ہے۔

سوداگری نہیں، یہ عبادت خدا کی ہے
اے بے خبر جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے

دوسرے نمبر پر اللہ کے رسولؐ سے خلوص کا رویہ ہو۔یعنی رسولؐ کی ہر بات ماننے اور دل سے مانے۔یہ نہیں کہ اپنی پسند کی کوئی بات ہوئی تو مان لی، نہ ہوئی تو من مانی کرنے لگے۔اور مانے تو اس جذبے کے ساتھ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات میرے فائدے کی ہے، خواہ میری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

تیسرے نمبر پر اللہ کی کتاب کے ساتھ خلوص، وہ یوں کہ اللہ کی کتاب کا ہر حکم اطاعت اور محبت کے جذبے کے ساتھ قبول کرے اور اس کی تعمیل کرے۔

چوتھے نمبر پر ہر مسلمان پیشواؤں اور حکام کے ساتھ خلوص اور خیر خواہی کا رویہ ہو، خلوص یہ ہے کہ جب تک وہ اللہ کی اطاعت کریں، ان کی پیروی کرتا رہے۔اور اگر وہ خود اللہ کی راہ سے ہٹنے لگیں تو خیر خواہی یہ ہے کہ پوری دلسوزی اور حکمت کے ساتھ ان کی اصلاح کی کوشش کرے۔ان کے خلاف بغاوت اور خروج کر کے امن کی فضا کو خراب نہ کرے۔

پانچویں نمبر پر عام مسلمانوں کے ساتھ خلوص اور خیر خواہی کا رویہ اختیار کرے۔خلوص یہ ہے کہ ان کے ساتھ خود غرضی اور مطلب پرستی کا رویہ اختیار نہ کرے۔ہمیشہ عام مسلمانوں کی بہتری اور بہبود کا خیال رکھے اور خیر خواہی یہ ہے کہ دنیوی معاملات میں ان کے ساتھ معاملہ کھرا رکھے۔اور سچی خیر خواہی یہ ہے کہ ان کی آخرت سنوارنے کے لیے جو کچھ اور جس صورت میں ہو سکے، کرے۔کسی سے لغزش ہو جائے تو اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔دین کے معاملے میں کسی سے سستی ہو

جائے تو اسے بیدار کرے۔ اور ہر طرح مسلمان بھائی کو اللہ کے قریب لانے کی کوشش کرے اور اس کا ماٹو (motto) یہ ہو۔

میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی — میں اسی لیے مجاہد، میں اسی لیے نمازی

سبق نمبر ۸:

حدیث نمبر ۲۰:

"عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ "یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا"

(مشکوۃ۔ باب ماعلی الولاۃ من التیسیر۔ الفصل الاول)

ترجمہ:۔ لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو تنگی نہیں۔

تشریح:۔ دین میں اللہ کریم نے آسانی رکھی ہے۔ چنانچہ ایک اصول بتایا کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (البقرہ:286) یعنی اللہ تعالیٰ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ پھر شریعت نے احکام کی ترتیب یوں رکھی کہ فرض واجب، سنت مستحب اور مباح میں احکام کو تقسیم کر دیا۔ اس کا نام Sense of Proportion ہے اس لیے آدمی شریعت کی اس درجہ بندی کو ملحوظ رکھ کے زندگی بسر کرے تو آسانی ہی آسانی ہے اور اگر اس کا لحاظ نہ کیا جائے تو تنگی لازمی ہے۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتباہ فرما دیا کہ دین میں تنگی نہ پیدا کرو۔ تنگی پیدا کرنے کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی مباح کو واجب سمجھ لے، مستحب کو فرض قرار دے لے۔ شریعت نے جو رخصت دی ہے، اسے قبول نہ کرے اور ہمیشہ عزیمت کا پہلو اختیار کرے۔ مثلاً شریعت نے رخصت دی ہے کہ بیمار ہے تو وضو کی جگہ تیمم کر لے۔ آدمی کہے کہ نہیں میں وضو ہی کروں گا۔ یا مثلاً بیمار کو اجازت ہے کہ روزہ نہ رکھے۔ آدمی اس رخصت کو قبول نہ کرے۔ یا مثلاً بیمار کو اجازت ہے کہ کھڑا ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا تو بیٹھ کر پڑھے اگر ایسا نہیں کر سکتا تو لیٹ کے پڑھ لے آدمی ان رعایتوں کو قبول نہ کرے تو یقیناً تنگی ہو گی۔ اس لیے حکم دیا گیا کہ دین میں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آسانیاں رکھی ہیں، ان کی قدر کرو اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو تکلیف میں نہ ڈالو۔

حدیث نمبر ۲۱:

"عَنْ ابی ھریرہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ"

(ترمذی شریف، باب اُن المشار موتمن)

ترجمہ: جس سے مشورہ کیا جائے وہ امین ہوتا ہے۔

تشریح:۔ سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ کوئی کسی سے مشورہ لیتا کیوں ہے؟ عموماً اس کی دو صورتیں ہوتی

ہیں۔یا تو آدمی کسی معاملے میں رہنمائی لینا چاہتا ہے یا سے تردد ہوتا ہے اور کوئی فیصلہ کر نہیں پا تا تو وہ کسی کی حتمی رائے چاہتا ہے۔صورت جو بھی ہو،مشورہ کے لیے ایسا آدمی تلاش کرتا ہے جس میں دو وصف ہوں۔اول یہ کہ جس معاملے میں مشورہ درکار ہے،وہ اسے بخوبی جانتا ہے۔دوم یہ کہ وہ اس کا خیر خواہ ہے رہی بات مشورہ دینے والے کی تو اس کا پہلا کام ہے کہ وہ امین ہو امین ہونے کی کئی صورتیں ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ خوب سوچ سمجھ کے مشورہ دے۔دوسری یہ کہ دیانتداری سے صحیح مشورہ دے۔تیسرا یہ کہ اگر وہ کوئی راز کی بات ہے تو اسے اپنی ذات تک محدود رکھے،راز افشانہ کرے۔چوتھا یہ کہ پوری خیر خواہی کے جذبے سے مشورہ دے،اس کے اعتماد کو ٹھیس نہ لگائے۔

حدیث نمبر۲۲:

''اَلْکَاسِبُ حَبِیْبُ اللّٰہِ''

(روح المعانی،تفسیر مراح لبید)

ترجمہ:۔ محنت کش اللہ کا دوست ہے۔

تشریح:۔ انسان کی تین بنیادی ضرورتیں ہیں۔روٹی کپڑا اور مکان۔ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مال کی ضرورت ہوتی ہے اور مال حاصل کرنے کے لیے کئی طریقے ہیں مثلاً

۱۔ چوری ۲۔ ڈاکہ ۳۔ دھونس دھاندلی ۴۔ گداگری ۵۔ محنت کشی

پہلے تینوں تو حرام محض ہیں اور چوتھا کبھی تو حرام ہوتا ہے اور کبھی شرف انسانیت سے گرا ہوا۔اور حرام مال کے متعلق قرآن وسنت میں جو وعیدیں آئی ہیں،انہیں سن کر کوئی مسلمان ان کے قریب بھی نہیں جا سکتا۔لہٰذا ان کا معیوب ہونا اور ناجائز ہونا ظاہر ہے۔پانچویں صورت ان سب سے مختلف ہے۔محنت سے مال کمانا یہ صورت اللہ کریم کو پسند ہے اور ایسا کرنے والا اللہ کا دوست ہے۔ہاں!مگر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ صرف محنت ایسی چیز نہیں جو اس کام کو محبوب بنا دے۔کیونکہ چوری کرنے کے لیے بھی محنت تو کرنی پڑتی ہے مگر اس کو کسب نہیں کہتے،لوٹ کھسوٹ کہتے ہیں۔اور محنت جو کسب یا کمائی کے لیے ہو،اس سے مراد یہ ہے کہ ذریعہ معاش جائز ہو پھر پوری دیانتداری سے کام کیا جائے۔دھوکا اور کام چوری نہ ہو اس صورت سے کمائی کرنے والا محنت کش اللہ کا دوست ہوتا ہے۔مرد وہ ہے جو دوسروں پر بوجھ نہ بنے اور جائز طریقہ سے مال کمائے اور جائز مصرف پر خرچ کرے۔

سبق نمبر۹:

حدیث نمبر۲۳:

''عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ "اَلْمُؤْمِنُ مِرْاٰةُ الْمُؤْمِنِ''

(رواہ ابوداؤد۔مشکوۃ۔باب الشفقۃ والرحمۃ۔الفصل الثانی)

ترجمہ:۔ مومن مومن کا آئینہ ہے۔

تشریح:۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کو مومن کا آئینہ فرما کر ایک حقیقت سمجھا دی۔سوچئے آئینہ کس کام آتا ہے۔ آدمی آئینہ کیوں دیکھتا ہے۔آدمی یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ مجھ میں کوئی عیب تو نہیں۔پھر وہ آئینہ اسے صحیح صحیح بتا دیتا ہے۔آدمی کو اس پر اتنا اعتماد ہوتا ہے کہ آئینہ جو بتائے اس میں ذرہ برابر شک نہیں کرتا۔کبھی یہ نہیں ہوا کہ آئینہ کہے تمہارے چہرے پر سیاہ داغ ہے اور آدمی نہ مانے اور کہے کہ آئینہ جھوٹ کہتا ہے۔پھر اس کے بعد آدمی کو اس عیب کے دور کرنے کی فکر ہوتی ہے اور وہ اسے دور کر کے رہتا ہے۔آئینہ میں ایک اور بات ہے کہ جو پوچھے صرف اسی کو بتاتا ہے۔اور چپکے سے مشورہ دیتا ہے، وہ اشتہار نہیں دیتا مومن کا مومن سے ایسا ہی تعلق ہونا چاہیے کہ اپنی اصلاح کے لیے دوسرے مومن بھائی سے مشورہ لے اور وہ تنہائی میں چپکے سے اسے بتائے اور صحیح صحیح بتائے، اس کے عیب کا اشتہار نہ دیتا پھرے۔اور وہ بھی اپنے بھائی کا مشورہ قبول کرے اور اپنی اصلاح کرے۔

آنکھ سب کو دیکھتی ہے مگر اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی۔نہ اپنے قریب ترین ماحول یعنی چہرے کو دیکھ سکتی ہے اس لیے آدمی آئینے کا محتاج ہوتا ہے۔اسی طرح انسان اپنے عیبوں سے واقف نہیں ہوتا۔اس لیے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس آئینے کی نشاندہی فرما دی جو اسے میسر آ سکتا ہے۔آئینہ اور مومن میں ایک عظیم فرق ہے۔آئینہ صرف ظاہری عیب بتاتا ہے اور آدمی اسے دور کر کے انسانوں میں قابل عزت ہو سکتا ہے مگر مومن اپنے بھائی مومن کو اس عیب سے آگاہ کرتا ہے جسے اللہ دیکھتا ہے اور جو مرنے کے بعد بھی انسان کو تڑپا سکتا ہے۔اس لیے مومن تو اس مادی آئینے سے کہیں زیادہ خیر خواہ اور عمدہ مشیر ہے۔اگر مسلمان اسی ایک حقیقت کو پلے باندھ لیں تو نہ جانے کتنے عیبوں کی اصلاح ہو سکتی ہے۔

حدیث نمبر۲۴:

عَنْ عَلِيِّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ "اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ"

(مشکوۃ۔باب الامارۃ والقضاء۔الفصل الاول)

ترجمہ: (غیر اللہ کی) اطاعت صرف معروف میں ہو سکتی ہے۔

تشریح: دنیا کا نظام ماننے اور مان کر چلنے ہی سے قائم ہے۔اولاد کو والدین کی بات ماننا ہوتی ہے۔شاگرد کو استاد کی۔مرید کو پیر۔کی چھوٹے کو بڑے کی۔ماتحت کو افسر کی۔رعایا کو حکمران کی۔غرض زندگی کے ہر شعبے اور ہر دائرے میں کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی درجے میں آدمی کو آدمی کی بات مان کر چلنا ہوتا ہے۔یہ ضروری نہیں کہ ہر بڑا چھوٹے کو یا ہر افسر

تشریح: دنیا کا نظام ماننے اور مان کر چلنے ہی سے قائم ہے۔ اولاد کو والدین کی بات ماننا ہوتی ہے۔ شاگرد کو استاد کی۔ مرید کو پیر۔ کی چھوٹے کو بڑے کی۔ ماتحت کو افسر کی۔ رعایا کو حکمران کی۔ غرض زندگی کے ہر شعبے اور ہر دائرے میں کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی درجے میں آدمی کو آدمی کی بات مان کر چلنا ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر بڑا چھوٹے کو یا ہر افسر ماتحت کو وہی کام کرنے کو کہے جو ہر لحاظ سے درست ہو۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر بات ماننا ضروری نہیں۔ اگر ایسا ہو تو اچھے اور برے، نیک اور بد، جائز اور ناجائز کا امتیاز ہی اٹھ جائے۔ اس لیے ضروری ٹھہرا کہ کوئی معیار مقرر ہونا چاہیے جس کو سامنے رکھ کر آدمی فیصلہ کر سکے کہ یہ بات ماننے کے قابل ہے یا اس کا نہ ماننا ضروری ہے۔ تو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کو یہ معیار عطا فرمایا کہ ہر وہ بات مانو جو معروف کے دائرے میں آئے۔ معروف کسے کہتے ہیں معروف کے معنی ہیں جانی پہچانی چیز۔ یعنی ہر وہ کام جو فطرت انسانی یا عقل سلیم کے لحاظ سے جانی پہچانی اور فطرت کے مطابق ہو۔ اور اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس لیے اس کا ہر حکم فطرتِ انسانی کے مطابق بلکہ فطرت انسانی کی ضرورت ہے۔ پس معلوم ہوا کہ معروف ہر وہ بات اور ہر وہ کام ہے جو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہو یا اس کا حکم دیا ہو۔ پس جو حکم یا جس کا حکم اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہو، اس کا نہ ماننا ضروری ہے۔ اور اگر اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق ہو تو ہر چھوٹے اور ماتحت کو ہر بڑے اور افسر کا حکم ضرور ماننا چاہیے۔

سبق نمبر ۱۰:

حدیث نمبر ۲۵:

عَنْ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ "اَلْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ"

(مشکوٰۃ۔ باب الاحتکار۔ الفصل الثانی)

ترجمہ: ذخیرہ اندوزی کرنے والے پر اللہ کی لعنت ہے۔

تشریح: نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے باطنی بیماریوں کی ڈھونڈ ڈھونڈ کے تشخیص فرمائی۔ پھر ان کا علاج بتایا تا کہ مومن کا تزکیہ کامل ہو جائے۔ انسان کی ایک کمزوری مال کی محبت ہے۔ یہ محبت زر اندوزی کی بیماری کی صورت اختیار کر جاتی ہے اور آدمی ہمیشہ ننانوے کے پھیر میں رہتا ہے۔ اس کی نگاہ بنک بیلنس پر ہی جمی رہتی ہے۔ اللہ کریم نے اس شخص کے لیے تباہی کی خبر دی ہے جو "جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ" O (الھمزہ۔ آیت 2) کو شغل بنائے رکھے۔ اور یہ ایسی بیماری ہے کہ آدمی اپنی ذات پر بھی خرچ کرنا گوارا نہیں کرتا۔ چنانچہ مثل مشہور ہے چمڑی جائے دمڑی نہ جائے۔

زر اندوزی کی ایک شکل ذخیرہ اندوزی ہے جو تاجر لوگوں کا مرض ہے۔ موقع ملنے پر کوئی ضرورت کی چیز تھوک کے

صورت بھی پیدا کر دیتے ہیں اور لوگ مجبوراً منہ مانگی قیمت دینے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ تو لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے والے ان تاجروں کو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ملعون قرار دیا۔ یہ وہ "انعام" ہے جو سب سے پہلے ابلیس کو ملا اور اس سے مراد یہ ہے کہ ایسا شخص اللہ کی رحمت سے کلیتہً محروم رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو رحمت سے محروم رہا وہ غضب کا نشانہ ہی بنا "اللھم احفظنا"۔

حدیث نمبر ۲۶:

"عَنْ مَعْمَرٍ رَضِيَ اللّٰه عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ" مَنِ احْتَكَرَ فَهُوَ خَاطِئٌ"

(مشکوٰۃ۔ باب الاحتکار۔ الفصل الاول)

ترجمہ: جو ذخیرہ اندوزی کرے وہ گناہ گار ہے۔

تشریح:۔ ذخیرہ اندوزی کیا ہے؟ لوٹ کھسوٹ کی وہ صورت ہے جو ایک مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے آدمی کے ذہن میں اس وقت جوش مارتی ہے جب وہ کسی مجبور کی مجبوری کو دیکھتا ہے۔ یہ صورت دراصل حرص، لالچ، دھوکا، خودغرضی اور نہ جانے کتنی بیماریوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ایثار ہمدردی اور انسان دوستی کے جذبات کا فقدان ہوتا ہے۔ آدمی دراصل ایک انسان نما درندہ بن جاتا ہے۔

دیکھنا یہ ہے کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کرنے والے کو گنہگار کیوں قرار دیا۔ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ آدمی نماز نہ پڑھے، روزہ نہ رکھے، زکوٰۃ نہ دے تو گناہ گار ہوتا ہے۔ مگر حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ معاملات میں کھوٹ بھی گناہ ہے۔ تو گناہ کی حقیقت یہ ہوئی کہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کو گناہ کہتے ہیں۔ یہ نافرمانی عقائد کے باب میں ہو، عبادات کے سلسلے میں، معاملات کی صورت میں ہو یا اخلاق کے بارے میں ہو، گناہ ہے۔ اور سزا کا تعلق گناہ سے ہے۔ یعنی گناہ ہوں گے تو سزا ملے گی۔ گناہ سے بچ گیا یا گناہ معاف کرا لیے تو سزا سے بچ جائے گا۔ تو معلوم ہوا کہ گناہ ایسی خطرناک شے ہے جو آدمی کو سزا کا مستحق بنا دیتی ہے۔ لہٰذا عقلمندی یہ ہے کہ آدمی گناہ سے بچنے کی کوشش کرے۔ گناہ چھوٹے بڑے بھی ہوتے ہیں مگر ذخیرہ اندوزی تو اتنا بڑا گناہ ہے کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمی اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا ایک ہی وقت میں ہزاروں گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ گناہوں سے محفوظ رکھے۔

حدیث نمبر ۲۷:

عَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَالِهٖ وَسَلَّمَ "مَنْ غَشَّ فَلَیْسَ مِنِّیْ"

(رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ۔ باب المنہی عنہا۔ الفصل الاول)

ترجمہ: جس نے دھوکہ دیا وہ مجھ سے نہیں۔

تشریح: اسلام اپنے ماننے والوں کو بنیادی طور پر اس امر کی تلقین کرتا ہے بلکہ تاکید کرتا ہے کہ ہمیشہ اپنا معاملہ کھرا رکھو۔ خالق سے بھی اور مخلوق سے بھی۔ اور کسی کو دھوکا دینا تو انسان کے باطنی طور پر کھوٹے ہونے کی واضح دلیل ہے کیونکہ دھوکا میں بیک وقت کئی برائیاں شامل ہوتی ہیں مثلاً جھوٹ، خودغرضی، مطلب پرستی، دوسرے کی بدخواہی اور حرام وغیرہ۔ اس لیے دھوکا دینا سب سے بڑا کھوٹ ہے۔ لیکن نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے دھوکا دینے والے کے لیے جو وعید سنائی ہے، اسے سن کر تو کلیجہ کانپ جاتا ہے کہ "لیس منی" یعنی مجھ سے نہیں ہے۔ ذرا اس چھوٹے سے جملے کے مطلب پر غور کیجیے۔ مجھ سے نہیں کا مطلب ہے کہ میری امت میں سے نہیں، میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، میرے ماننے والوں میں سے نہیں، میرے چاہنے والوں سے نہیں۔ اب بتائیے کہ ایسے شخص کی حیثیت کیا ہوئی۔ اس کا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعلق نہ رہا تو اللہ سے کیا تعلق رہا۔ جو یہاں سے اٹھا دیا گیا، اس کے بیٹھنے کی کوئی جگہ ہے کیا۔ اس لیے اس مہلک بیماری سے اپنے آپ کو بچاؤ۔

سبق نمبر ۱۱

حدیث نمبر ۲۸:

"عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰه عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَالِهٖ وَسَلَّمَ" مَنْ لَا یَرْحَمْ لَا یُرْحَمْ"

(متفق علیہ۔ ریاض الصالحین۔ ص۔۱۲)

ترجمہ: "جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔"

تشریح: رحم، قلب کی ایک کیفیت اور ایک باطنی وصف کا نام ہے اس کا اظہار کئی طرح ہوتا ہے مثلاً:

۱۔ کسی کو تکلیف میں دیکھا تو دل میں ایک جذبہ اٹھا کہ اس کی تکلیف دور کی جائے اور اگر کچھ نہ ہو سکے تو کم از کم کچھ میٹھے بول بول کر ہی اس کا بوجھ ہلکا کیا جائے۔

۲۔ کسی سے کوئی غلطی ہوگئی تو اسے سزا دینے کی بجائے اسے غلطی کا احساس دلا کر اس کو معاف کر دیا جائے۔

۳۔ کسی کو محتاج اور ضرورتمند دیکھا تو ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ آگے بڑھ کر اس کی ضرورت پوری کی جائے۔ اسی

طرح کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ جس میں یہ جذبہ بالکل ہی مفقود ہو اس کے لیے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے وعید سنائی کہ "لَا یُرْحَمُ" کہ اس پر رحم نہیں کیا جائے گا۔

سوچئے کب نہیں کیا جائے گا اور کون نہیں کرے گا۔ ظاہر ہے کہ وہ جو "ارحم الراحمین" ہے وہ رحم نہیں کرے گا۔ وہ رحمت للعالمین ہے، وہ رحم نہیں کرے گا تو کیا اس کے رحم کے بغیر کسی کا گزارا ہوسکتا ہے۔ آخرت کی بات تو ظاہر ہے ہی، یہاں بھی اس کے رحم کے بغیر گزارا نہیں ہوسکتا تو پھر کیوں نہ اپنے اندر دوسروں کے لیے رحم کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔

حدیث نمبر ۲۹:

"عَنْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللّٰہِ علیہ وسلم لَا ضَرَرَ لَا ضِرَارفِیْ الِا سْلَامُ"

(سنن ابن ماجہ)

ترجمہ: نہ کسی کو نقصان پہنچاؤ نہ خود نقصان اٹھاؤ اسلام میں۔

تشریح: دین کو بوجوہ عقائد اور عبادات منصوصہ میں محدود سمجھ لیا گیا ہے حالانکہ معاملات اور اخلاق بھی اسی طرح دین کا حصہ ہیں۔ گو ان کے لیے مستقل عنوان مقرر کر لیے گئے مگر اصل میں یہ عبادت ہی کا حصہ ہیں اور عبادت کی مختلف صورتیں ہیں۔ اس لیے قرآن حکیم میں معاملات اور اخلاق کے متعلق جابجا واضح ہدایات ملتی ہیں۔ اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح عقائد اور عبادات منصوصہ کے متعلق ہدایات ارشاد فرمائی ہیں، اسی اہتمام کے ساتھ معاملات اور اخلاق کی اہمیت واضح فرمائی ہے۔ اس حدیث میں یہی دو موضوع زیر بحث ہیں۔

پہلی ہدایت کہ کسی کو نقصان نہ پہنچاؤ دراصل کچھ اندرونی بیماریوں سے بچنے کی تاکید ہے۔ سوچیے کوئی کسی کو نقصان کیوں پہنچاتا ہے؟ اس کی مختلف وجوہات ہیں اور ہر وجہ ایک باطنی بیماری ہے مثلاً۔

۱۔ آدمی کے اندر تکبر کا مرض ہو، اپنی عظمت اور اختیار کا نشہ ہو۔

۲۔ یہ یقین ہو کہ کوئی پوچھنے والا نہیں۔

۳۔ دوسرے کو کمزور اور حقیر سمجھے۔

۴۔ حرص، لالچ اور حسد کا شکار ہو۔

اور یہ سب نہایت مہلک امراض "لا ضرر" دو لفظوں میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب بیماریوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی تاکید فرما دی۔

دوسری ہدایت کہ خود نقصان نہ اٹھاؤ۔ بھلا کوئی اپنی خوشی سے نقصان اٹھاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے آپ کو اس حالت میں نہ ڈالو کہ نقصان اٹھانا پڑے۔ نقصان اٹھانے کی بھی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ مثلاً

۱۔ آدمی ایسا کمزور ہو کہ نقصان دینے والے کا مقابلہ نہ کر سکے تو گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ مومن کو قوی ہونا چاہیے۔ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ مومن قوی، مومن ضعیف سے بہتر ہے۔

۲۔ آدمی بھولا بھالا ہو کر مقابل کی چال کو نہ سمجھ سکے تو گویا ارشاد ہوا کہ مومن کو ہوشیار اور چاق و چوبند ہونا چاہیے۔

۳۔ آدمی غیر محتاط اور لاابالی ہو تو گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی مومن کو محتاط رہ کر آنکھیں کھول کے زندگی بسر کرنی چاہیے۔معاملات میں کھرا اور اعلیٰ اخلاق والا ہونا چاہیے۔

سبق نمبر ۱۲

حدیث نمبر ۳۰:

"عَنْ جُبَیْرِ بنِ مُطْعِمٍ قَالَ: عَنِ النَّبِیِّ صَلّی اللّٰہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ "قَالَ لَایَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ"

(صحیح بخاری: صحیح مسلم: باب اثم القاطع صحیح مسلم)

ترجمہ: قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔

تشریح: اسلام محبت کا دین ہے جو اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔اور محبت دو قسم کی ہوتی ہے۔ایک طبعی یا فطری دوسری عقلی۔پہلی قسم کی محبت اللہ کریم نے انسان کی فطرت میں رکھ دی اور وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے ہوتی ہے۔جتنا قریبی رشتہ ہو، اتنی گہری محبت ہوتی ہے۔عقلی محبت کی بنیاد ایمان اور عقیدہ ہوتا ہے جس کا اظہار اللہ کریم نے یوں فرمایا کہ "انما المومنون اخوۃ" (مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں)۔قطع رحمی کیا ہے؟ یہی کہ ان دونوں محبتوں سے دستبردار ہونا، یعنی فطری بھی اور عقلی بھی۔بظاہر یہ معمولی بات معلوم ہوتی ہے مگر اس کی وعید پر غور کیجیے کہ ایسا کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔تو پھر کہاں جائے گا؟ ظاہر ہے دوسرا ٹھکانا جہنم ہی تو ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قطع رحمی واقع کوئی نہایت منحوس چیز ہے۔اس کی نحوست کا اندازہ سورۃ بقرہ کی ایک آیت سے ہوتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم بنی نوع انسان کے لیے کتاب ہدایت ہے مگر کچھ لوگ ایسے محروم ہیں کہ اس کتاب سے ہدایت نہیں لیتے بلکہ گمراہی سمیٹتے ہیں۔ان کا نام فاسقین ہے اور ان کی ایک نشانی یہ ہے کہ جن رشتوں کو اللہ کریم نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، وہ انہیں توڑ دیتے ہیں۔اندازہ کیجیے کہ قطع رحمی کتنی تباہ کن چیز ہے ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ "وَ اَمَّا الَّذِیْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰھُمُ النَّارُ" (سورہ السجدہ) یعنی فاسقین کا ٹھکانہ جہنم ہے۔آگے ہے کہ جب وہ جہنم سے نکلنے کا ارادہ کریں گے، انہیں پھر جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔یہ فطرت سے بغاوت کی سزا ہے۔کہ انہوں نے اللہ کے رسول کی مخالفت کی اور اللہ کریم کی کھلم کھلا نافرمانی کی۔اب تو واضح ہو گیا ہوگا کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے قطع رحمی کرنے والے کو یہ وعید کیوں سنائی ہے۔ہمارے معاشرے کا حال یہ ہے کہ ذرا ذرا سی

بات پر ایسا بائیکاٹ ہوتا ہے گویا یہ رشتہ دار نہیں بلکہ کوئی ازلی دشمن ہیں۔ اللہ تعالیٰ صحیح فہم عطا فرمائے۔

حدیث نمبر ۳۱:

"عَنْ عبد الله بن عَمْرٍ وَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" سَخَطُ اللّٰهِ فِيْ سَخَطِ الْوَالِدِ"

(صحیح ابن حبان، ترمذی شریف)

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی ناراضگی والد کی ناراضگی میں ہے۔

تشریح: جس سے اس کے والد ناراض ہوں اللہ تعالیٰ بھی اس ناراض ہوتا ہے۔

انسان کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ مگر اس کے وجود میں آنے کا مادی سبب اس کے والدین ہی تو ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ ساری مخلوق میں انسان کے لیے قابل احترام ہستی اس کے والدین ہی ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم میں کئی مقامات پر اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت کے ساتھ متصل والدین کی اطاعت اور ان سے حسن سلوک کا حکم ہے مثلاً

"وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا" (بنی اسرائیل:23)

(اور حکم دیا تیرے رب نے کہ سوائے اس کے کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ احسان کا سلوک کرو) اور دوسری جگہ

"قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا" (الانعام:151)

(اور اللہ کی عبادت کر اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ بنا اور والدین کے ساتھ احسان کا سلوک کر) یہ کیوں؟ اس لیے کہ دنیا میں سب سے مشکل کام انسان کے بچے کی پرورش ہے اور یہ کٹھن کام ماں باپ ہی کرتے ہیں پھر ان میں بھی ماں کا حصہ زیادہ ہے جو بچے کی خاطر اپنا آرام، اپنی صحت بلکہ اپنی پسند تک قربان کر دیتی ہے مگر ان دونوں کی "حیثیتوں" میں فرق ہے۔ والد میں فعالیت یعنی کسی عمل میں اقدام اور پہل کرنا ہوتی ہے اور والدہ میں انفعالیت یعنی اس اقدام کو قبول کرنا۔ ظاہر ہے کہ فعالیت کے بغیر انفعالیت مطلوبہ نتیجہ حاصل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ بنیادی طور پر انسان کے وجود میں آنے کا سبب والد ہے۔ پس نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ والد کی ناراضگی میں اللہ کی ناراضگی ہے۔ اسی لیے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ جس بدنصیب سے اس کے والدین ناخوش ہوں اس کی فطرت ہی مسخ ہو چکی ہے۔ اس نے اللہ کی اس نعمت کی ناقدری کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ بھی اس سے ناخوش ہے۔ ایک اور موقع پر نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم سے والدین کے حقوق کا سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ تمہاری جنت ہیں اور وہ تمہاری جہنم ہیں۔ یعنی اگر تو نے ان کی اطاعت ان کی خدمت کی تو وہ تمہارے لیے جنت کا سبب بن جائیں گے اور اگر تو نے ان کو ناراض کیا تو وہی تمہارے لیے

جہنم کا سبب بن جائیں گے اور ظاہر ہے کہ جہنم اس کا ٹھکانا ہے جس سے اللہ ناراض ہوگا۔

سبق نمبر ۱۳

حدیث نمبر ۳۲:

عن ابو هریره عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ" اِيَّاكُمْ وَ الظَّنَّ فِاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيثِ"

(صحیح بخاری)

ترجمہ: بدگمانی سے بچو۔

تشریح: اسلام چونکہ امن وسلامتی کا دین ہے اس لیے باہمی امن وسکون کو جہاں معمولی سا بھی خطرہ ہو تو اسلام اس سے بھی آگاہ کر دیتا ہے اور محتاط رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ بدگمانی بالکل معمولی اور بے ضرر سا عمل ہے مگر اس کے نتائج ایسے وسیع اور دور رس ہوتے ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ بدگمانی کیا ہے اور کیسے پیدا ہوتی ہے اور کیونکر بڑھتی ہے؟ بدگمانی یہ ہے کہ کسی کی بات یا عمل سے دل میں کوئی شک پیدا ہوا۔ اب نفس نے اس پر کام کرنا شروع کر دیا، اس نے یہ بات اس لیے کہی، اس نے یہ کام ضرور کیا ہوگا، اس نے یہ ضرور کہا ہوگا، ہاں دراصل وہ میرا دشمن ہے۔ اس طرح سے دماغ نے حاشیے چڑھانے شروع کر دیے۔ نفرت بڑھنے لگی اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جب طبائع نافرورمیدہ ہونے لگتی ہیں تو دوسرے کے ہنر بھی عیب نظر آنے لگتے ہیں دراصل ذہن پر ایک رنگ دار عینک جم جاتی ہے اور ہر بات اور ہر عمل میں وہی عینک کا رنگ نظر آنے لگتا ہے۔ یہ نفرت بڑھتے بڑھتے دشمنی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ پھر تدبیریں سوچی جاتی ہیں، سکیمیں بنتی ہیں، مفروضات اور موہوم خطرات سامنے آنے لگتے ہیں اور پھر عملاً لڑائی بھڑائی شروع ہو جاتی ہے۔ اس طرح معاشرے کا امن اٹھ جاتا ہے، خاندانوں میں منافرت پھیلتی ہے، دلوں میں دوری ہو جاتی ہے۔ یہ تو بدگمانی کے عمومی اور متعدی اثرات ہیں۔ بدگمانی کرنے والے کی ذات پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل کا سکون اُٹھ جاتا ہے، پریشانیاں گھیر لیتی ہیں اور اگر اس کے مقابلے میں حسن ظن کا طریقہ اپنایا جائے تو اپنے آپ کو بھی سکون میسر آتا ہے اور رشتہ داروں میں، خاندانوں میں اور معاشرے میں امن و سکون کی فضا پیدا ہوتی ہے۔

حدیث نمبر ۳۳:

عَنْ عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ عُمَرٌ قَالَ النَّبِيّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ

"اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ"

(صحیح بخاری، صحیح مسلم۔ باب شعب الایمان)

ترجمہ: حیاء ایمان کا حصہ ہے۔

تشریح: حیاء قلب کی ایک کیفیت اور ایک وصف کا نام ہے، جس کے سبب انسان ہر اس کام یا اس بات کے کرنے سے رک جائے جو معیوب سمجھا جاتا ہو۔ دل کی اس کیفیت یا حیا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ لوگ جس کام کو اچھا نہ سمجھیں اس کام سے قلب میں ہچکچاہٹ محسوس ہو۔ مگر اس کا معیار بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً ایک کام انسانوں کے کسی خاص دائرے میں معیوب سمجھا جاتا ہے آدمی کا قلب اس دائرے میں وہ کام کرنے پر آمادہ نہ ہوا سے حیا آئے مگر ایک اور دائرے میں وہی کام کمال یا خوبی تصور ہوتا ہو وہاں وہی آدمی، وہی کام بڑے فخر کے ساتھ کرنے لگتا ہے تو معلوم ہوا کہ اس حیا کا محرک دنیوی مفاد یعنی نام ونمود اور شہرت کا حصول ہوتا ہے۔

نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس حیاء کا ذکر فرمایا ہے اس کا تعلق مومن سے ہے اور اس حیا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مومن کا دل ایسے کام کے کرنے پر آمادہ نہ ہو بلکہ گھبرائے جو کام اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہ ہو۔ اس حیا کا محرک ایمان ہوتا ہے یعنی یہ یقین کہ اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پسند معیاری پسند ہے اگر میں نے اس کے خلاف کیا تو کل اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ اور جب پوچھا گیا تو تم نے لا الہ الا اللہ پڑھ کے یہ حرکت کیوں کی تو مجھ سے کوئی جواب نہ بن پائے گا۔ اس لیے یہ حیا دراصل ایمان ہی کا حصہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ جہاں ایمان کا دعویٰ بھی ہو اور یہ حیا نہ پائی جائے تو اس کی وجہ کیا ہوتی ہے۔ یہ بات ایک مثال سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوئی نفیس طبع انسان اگر کسی غلاظت کے ڈھیر کے پاس سے گزرے تو ناک پر کپڑا رکھ کر جلدی جلدی وہاں سے گزر جاتا ہے مگر یہ بھی دیکھا ہے کہ بلدیہ کا ٹرک جو سارے شہر کی غلاظت لادے گزرتا ہے عین اس کی چوٹی پر بیٹھے دو تین آدمی گانا گا رہے ہوتے ہیں اور لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں۔ تو کیا وہ انسان نہیں ہوتے؟ ظاہر ہے کہ وہ ہوتے تو انسان ہیں مگر ان کی قوت شامہ مسخ ہو چکی ہوتی ہے۔ اس طرح جو مومن اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی سے حیا نہیں کرتا اس کی قوت ایمانی میں خرابی واقع ہو چکی ہوتی ہے۔ اسے چاہیے کہ اس کی فکر کرے۔

سبق نمبر ۱۴

حدیث نمبر ۳۴:

عَنْ اَبِیْ هُرِیْرَہ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ "اِیَّا کُمْ وَ الْحَسَدَ"

(سنن ابی داود۔ باب فی الحسد)

ترجمہ: حسد سے بچ کے رہو۔

تشریح: حسد دراصل قلب کی ایک خاص حالت کا نام ہے۔اس میں ہوتا یہ ہے کہ دوسرے کو اچھی حالت میں دیکھ کر یا دوسرے کی کوئی خوبی دیکھ کر دل کڑھنے لگتا ہے اور دل کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔اور لطف یہ کہ یہ خواہش نہیں ہوتی کہ یہ خوبی مجھ میں پیدا ہو جائے بلکہ یہ رنج ہوتا ہے کہ اس میں کیوں پیدا ہو گئی۔ یہ صورت بڑی خطرناک ہے کیونکہ یہ دراصل اللہ کریم کے خلاف احتجاج ہے اور یہ اعلان ہوتا ہے کہ اللہ کریم کی تقسیم اور اس کا فیصلہ معاذ اللہ غلط ہے، یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔اس سے بڑھ کر یہ کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ کے مقام پر دیکھنا چاہتا ہے کہ دنیا کا نظام میری خواہش اور میری پسند کے مطابق چلنا چاہیے۔اس وجہ سے حسد کو مفسدِ اعمال قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس حدیث کا بعد کا حصہ یہ ہے کہ ''حسد نیکیوں کو یوں کھا جاتا ہے جیسے آگ ایندھن کو بھسم کر دیتی ہے'' امام غزالیؒ نے حسد کے پانچ نقصان لکھے ہیں۔

۱۔ طاعت کا ضائع ہونا۔

۲۔ برائی کی تحریک ہونا مثلاً چاپلوسی۔غیبت وغیرہ۔

۳۔ رنج بے فائدہ۔دل خواہ مخواہ کڑھتے رہنا۔

۴۔ کوری دل۔اللہ کے احکام کی سمجھ جاتی رہتی ہے۔

۵۔ حرمان وخزلان۔دوسرے کی زوال نعمت کے لیے کوئی مدد و معاون نہیں ملتا۔دل کی محرومی کا احساس شدت اختیار کر جاتا ہے۔

حسد کے نقصان کا اندازہ کرنے کے لیے یہ سوچیے کہ ایک آدمی محنت کرے مگر اسے اس کا ثمرہ کچھ نہ ملے تو یہ احساس محرومی اس کے لیے کتنا تکلیف دہ ہوگا۔پھر سوچیے کہ ایک آدمی کو اپنی محنت کا پھل بے شمار اور بے حساب ملا مگر سارے کا سارا چوری ہو گیا یا لوٹ لیا گیا۔اس کے احساسِ محرومی کا اندازہ کیجیے۔حاسد کے لیے محرومی کی یہ دوسری صورت ہوتی ہے۔

حدیث نمبر ۳۵:

عَنْ مُعَاذابْنِ جَبَلٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ

''إِيَّاكُمْ وَالتَّنَعُّمَ''

(مسند احمد، باب حدیث معاذ بن جبل)

ترجمہ: عیش کوشی سے بچو۔

تشریح: پرسکون زندگی کے لیے یہ کافی ہے کہ انسان کی تمام ضروریات آسانی سے پوری ہوتی رہیں، کوئی کام

اٹکنے نہ پائے۔ انسان اگراس پر قناعت کر لے اور مطمئن ہو جائے تو زندگی مزے سے گزرتی ہے۔ اور اگر اس میں حرص اور لالچ پیدا ہو جائے اور عیاشی کے لیے دل بے قرار ہو تو اسے طرح طرح کی الجھنوں اور برائیوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ عیاشی کرنے کے لیے سب سے پہلا جو نقصان ہوتا ہے وہ ہے حلال و حرام کی تمیز اٹھ جانا۔ پھر اس میں بے عملی اور بد عملی کا رجحان پیدا ہونے لگتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ کام کچھ نہ کرنا پڑے مگر عیاشی کا سامان وافر مقدار میں مل جائے۔ آدمی سنگدل، خودغرض اور مطلب پرست بن جاتا ہے اور یہ سب خرابیاں ایسی ہیں کہ ایک مومن کو تو ان کے سایہ سے بھی بچنا چاہیے۔

اس لیے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے انتباہ کرتے ہوئے فرمایا کہ عیاشی اور عیش کوشی سے بچو۔ مومن تو سراپا عمل اور مجاہد ہوتا ہے۔ اسے جدوجہد اور جفاکشی میں لذت محسوس ہوتی ہے کیونکہ اس کی تخلیق کا مقصد ''اُخْرِجَتْ لِلنَّاس'' ہے۔ تو انسانیت کی بہتری کے لیے کام کرنے والے کو بھلا عیش کرنے کی فرصت کہاں۔ اسے تو دوسروں کی خاطر جینا ہے۔ اس کا ماٹو (Motto) (اصول) یہ ہے کہ۔

شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں　　خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

حدیث نمبر ۳۶:

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ ''لَا تَجَسَّسُوْا''

(صحیح بخاری، باب تعلیم الفرائض)

ترجمہ:　دوسروں کی ٹوہ میں نہ رہو۔

تشریح:　دوسروں کے بھید ٹٹولنا اور عیب ڈھونڈتے رہنا دل کی ایک خطرناک بیماری ہے۔ اس کے کئی مقاصد ہوتے ہیں اور ہر مقصد گھٹیا اور قابل نفرت ہے۔ مثلاً ایک مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسرے پر اپنی برتری جتلا کر دھونس جمائی جائے اس لیے ضروری ہے کہ دوسرے کا کوئی عیب مل جائے تاکہ وہ عیب بتا کر اس پر دھونس جمائی جا سکے۔ دوسرا یہ مقصد ہوتا ہے کہ کسی کو عوام میں، معاشرے میں، خاندان میں رسوا کیا جائے تاکہ لوگ اس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھیں۔ یہ مقصد پہلے سے بھی زیادہ گھٹیا ہے۔ مومن کا کام تو اپنے مومن بھائی کی پردہ پوشی اور اصلاح ہے۔ لہٰذا یہ شغل مومن کی ذات سے کسی طرح جوڑ نہیں کھاتا۔ اللہ تعالیٰ اس گناہِ بے لذت سے بچائے۔

سبق نمبر ۱۵

حدیث نمبر ۳۷:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ ''مَنْ تَشَبَّهَ

بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ''

(مشکوۃ۔کتاب اللباس۔الفصل الثانی)

ترجمہ: جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے شمار ہوگا۔

تشریح: اپنے تشخص سے دستبردار ہوکر کسی دوسری قوم سے تشبہ اختیار کرنا دراصل ایک نفسیاتی بیماری کے اظہار کی ایک صورت ہے۔وہ بیماری ہے احساس کمتری۔جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی نگاہ میں اپنی روایات،اپنی تعلیمات گھٹیا نظر آنے لگتی ہیں۔وہ ان کے اختیار کرنے میں عار محسوس کرنے لگتا ہے اور کسی دوسری قوم کی عظمت اس کے دل ودماغ میں گھر کر جاتی ہے۔اس لیے اس کے طور طریقے اپنانے میں اپنی عزت اور عظمت محسوس کرنے لگتا ہے۔اس کی بڑی وجہ غلامی ہوتی ہے۔غلام قوم جب سیاسی طور پر غلام ہو جاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ذہنی غلامی ہوتا ہے۔اس لیے اسے حکمران قوم کی ہر بات ،ان کی ہر حرکت اچھی بلکہ معیاری معلوم ہوتی ہے۔پھر وہ اپنے آپ کو زندگی کے ہر شعبے میں اسی رنگ میں رنگنے کی تدبیریں بھی کرتا ہے اور عقلی اور منطقی دلائل بھی دماغ میں آنے لگتے ہیں۔

اس سے کم درجے کی دوسری نفسیاتی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عوام اپنی قوم ہی کے حکمرانوں اور صاحب اقتدار طبقہ کو معاشرے کا اعلیٰ طبقہ شمار کرنے لگتے ہیں اور ان کی اداؤں کی نقل کرنے میں عظمت سمجھنے لگتے ہیں۔اسی وجہ سے ایک ضرب المثل مشہور ہے جو تاریخی حقائق پر مبنی ہے کہ''الناس علی دین ملوکھم ''یعنی عوام اپنے حکمرانوں کے طور طریقے اختیار کرنے میں ہی عظمت سمجھتے ہیں۔

اسلام نے زندگی کے ہر شعبے میں جو اصول ونظریات دیئے ہیں وہ ہر لحاظ سے معیار ہیں۔اور ان اصول ونظریات پر چل کر جو عملی صورت حال پیدا ہوتی ہے وہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً برت کے سکھا دی اور وہ ہی معیار ہے۔اس لیے ایک مسلمان جب اس معیاری صورت کو چھوڑ کر کوئی دوسری صورت اختیار کرے گا وہ شرفِ انسانیت سے گر جائے گا۔مومن کو اس انحطاط سے بچانے کے لئے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے وعید کا اسلوب اختیار فرمایا کہ جو میری سکھائی ہوئی روش کو چھوڑ کر کسی دوسری قوم کے طور طریقے اختیار کرے وہ میری جماعت نہیں بلکہ انہی میں شمار ہوگا۔

حدیث میں تشبہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مفہوم عام ہے کہ لباس،خوراک،رہن سہن ہر معاملے میں کسی دوسری قوم کی روش اختیار کرنا تشبہ میں آئے گا۔مگر صاحب مرقاۃ علامہ ملا علی قاری'' کی تحقیق یہ ہے کہ کسی قوم کا شعار اپنانا تشبہ ہے۔شعار وہ خاص علامت ہوتی ہے جس سے کوئی قوم پہچانی جاتی ہے۔مثلاً سکھوں کا ایک شعار ہے'' کیس'' رکھنا۔ہزار آدمیوں میں ایک سکھ کھڑا ہو تو فوراً پہچان لیا جائے گا کہ یہ سکھ ہے۔یہ اس قوم کا شعار ہے۔چنانچہ مرقاۃ میں لکھتے ہیں''قلت بل الشعار ھو المراد بالتشبہ لا غیر ''شعار خاص کے علاوہ اگر کوئی چیز ملتی جلتی ہے تو اسے وہ تخلیط کہتے ہیں۔یہ تشبہ نہیں اور

تخلیط کے معنی آمیزش، خلط ملط ہونا ہے۔ لیکن ایک صورت قابلِ غور ہے وہ یہ کہ اگر کوئی مسلمان اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی کسی بات کے متعلق یہ عقیدہ رکھے کہ یہ ناقص ہے یا تہذیب سے گری ہوئی ہے۔ اس کے مقابلے میں فلاں قوم کی روش عمدہ اور اعلیٰ ہے تو وہ لازماً تشبہ ہوگا۔ خواہ وہ بالکل معمولی سی بات ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے آداب میں سکھایا کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور کھانے کے بعد انگلیاں چاٹ لو۔ اب اگر کوئی مومن اسے ناقص یا غلط سمجھے اور چھری کانٹے کے استعمال کو عمدہ اور معیاری خیال کرے تو وہ لازماً تشبہ ہوگا۔

تشبہ کی بنیاد پیار ہے۔ اس لیے اس شخص کو اسی قوم میں شامل سمجھنا چاہیے جس کے طور طریقوں سے اسے پیار ہے۔

حدیث نمبر ۳۸:

عَنْ عَبْدِاللّٰہِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ”رَأْسُ الْحِکْمَۃِ مَخَافَۃُ اللّٰہِ“

(نوادر الاصول فی احادیث الرسول)

ترجمہ: سب سے بڑی دانائی کی جڑ اللہ سے ڈرنا ہے۔

تشریح: حکمت کہتے ہیں دانائی کی بات کو۔ دانائی وہ وصف ہے جو سب کو محبوب ہے۔ کوئی شخص احمق بننا یا کہلوانا پسند نہیں کرتا۔ دانائی کے بھی درجے ہیں۔ سب سے اونچے درجے کے دانا کو حکیم کہا کرتے تھے اب اسے فلاسفر کہتے ہیں۔ پھر اس کو دانائی یا حکمت کہا جاتا ہے کہ آدمی روزمرہ کی زندگی میں پوری طرح کامیاب ہو۔ جس میدان میں اترے، یا کامیابی کے لیے جو تدبیر سوچے اور اختیار کرے وہ اسے لازماً کامیابی سے ہمکنار کرے۔ یعنی اس دانائی کا میدان یہ چندروزہ دنیوی زندگی ہے۔ اس سے ہٹ کر دانائی کی ایک اور صورت ہے۔ وہ یہ کہ آدمی سوچے کہ میں ایسی تدبیر اختیار کروں کہ یہ چندروزہ زندگی نہایت پاکیزہ اور شریفانہ گذرے اور اس کا اثر یہ ہو کہ یہاں سے جانے کے بعد جہاں ہمیشہ رہنا ہے وہاں ہر طرح سکون اور عیش میسر آئے۔ یہ دانائی اصل دانائی ہے۔ جو نگاہ اس پر جمی رہے، اسے دوررس نگاہ کہتے ہیں۔ تو نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سب سے بڑی دانائی کا راز بتا دیا کہ اس دانائی کے حاصل ہونے کا واحد ذریعہ اللہ کا خوف ہے۔

یہ خوف کیا ہے؟ ڈر یا خوف کا لفظ تو کئی مختلف مفاہیم کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً سانپ سے ڈرنا، استاد سے ڈرنا، والد سے ڈرنا، حاکم سے ڈرنا وغیرہ۔ تو کیا اللہ سے ڈرنا بھی کوئی ایسا ہی مفہوم رکھتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اللہ کا ڈر کیا ہے، اس کو

سمجھنے کے لیے عقل کافی نہیں بلکہ اس کے لیے دل چاہیے۔دل کی خاصیت محبت کرنا ہے۔دل جب کوئی محبوب تلاش کر لیتا ہے تو اس کی پہلی اور آخری کوشش یہ ہوتی ہے کہ محبوب خوش رہے اور اس کے لیے سب سے بڑا خطرہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں محبوب ناخوش یا ناراض نہ ہو جائے۔یہ ڈر کہ میں کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھوں کہ محبوب کو پسند نہ ہو اور وہ ناراض ہو جائے۔یہ ہے اللہ کا ڈر اور یہ ہے اللہ سے ڈرنے کا مطلب۔اور اس نے یہ بھی بتادیا کہ دل جب دل ہے تو وہ کوئی محبوب تلاش کر لیتا ہے۔مگر اے وہ لوگو! جنہوں نے میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیمان وفا باندھا ہے سن لو ''وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ''(البقرہ 165) کہ تمہاری پہچان یہ ہے کہ تمہارے لیے سب سے پیارا محبوب اللہ ہے۔اس لیے تمہیں صرف اسی کی فکر دامن گیر رہنی چاہیے کہ کہیں کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھوں جو محبوب کو پسند نہ ہو۔یہ ڈر انتہائی درجے کی دانائی ہے۔

سبق نمبر ۱۶

حدیث نمبر ۳۹:

''عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ اَیَاسِ بْنِ ثَعْلَبَةَ رَضِیَ اللّٰه عنه قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ " اِنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الْاِیْمَان''

(مشکوٰۃ۔کتاب اللباس۔الفصل الثانی)

ترجمہ: سادگی ایمان کا حصہ ہے۔

تشریح: کسی تکلف کے بغیر ضروریات زندگی کے پورا کرنے کے طریقے کو سادگی کہتے ہیں۔غذا، لباس، مکان غرض تمام انفرادی اور اجتماعی ضرورتوں کو بلا تکلف پورا کرنا سادگی ہے۔لباس کو لیجیے! ستر عورت کے تقاضے پورا کرنے اور موسم کی شدت سے بچاؤ ہی لباس کا مقصد ہوتا ہے۔اس سے آگے جو کچھ ہوگا وہ عیاشی ہوگی۔سادگی کو چھوڑنے کے دو بڑے بڑے محرکات ہیں۔اول لذت پرستی۔دوم لوگوں کی نظروں میں بلند مقام پیدا کرنے کا شوق۔اس لیے ضروریات زندگی کے سلسلے میں جب انسان سادگی کو چھوڑتا ہے تو اسے تکلف، بناوٹ، تصنع، ریاء، نام ونمود، شہرت وغیرہ کئی قباحتوں کا شکار بننا پڑتا ہے۔تو اس طریقہ میں یہ ساری باتیں شامل ہوتی ہیں مگر ریاء کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ریاء کو اسلام میں شرک اصغر کہتے ہیں۔کیونکہ ریاء میں مخلوق کی خوشنودی حاصل کرنے اور مخلوق کی نگاہ میں معزز بننے کا جذبہ غالب ہوتا ہے۔اور مومن کی زندگی کا طریقہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔اور جہاں تک عزت ووقار کا سوال ہے، اصل عزت وہ ہے جو اللہ کے ہاں ہو۔پس یہ دونوں چیزیں ایمان سے دور کرنے والی اور شرک کے قریب کرنے والی ہیں۔لہٰذا نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو فرمایا کہ سادگی ایمان کا

حصہ ہے، اس کی صحیح سمجھ آ جاتی ہے۔ کیونکہ سادگی کو ترک کرنے کا نتیجہ ایمان سے دوری اور شرک کی طرف بڑھنا ہے۔ اس لیے مومن زندگی کے ہر شعبے میں سادگی اختیار کرتا ہے۔

حدیث نمبر ۴۰:

عَنْ حُذَيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ' قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ" لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ نَمَّامٌ"

(مشکوٰۃ۔ باب حفظ اللسان۔ الفصل الاول)

ترجمہ: چغل خور جنت میں نہیں جائے گا۔

تشریح: چغل خوری کے محرک دو ہیں۔ دوسروں کی بدخواہی اور ایذا رسائی اور رسوائی۔ اور یہ دونوں باتیں اخلاق رذیلہ میں سرفہرست آتی ہیں۔ انسان کا ضمیر جب مسخ ہو جاتا ہے تو دوسروں کو ایذا پہنچا کر یا انہیں تکلیف میں دیکھ کر اسے خوشی ہوتی ہے اور سرور محسوس کرتا ہے۔

اس دنیا سے جانے کے بعد ابدی ٹھکانے دو ہیں۔ جنت یا جہنم۔ اور جنت میں جانے کا راستہ اسلام نے یہ دکھایا ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد پوری دیانتداری اور جذبے سے ادا کرنا۔ ان میں جس میں جتنی کمی ہوگی، جنت سے اسی تناسب سے دوری بڑھے گی۔ حقوق العباد کا حال یہ ہے کہ ان میں کمی، حقوق اللہ والی نیکیوں کو بھی لے ڈوبتی ہے۔ حدیث پاک میں ایک واقعہ آتا ہے کہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا مفلس کون ہوتا ہے؟ صحابہؓ نے یہی جواب دیا جو ہر ایک ذہن میں ہوتا ہے کہ جس کے پاس مال و دولت اور کوئی جاگیر نہ ہو، مفلس ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں! سنو مفلس کون ہے۔ ایک آدمی محشر میں اپنی بے شمار عبادات کو لے کر دربار الٰہی میں حاضر ہوگا۔ ادھر ایک قطار ایسے آدمیوں کی آ کھڑی ہوگی جن کا دعویٰ یہ ہوگا کہ اس نے میرا فلاں حق مارا، فلاں ایذا پہنچائی، فلاں زیادتی کی وغیرہ۔ تو حکم ہوگا کہ اس کی فلاں فلاں عبادت مدعی کے کھاتے میں ڈال دو۔ حتیٰ کہ اس کی ساری عبادتیں ختم ہو جائیں گی مگر ابھی مدعی باقی ہوں گے۔ اب حکم ہوگا ان مظلوموں کی فلاں فلاں برائیاں اس کے کھاتے میں ڈال دو۔ یہ ہے مفلس۔ تو ایذائے مسلم اتنی بڑی برائی ہے کہ نہ جانے کتنی عبادتیں اس کی نذر ہو سکتی ہیں۔ تو جب چغل خور کا مشغلہ ہی بدخواہی اور ایذائے مسلم ہے تو اسے بھلا جنت میں کون جانے دے گا۔

اسباقِ فقہ

فقہ کی بنیاد

اسلامی قانون اور شریعت کے بنیادی ماخذ دو ہیں۔ اول کتاب اللہ یعنی قرآن حکیم۔ دوم قرآن حکیم کی وہ تعبیر جو معلم قرآن یعنی اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وفعل سے پیش کی، جس کا نام سنت ہے۔ حالات بدلنے سے ہر دور میں مختلف نئے مسائل ابھرتے رہے۔ ان کے حل کے لئے قرآن وسنت کے احکام سے مسائل استنباط کرنا ہر دور کی بنیادی ضرورت رہی۔ استنباط مسائل کے لئے دو صورتیں اختیار کی گئیں جن کے اصطلاحی نام اجماع اور قیاس ہیں۔ ان چاروں ذرائع سے مسائل استنباط کرنے کے فن کا نام فقہ اسلامی قرار پایا۔ اور علماء اسلام نے انفرادی اور اجتماعی طور پر مسائل کا ستنباط کر کے مختلف کتب کی تدوین کی۔ ان میں سے چار فقہی مکاتب فکر عالم کے مختلف گوشوں میں اختیار کیے جاتے رہے۔ ان کی کوششوں کا ماحصل اجمالی طور پر پیش کیا جارہا ہے۔

اصطلاحِ شرع میں فقہ کا مفہوم شرعی احکام کا علم ہے جو قرآن وسنت سے اخذ کیے گئے ہوں اور قرآن وسنت کی روشنی میں مسائل کا استنباط کیا گیا ہو۔

فقہ کا موضوع:

قرآن وسنت کی روشنی میں اسلامی قانون سازی۔

فقہ کا دائرہ کار:

انسان کے مالہ، وماعلیہ یعنی حقوق وفرائضِ انسانی۔ حقوق میں حقوق اللہ اور حقوق العباد پر بحث۔

حقوق اللہ:

عبادات مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد وغیرہ۔

حقوق العباد:

(۱) مناکحات اس میں نکاح، طلاق، عدت، نسب، نان ونفقہ، پرورش اولاد حق ولدیت، وصیت، وراثت وغیرہ۔

(۲) تعزیرات: قتل، چوری، زنا، شراب، جوا، قذف، قصاص، دیت، قید وغیرہ۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ اول حدود، دوم تعزیر۔

(۳) معاملات: خرید وفروخت، ہبہ، امانت، ضمانت، شرکت، مصالحت، ناجائز قبضہ، دھوکا، اتلاف مال۔

فقہ کی ضرورت:

انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں روزمرہ بیشمار مسائل ابھرتے یا پیش آتے ہیں۔ ان کا حل معلوم کیے بغیر خوشگوار زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ فقہ اس فطری ضرورت کو پورا کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

فقہ کے مختلف دور

فقہ زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں معاشرے میں جو مسائل پیش آتے تھے، ان کا حل وحی کے ذریعے قرآن کریم کی صورت میں اور اجتہاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول اور فعل سے ملتا تھا۔

عہد صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین میں:

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے۔ اس لیے ہر صحابیؓ سے زندگی کے مسائل میں رہنمائی مل سکتی تھی۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان موجود تھا کہ:

''اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم ''(مشکوٰۃ) یعنی میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں، جس کا دامن تھام لوگے، تمہیں ہدایت کے رستے پر لگا دے گا۔ مگر ہر شخص کی فطری استعداد اور فطری میلان مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے فقہ میں چند صحابہؓ امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ ان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چاروں خلفائے راشدین اور عبادلہ یعنی عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔

دورِ تابعین:

اسلامی سلطنت میں وسعت ہوئی تو صحابہؓ مختلف اسلامی علاقوں میں پھیل گئے۔ ان میں فقہاء صحابہؓ بھی تھے۔ جو جہاں گیا اس کی ذات مسلمانوں کیلئے مرکز توجہ بن گئی۔ اور فقہی مسائل کا حل انہی سے معلوم کیا جانے لگا۔

مکہ میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

مدینہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

کوفہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور

مصر میں عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فقہ اسلامی کی مجسم درسگاہ بن گئے۔

بنو عباس کے عہد میں علم و حکمت کا چرچا ہونے لگا۔ یونانی فلسفہ سے لوگ آشنا ہوئے۔ نئے نئے مسائل اٹھ کھڑے

ہوئے۔اس لیے فقہ کی تدوین کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ سب سے پہلے یہ کام امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے شروع کیا۔ رفتہ رفتہ اس میں پھیلاؤ ہونے لگا۔محقق علماء نے اپنے اپنے دائرہ میں تحقیق کا کام جاری رکھا۔مگران میں سے صرف چار فقہا کی تحقیق Establish ہوگئی۔

(۱) امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ۱۵۰۔۸۰ھ۔ فقہ حنفی

(۲) امام مالک رحمۃ اللہ علیہ ۱۷۹۔۹۵ھ۔ فقہ مالکی

(۳) امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ۲۰۴۔۱۵۰ھ۔ فقہ شافعی

(۴) امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ ۲۶۱۔۱۶۴ھ۔ فقہ حنبلی

سوال: اسلام کا کلمہ کیا ہے؟

جواب: اسلام کا کلمہ یہ ہے۔''لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ''

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

اس کلمہ کو کلمۂ طیبہ اور کلمۂ توحید کہتے ہیں!

سوال: کلمۂ شہادت کیا ہے؟

جواب: کلمۂ شہادت یہ ہے۔''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ''

ترجمہ: گواہی دیتا ہوں میں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں میں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔

سوال: ایمان مجمل کیا ہے؟

جواب: ایمان مجمل یہ ہے۔''اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ كَمَا هُوَ بِاَسْمَآئِهٖ وَصِفَاتِهٖ وَقَبِلْتُ جَمِيْعَ اَحْكَامِهٖ''

ترجمہ: ایمان لایا میں اللہ پر جیسا کہ وہ اپنے ناموں اور صفتوں کے ساتھ ہے اور میں نے اس کے تمام احکام قبول کیے۔

سوال: ایمان مفصل کیا ہے؟

جواب: ایمان مفصل یہ ہے۔''اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى وَالْبَعْثِ بَعْدَ الْمَوْتِ''

ترجمہ: ایمان لایا میں اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور اس پر کہ اچھی اور بری تقدیر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور موت کے بعد اٹھائے جانے پر۔

سوم کلمہ تمجید:

سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ ط وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ O

ترجمہ: پاک ہے اللہ اور تمام تعریف اللہ ہی کے لیے ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ بہت بڑا ہے اور گناہوں سے بچنے کی طاقت اور نیک کام کرنے کی قوت اللہ ہی کی طرف سے ہے جو عالیشان عظمت والا ہے۔

چہارم کلمہ توحید:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ اَبَدًا اَبَدًا ط ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ط بِيَدِهِ الْخَيْرُ ط وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ط

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے تمام تعریف ہے وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہے جو مرے گا نہیں عظمت اور بزرگی والا ہے۔ بہتری اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

پنجم کلمہ استغفار:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ اَذْنَبْتُهٗ عَمَدًا اَوْ خَطَاً سِرًّا اَوْ عَلَانِيَةً وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ مِنَ الذَّنْبِ الَّذِيْ اَعْلَمُ وَمِنَ الذَّنْبِ الَّذِيْ لَآ اَعْلَمُ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ وَسَتَّارُ الْعُيُوْبِ وَغَفَّارُ الذُّنُوْبِ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ ط

ترجمہ: میں اللہ سے معافی مانگتا ہوں جو میرا پروردگار ہے۔ ہر گناہ سے جو میں نے کیا۔ جان بوجھ کر یا بھول کر، در پردہ یا کھلم کھلا۔ اور میں توبہ کرتا ہوں اس کے حضور میں اس گناہ سے جو مجھے معلوم ہے اور اس گناہ سے جو مجھے معلوم نہیں۔ بے شک تو غیبوں کا جاننے والا ہے اور عیبوں کا چھپانے والا ہے اور گناہوں کا بخشنے والا ہے۔ اور گناہوں سے بچنے کی طاقت اور نیک کام کرنے کی قوت اللہ ہی کی طرف سے ہے جو عالیشان عظمت والا ہے۔

ششم کلمہ ردکفر:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ اُشْرِکَ بِکَ شَیْئًا وَّاَنَا اَعْلَمُ بِهٖ وَاَسْتَغْفِرُکَ لِمَا لَآ اَعْلَمُ بِهٖ تُبْتُ عَنْهُ وَ تَبَرَّأْتُ مِنَ الْکُفْرِ وَالشِّرْکِ وَالْکِذْبِ وَالْغِیْبَةِ وَالْبِدْعَةِ وَالنَّمِیْمَةِ وَالْفَوَاحِشِ وَالْبُهْتَانِ وَالْمَعَاصِیْ کُلِّهَا وَاَسْلَمْتُ وَ اَقُوْلُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط

ترجمہ: الٰہی میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ کسی چیز کو تیرا شریک بناؤں اور مجھے اس کا علم ہو اور میں معافی مانگتا ہوں تجھ سے اس (گناہ) سے جس کا مجھے علم نہیں۔ میں نے اس سے توبہ کی اور بیزار ہوا کفر سے اور شرک سے اور جھوٹ سے اور غیبت سے اور بدعت سے اور چغلی سے اور بے حیائی کے کاموں سے اور تہمت لگانے سے اور (باقی) ہر قسم کی نافرمانیوں سے۔ اور میں ایمان لایا اور میں کہتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

☆ ☆ ☆

سوال: تمہیں کس نے پیدا کیا؟

جواب: ہمیں اور ہمارے ماں باپ اور آسمانوں اور زمینوں اور تمام مخلوق کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے دنیا کو کس چیز سے پیدا کیا؟

جواب: اپنی قدرت اور اپنے حکم سے پیدا کیا ہے۔

سوال: جو لوگ اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے انہیں کیا کہتے ہیں؟

جواب: انہیں کافر کہتے ہیں۔

سوال: جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا اور چیزوں کی پوجا کرتے ہیں یا دو تین خدا مانتے ہیں انہیں کیا کہتے ہیں؟

جواب: ایسے لوگوں کو کافر اور مشرک کہتے ہیں۔

سوال: مشرک بخشے جائیں گے یا نہیں؟

جواب: مشرکوں کی بخشش نہیں ہوگی، وہ ہمیشہ تکلیف اور عذاب میں رہیں گے۔

سوال: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کون ہیں؟

جواب: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول اور پیغمبر تھے ہم ان کی امت ہیں۔

سوال: ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کہاں پیدا ہوئے تھے؟

جواب: عرب کے ملک میں مکہ معظمہ ایک شہر ہے، اس میں پیدا ہوئے تھے۔

سوال: آپ کے والد اور دادا کا کیا نام تھا؟

جواب: آپ کے والد ماجد کا نام عبداللہ اور آپ کے دادا کا نام عبدالمطلب تھا۔

سوال: ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور پیغمبروں سے مرتبے میں بڑے ہیں یا چھوٹے؟

جواب: ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مرتبے میں سب پیغمبروں سے بڑے اور اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق سے زیادہ بزرگ ہیں۔

سوال: حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عمر کہاں رہے؟

جواب: ترپین (۵۳) سال کی عمر تک اپنے شہر مکہ معظمہ میں رہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے مدینہ منورہ میں چلے گئے اور دس (۱۰) سال وہاں رہے۔ پھر تریسٹھ (۶۳) سال کی عمر میں وفات پائی۔

سوال: اگر کوئی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانے وہ کیسا ہے؟

جواب: جو شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا رسول نہ مانے وہ بھی کافر ہے۔

سوال: حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے کا کیا مطلب ہے؟

جواب: حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا پیغمبر یقین کرے اور اللہ تعالیٰ کے بعد ساری مخلوق سے آپ کو افضل سمجھے اور آپ سے محبت رکھے اور آپ کے حکموں کی تابعداری کرے۔

سوال: یہ کیسے معلوم ہوا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں؟

جواب: انہوں نے ایسے اچھے کام کیے اور ایسی ایسی باتیں دکھائیں اور بتائیں جو پیغمبروں کے سوا اور کوئی شخص نہیں دکھا اور بتا سکتا۔

سوال: یہ کیسے معلوم ہوا کہ قرآن شریف اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے؟

جواب: حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اللہ تعالیٰ نے مجھ پہ نازل کی ہے یعنی اتاری ہے۔

سوال: قرآن مجید حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پورا ایک مرتبہ اترا یا تھوڑا تھوڑا؟

جواب: تھوڑا تھوڑا نازل ہوا۔ کبھی ایک آیت کبھی دو چار آیتیں کبھی ایک سورۃ۔ جیسی ضرورت ہوتی گئی، اترتا گیا۔

سوال: کتنے دنوں میں پورا قرآن مجید نازل ہوا؟

جواب: تیئس (۲۳) سال میں۔

سوال: قرآن مجید کس طرح نازل ہوتا تھا؟

جواب: حضرت جبرئیل علیہ السلام آ کر آپ کو آیت یا سورۃ سنا دیتے تھے آپ اسے سن کر یاد کر لیتے تھے اور کسی لکھنے والے کو بلا کر لکھوا دیتے تھے۔

سوال: آپ خود کیوں نہیں لکھ لیتے تھے؟

جواب: اس لیے کہ آپ اُمّی تھے۔

سوال: اُمّی کسے کہتے ہیں؟

جواب: جس نے کسی سے لکھنا پڑھنا نہ سیکھا ہو۔ اسے اُمّی کہتے ہیں۔

اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں کسی سے علم نہیں سیکھا لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام مخلوق سے زیادہ علم دیا تھا۔

وضو کے فرائض

۱۔ منہ دھونا۔ پیشانی کے بالوں سے ٹھوڑی کے نیچے تک اور ایک کان سے دوسرے کان تک۔ ۲۔ چوتھائی سر کا مسح کرنا۔ ۴۔ دونوں پاؤں ٹخنوں سمیت دھونا۔

وضو کی سنتیں:

۱۔ نیت کرنا۔ ۲۔ بسم اللہ پڑھنا۔ ۳۔ پہلے تین بار ہاتھوں کو گٹوں تک دھونا۔ ۴۔ مسواک کرنا۔ ۵۔ تین بار کلی کرنا۔ ۶۔ تین بار ناک میں پانی ڈالنا۔ ۷۔ داڑھی کا خلال کرنا۔ ۸۔ ہاتھ پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا۔ ۹۔ ہر عضو کو تین بار دھونا۔ ۱۰۔ سارے سر کا مسح کرنا۔ ۱۱۔ ترتیب سے وضو کرنا۔ ۱۲۔ اعضاء کو پے در پے دھونا۔

وضو کے مستحبات:

۱۔ دائیں طرف سے شروع کرنا۔ ۲۔ گردن کا مسح کرنا۔ ۳۔ وضو کرنے میں دوسرے کی مدد نہ لینا۔ ۴۔ قبلہ کی طرف منہ کر کے بیٹھنا۔ ۵۔ پاک اور اونچی جگہ بیٹھنا۔

مفسداتِ وضو:

ا۔پیشاب یا پاخانہ کرنا۔۲۔ہوا کا خارج ہونا۔۳۔بدن کے کسی مقام سے پیپ یا خون کا بہہ کر نکلنا۔۴۔منہ بھر کے آنا۔۵۔لیٹ کر یا سہارا لگا کر سو جانا۔۶۔بیماری یا کسی وجہ سے بے ہوش ہو جانا۔۷۔پاگل ہو جانا۔۸۔نماز میں قہقہہ لگا کر ہنسنا۔

مکروہاتِ وضو:

ا۔ناپاک جگہ پر بیٹھ کر وضو کرنا۔۲۔سیدھے ہاتھ سے ناک صاف کرنا۔۳۔وضو کے دوران دنیوی باتیں کرنا۔ ۴۔سنت کے خلاف وضو کرنا۔

وضو کرنے کا طریقہ

سوال: وضو کس طرح کرنا چاہیے؟

جواب: صاف برتن میں پاک پانی لے کر قبلہ رو اونچی جگہ پر بیٹھیں۔اگر اس کا موقع نہ ہو تو کچھ نقصان نہیں۔وضو شروع کرتے وقت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہیں اور تین مرتبہ گٹوں تک دونوں ہاتھ دھوئیں۔پھر مسواک کریں۔اگر مسواک نہ ہو تو انگلی ہی دانتوں پر مل لیں۔تین مرتبہ کلی کریں۔اگر روزہ دار نہ ہوں تو بہتر ہے کہ غرغرہ بھی کریں۔پھر تین مرتبہ ناک میں پانی ڈال کر بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے ناک صاف کریں۔پھر تین مرتبہ اس طرح چہرہ دھوئیں کہ سر کے بالوں سے لے کر ٹھوڑی کے نیچے تک اور ایک کان کی لو سے دوسرے کان کی لو تک سب جگہ پانی بہہ جائے۔پھر تین بار داہنا بازو کہنی سمیت دھوئیں اور ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر خلال کریں اور اگر ہاتھ میں انگوٹھی ہو تو اسے ہلا لیں کہ کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے پھر بایاں بازو کہنی سمیت دھویں۔پھر نیا پانی لے کر گرا دیں اور ایک مرتبہ سر اور کانوں کا مسح کریں۔کانوں کے اندر کی طرف کا مسح کلمہ کی انگلی اور کانوں کے اوپر کا مسح انگوٹھے سے کریں۔کانوں کے مسح کے بعد انگلیوں کی پشت سے گردن کا مسح کریں۔پھر داہنا پاؤں ٹخنوں سمیت تین بار اور پھر بایاں پاؤں ٹخنوں سمیت تین بار دھوئیں اور بائیں ہاتھ کی چھنگلیا (چھوٹی انگلی) سے پیروں کی انگلیوں کا خلال کریں۔پاؤں کی داہنی چھنگلیا سے شروع کریں اور بائیں چھنگلیا پر ختم کریں۔

نماز کا بیان

نماز کی تیاری یعنی اپنے محبوب کی ملاقات کے لیے پہلا ادب اور سلیقہ وضو ہے۔اب ایک مسلمان اس قابل ہو گیا کہ اپنے محبوب کے بلاوے پر اس کے گھر میں جا کر حاضری دے۔اس حاضری کے بھی آداب ہیں۔حاضری دینے سے پہلے

چند ضروری احتیاطیں ملحوظ رکھنی ہیں۔ ان کو شرائط کہتے ہیں۔

نماز کی شرائط:

۱۔ بدن کا پاک ہونا۔ ۲۔ کپڑے کا پاک ہونا۔ ۳۔ جگہ کا پاک ہونا۔ ۴۔ ستر کا چھپانا۔ ۵۔ نماز کا وقت ہونا۔ ۶۔ قبلہ کی طرف منہ کرنا۔ ۷۔ دل میں نماز کی نیت کرنا۔

نماز کے ارکان

ارکان جمع ہے رکن کی۔ اس کے معنی ہیں ستون اور ستون کے بغیر کوئی عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی۔ ہاں ستون کی شکل بدل سکتی ہے۔ جیسا کہ پہلے زمانے میں ستون لکڑی کے ہوتے تھے۔ پھر اینٹوں کے بنے اور اب لوہے کے جال میں سیمنٹ اور بجری بھر کے اس سے ستون کا کام لیا گیا ہے۔ مگر اسلام نے نماز کے لیے جو ستون مقرر کیے ہیں یہ ناقابل تغیر ہیں۔ ان ارکانِ نماز کو نماز کے فرائض بھی کہا جاتا ہے جو تعداد میں چھ ہیں۔

فرائض نماز:

۱۔ تکبیر تحریمہ کہنا۔ ۲۔ قیام کرنا۔ ۳۔ قرأت۔ ۴۔ رکوع۔ ۵۔ دونوں سجدے کرنا۔ ۶۔ قعدہ اخیرہ میں التحیات کی مقدار بیٹھنا۔

واجباتِ نماز:

۱۔ فرض نمازوں کی پہلی دو رکعتوں کو قرأت کے لیے مقرر کرنا۔ ۲۔ فرض نمازوں کی پہلی رکعتوں میں اور واجب، سنتوں اور نفل نمازوں کی تمام رکعتوں میں سورۃ الفاتحہ کے بعد کوئی سورۃ یا ایک بڑی آیت یا تین چھوٹی آیات کا پڑھنا۔ ۳۔ سورۃ الفاتحہ کو قرأت قرآن سے پہلے پڑھنا۔ ۴۔ قرأت رکوع سجدوں اور رکعتوں کی ترتیب قائم رکھنا۔ ۵۔ قومہ۔ ۶۔ جلسہ۔ ۷۔ تعدیل ارکان۔ ۸۔ قعدہ اولیٰ۔ ۹۔ دونوں قعدوں میں تشہد پڑھنا۔ ۱۰۔ امام کا صلوٰۃ فجر، مغرب، عشاء، جمعہ، عیدین، تراویح اور رمضان المبارک میں وتر میں آواز سے قرأت کرنا۔ نماز ظہر اور عصر میں آہستہ قرأت کرنا۔ لفظ سلام سے نماز سے علیحدہ ہونا۔ ۱۲۔ وتر میں دعائے قنوت پڑھنا۔ ۱۳۔ دونوں عیدین کی نماز میں زائد تکبیریں کہنا۔

نماز کی سنتیں:

۱۔ تکبیر تحریمہ کہنے سے پہلے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھانا۔ ۲۔ دونوں ہاتھ کی انگلیاں اپنے حال میں کھلی اور قبلہ رخ

کرنا۔ ۳۔ تکبیر کہتے ہوئے سر کو نہ جھکانا۔ ۴۔ امام کا تکبیر تحریمہ اور رکن سے دوسرے رکن میں جانے کے لیے تمام تکبیریں باآواز بلند کہنا۔ ۵۔ سیدھے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے باندھنا۔ ۶۔ ثناء پڑھنا۔ ۷۔ تعوذ پڑھنا۔ ۸۔ تسمیہ پڑھنا۔ ۹۔ فرض نماز کی تیسری اور چوتھی رکعت میں سورۃ الفاتحہ پڑھنا۔ ۱۰۔ آمین کہنا۔ ۱۱۔ ثناء، تعوذ، بسم اللہ اور آمین سب آہستہ کہنا۔ ۱۲۔ سنت کے موافق قرأت کرنا۔ ۱۳۔ رکوع اور سجدے میں کم از کم تین مرتبہ تسبیح کہنا۔ ۱۴۔ رکوع میں سر اور پیٹھ کو ایک سیدھ میں رکھنا اور دونوں ہاتھوں کی کھلی انگلیوں سے گھٹنوں کو پکڑنا۔ ۱۵۔ قومہ میں امام کا تسمیع اور مقتدی کا تحمید کہنا اور منفرد کا دونوں کہنا۔ ۱۶۔ سجدہ میں جاتے وقت پہلے دونوں گھٹنے پھر دونوں ہاتھ پھر پیشانی رکھنا۔ ۱۷۔ جلسہ اور قعدہ میں بایاں پاؤں بچھا کر بیٹھنا اور سیدھے پاؤں کو اس طرح کھڑا رکھنا کہ اس کی انگلیوں کے سرے قبلہ کی طرف ہوں اور ہاتھ رانوں پر رہیں۔ ۱۸۔ تشہد میں انگشت شہادت سے اشارہ کرنا۔ ۱۹۔ قعدہ آخیرہ میں تشہد کے بعد درود پڑھنا۔ ۲۰۔ درود کے بعد دعا پڑھنا۔ ۲۱۔ پہلے دائیں طرف پھر بائیں طرف سلام پھیرنا۔

نماز پڑھنے کا طریقہ

طریقہ نماز

سنت کے مطابق نماز پڑھنے کا طریقہ یہ ہے کہ نماز پڑھنے کے مقام پر قبلہ کی طرف منہ کر کے باوضو ہو کر نہایت ہی ادب سے نماز پڑھنے والا کھڑا ہو جائے۔ پاؤں کے درمیان چار انگلی کا فاصلہ رکھے ہاتھوں کو اٹھا کر کانوں تک لے جائیں اور انگوٹھے کان کی لو سے لگائیں اور ہتھیلیاں قبلہ رخ رکھے پھر نیت کر کے ''اللہ اکبر'' کہہ کر ناف کے نیچے ہاتھ باندھیں، اس طرح کہ اپنی داہنی ہتھیلی کی گدی بائیں کلائی کے سرے پر ہو اور بیچ کی تین انگلیاں بائیں کلائی کی پشت پر اور انگوٹھا اور چھنگلیا کلائی کے اغل بغل، پھر ثناء ''سُبْحَانَکَ'' پڑھے پھر ''اَعُوْذُ بِاللّٰہِ'' پھر ''بِسْمِ اللّٰہِ'' پھر ''اَلْحَمْدُ'' شریف پڑھے اور ختم پر آمین آہستہ سے کہے اس کے بعد کوئی سورت یا تین آیتیں پڑھے یا ایک آیت جو تین آیات کے برابر ہو۔ اگر امام کے پیچھے پڑھ رہا ہو تو پھر ثناء پڑھ کر خاموش ہو جائے۔ اگر تلاوت جہری ہو تو خاموشی سے سنے۔ اگر اکیلا ہو تو خود پڑھے۔ اب ''اللّٰہ اکبر'' کہتا ہوا رکوع میں جائے اور گھٹنوں کو ہاتھ سے پکڑے اس طرح کہ ہتھیلیاں گھٹنے پر ہوں اور انگلیاں پھیلی ہوں۔ اس طرح نہیں کہ سب انگلیاں ایک طرف ہوں اور نہ اس طرح کہ چار انگلیاں ایک طرف اور ایک طرف صرف انگوٹھا، پیٹھ بچھی ہو اور سر پیٹھ کے برابر ہو اونچا نیچا نہ ہو۔ پھر کم سے کم تین بار ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ'' کہے پھر ''سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ'' کہتا ہوا سیدھا کھڑا ہو جائے اور منفرد ہو تو اس کے بعد ''اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ'' کہے پھر ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہتا ہوا سجدہ میں گر جائے اس طرح کہ گھٹنے زمین پر رکھے پھر ہاتھ، پھر دونوں ہاتھوں کے بیچ میں سر رکھے اور پیشانی اور ناک کی ہڈی خوب

جمائے اور بازوؤں کو کروٹوں اور پیٹ کو رانوں اور رانوں کو پنڈلیوں سے جدار کھے اور دونوں پاؤں کی سب انگلیوں کے پیٹ قبلہ رو جمے ہوں اور ہتھیلیاں بچھی ہوں اور انگلیاں قبلہ کو ہوں پھر کم از کم تین بار ''سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی'' کہے پھر سر اٹھالے پھر ہاتھ اور داہنا قدم کھڑا کر کے اس کی انگلیاں قبلہ رخ ہوں۔ اور بایاں قدم بچھا کر اس پر خوب سیدھا بیٹھ جائے اور ہتھیلیاں بچھا کر رانوں پر گھٹنے کے پاس رکھے کہ دونوں ہاتھ کی انگلیاں قبلہ کو ہوں پھر ''اَللّٰہُ اَکْبَرُ'' کہتا ہوا سجدے کو جائے اور اسی طرح سجدہ کرے پھر سر اٹھائے پھر ہاتھ کو گھٹنوں پر رکھ کر پنجوں کے بل کھڑا ہو جائے اب صرف ''بِسْمِ اللّٰہِ'' پڑھ کر قرأت شروع کردے پھر اسی طرح رکوع اور سجدہ کر کے داہنا قدم کھڑا کر کے بایاں قدم بچھا کر بیٹھ جائے اور ''اَلتَّحِیَّاتُ'' پڑھے اس کو تشہد کہتے ہیں اور جب کلمہ ''لَا'' کے قریب پہنچے تو داہنے ہاتھ کی بیچ کی انگلی اور انگوٹھے کا حلقہ بنائے اور چھنگلیا اور اس کے پاس والی کو ہتھیلی سے ملا دے اور لفظ ''لَا'' پر کلمہ کی انگلی اٹھائے مگر اس کو جنبش نہ دے اور کلمہ ''اِلَّا'' پر گرا دے اور سب انگلیاں فوراً سیدھی کرلے اور دو سے زیادہ رکعتیں پڑھنی ہیں تو اٹھ کھڑا ہو اور اسی طرح پڑھے مگر فرضوں کی ان رکعتوں میں ''اَلْحَمْدُ'' کے ساتھ سورۃ ملانا ضروری نہیں، اب آخری قعدہ جس کے بعد نماز ختم کرے گا اس میں تشہد کے بعد درود شریف پڑھے پھر دعا پڑھے، اس کے بعد داہنی طرف سلام پھیرے پھر بائیں طرف سلام پھیرے اس طرح نماز مکمل ہو جائے گی۔

☆ ☆ ☆

تعداد رکعات نماز پنجگانہ

نام نماز	غیر موکدہ سنت قبل فرض	سنت موکدہ قبل فرض	فرض	سنت موکدہ بعد فرض	نفل	کل رکعتیں
فجر	X	۲	۲	X	X	۴
ظہر	X	۴	۴	۲	۲	۱۲
عصر	۴	X	۴	X	X	۸
مغرب	X	X	۳	۲	۲	۷
عشاء	۴	X	۴	۲ ۳ وتر واجب	۴ ۲ وتروں سے پہلے ۲ بعد	۱۷
میزان	۸	۶	۱۷	۶	۸	۴۸

نماز

ثناء:

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَ تَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ ط

تو پاک ہے اے اللہ میں تیری حمد کرتا ہوں تیرا نام برکت والا ہے اور تیری شان بہت بلند ہے اور تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

تعوذ:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ط

میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

تسمیہ:

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

سورۃ الفاتحہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ O الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ O

سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے

مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ O اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ O

قیامت کے دن کا مالک ہے۔ (اے اللہ) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ O صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ

ہمیں صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے۔ یہ راستہ ان لوگوں کا ہے جن پر تو نے

عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ O

انعام کیا نہ ان لوگوں کا راستہ جو (تیرے) غضب میں مبتلا ہوئے اور نہ گمراہوں کا۔

اٰمِیْنَO

الٰہی قبول فرما

سورۃ اخلاص:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌO اَللّٰهُ الصَّمَدُO لَمْ يَلِدْ ۵ وَلَمْ

کہو وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ

يُوْلَدْO وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌO

کسی سے جنا گیا۔ اور کوئی بھی اس کا ہم سر نہیں ہے

رکوع کی تسبیح:

سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ

میرا پروردگار عظمت والا پاک ہے

تسمیع:

سَمِعَ اللّٰهُ لِمَنْ حَمِدَهٗ

اللہ نے اس کی سن لی جس نے اس کی تعریف کی۔

تحمید:

رَبَّنَالَکَ الْحَمْدُ

اے ہمارے پروردگار سب تعریف تیرے ہی لیے ہے۔

سجدہ کی تسبیح:

سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى

پاک ہے میرا پروردگار جو بہت بلند ہے۔

تشہد:

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰتُ وَ الطَّیِّبٰتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ

تمام زبان کی عبادتیں اور تمام جسم کی عبادتیں اور تمام مالی عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ سلام ہو تم پر

اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ ط اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا

اے نبیؐ اور اللہ کی رحمتیں اور اس کی برکتیں۔ سلام ہو ہم پر

وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَO اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

اور اللہ کے نیک بندوں پر۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوائی کوئی عبادت کے لائق نہیں

وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗO

اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔

درود شریف:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا

اے اللہ صلوٰۃ بھیج حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر جس طرح

صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ

تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل پر صلوٰۃ بھیجی۔ بے شک تو تعریف کیا گیا

مَّجِیْدٌO اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

بزرگ ہے۔ اے اللہ برکت دے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل کو

کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ اِنَّکَ

جس طرح تو نے برکت دی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل کو۔ بے شک تو

حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌO

تعریف کیا گیا بزرگ ہے۔

دعا:

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ

اے میرے اللہ مجھ کو نماز پر قائم کردے اور میری اولاد کو بھی۔ اے ہمارے پروردگار میری دعا

دُعَآءِO رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ

قبول فرما۔ اے ہمارے پروردگار مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور سارے مومنین کو یوم حساب کے دن

الْحِسَابِO

بخش دے۔

سلام:

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ

تم پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت۔

فرض کے بعد کی دعائیں:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا

اے ہمارے رب تو ہمیں دنیا میں نیکی عطا کر اور آخرت میں نیکی دے اور ہمیں جہنم

عَذَابَ النَّارِO

کے عذاب سے بچا

یا دوسری دعا:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْکَ السَّلَامُ وَاِلَیْکَ یَرْجِعُ

اے اللہ تو سلامتی والا ہے اور تجھی سے سلامتی ہے اور سلامتی تیری طرف رجوع

السَّلَامُ حَیِّنَ رَبَّنَا بِالسَّلَامِ وَاَدْخِلْنَا دَارَ السَّلَامِ

کرتی ہے اے ہمارے پروردگار ہمیں سلامتی کے ساتھ زندہ رکھ اور ہمیں سلامتی کے گھر

تَبَارَکْتَ رَبَّنَا وَ تَعَالَیْتَ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِO

داخل کرائے ہمارے پروردگار تو برکت والا ہے اور بلند ہے اے عظمت اور بزرگی والے۔

دعائے قنوت:

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ وَنَسْتَغْفِرُکَ وَنُؤْمِنُ بِکَ

اے اللہ ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں اور مغفرت طلب کرتے ہیں اور تیرے اوپر ایمان لاتے ہیں

وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْکَ وَنُثْنِیْ عَلَیْکَ الْخَیْرَ وَنَشْکُرُکَ

اور تیرے اوپر بھروسہ رکھتے ہیں اور تیری بہتر تعریف کرتے ہیں اور تیرا شکر ادا کرتے ہیں

وَلَا نَکْفُرُکَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ اَللّٰھُمَّ

اور تیری ناشکری نہیں کرتے اور علیحدہ کردیتے اور چھوڑ دیتے ہیں اس شخص کو جو تیری نافرمانی کرے اے اللہ

اَیَّاکَ نَعْبُدُ وَلَکَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ وَاِلَیْکَ نَسْعٰی

ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور خاص تیرے لیے نماز پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں اور تیری ہی جانب دوڑتے ہیں

وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْ رَحْمَتَکَ وَنَخْشٰی عَذَابَکَ اِنَّ

اور تیری ہی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں

عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌO

تیرا عذاب کافروں کو پہنچنے والا ہے۔

☆ ☆ ☆

نماز باجماعت پڑھنے کا طریقہ

اقامت کے بعد امام تکبیر تحریمہ کے بعد ثناء تعوذ اور تسمیہ پڑھ کر الفاتحہ اور سورت پڑھے گا مقتدی پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ کہہ کر ہاتھ باندھنے کے بعد سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ اِلٰہُ غَیْرُکَ تک پڑھ کر خاموش رہے۔ بعد میں شریک ہونے والے مقتدی پہلی رکعت میں جہری نماز میں قرأت شروع ہونے سے پہلے اور دوسری نماز ہونے کی صورت میں امام کے رکوع میں جانے سے

پہلے ثناء پڑھ سکتا ہے، جب امام آواز سے قرأت کر رہا ہو تو مقتدی قرأت کو سنے ولا الضالین کے بعد آہستہ آمین کہے۔ مقتدی قیام کے سوا باقی تمام موقعوں پر مقررہ دعائیں پڑھے، امام رکوع کے بعد سمع اللہ لمن حمدہ کہے گا، مقتدی صرف ربنا لک الحمد کہتا ہوا کھڑا ہو مقتدی کو ہر رکن امام کے ساتھ بغیر دیر لگا کر ادا کرنا سنت ہے۔ اگر اس قدر دیر لگائی کہ متابعت میں شک ہونے لگے تو نماز نہیں ہوگی۔ اگر امام سے پہلے چلا گیا تو بھی نماز نہیں ہوگی۔ کیونکہ مقتدی کی نماز امام کے تابع ہے اقتدا کی صورت میں مقتدی سے سہوا (بھول کر) کوئی واجب ترک ہو جائے تو اس کی نماز ہو جاتی ہے، سجدہ سہو واجب نہیں ہوتا البتہ اگر کسی واجب کو جان بوجھ کر چھوڑ دے یا کوئی فرض چھوٹ جائے تو اس سے نماز فاسد ہو جائے گی۔ مقتدی تشہد، التحیات اور دعائیں خود پڑھے اور امام کے ساتھ سلام پھیر دے۔

☆☆☆

نماز جمعہ کا طریقہ

1۔ جمعہ کے روز نماز جمعہ کی اذان ہو چکنے کے بعد چار سنتیں (مؤکدہ) ادا کرے۔

2۔ خطبہ جمعہ (عربی میں) نہایت خاموشی اور ادب سے سنے، یاد رہے۔ عربی خطبہ سننا واجب ہے۔ دوران خطبہ بات کرنا ممنوع ہے۔

3۔ حضور اقدس ﷺ کا اسم گرامی آئے تو زبان سے درود نہ پڑھیں البتہ دل میں پڑھ سکتے ہیں۔

4۔ خطبہ جمعہ کے بعد دو رکعت امام صاحب کی اقتداء میں ادا کرے۔ نیت کے لئے اتنا کافی ہے کہ میں امام کے پیچھے جمعہ کی نماز ادا کر رہی / کر رہا ہوں۔

5۔ مقتدی کو ہر رکن امام کے ساتھ بغیر دیر لگائے ادا کرنا ضروری ہے۔ اگر اس قدر دیر لگائی کہ متابعت میں شک ہونے لگے تو نماز نہیں ہوگی اگر امام سے پہلے چلا گیا تو بھی نماز نہیں ہوگی۔

6۔ مقتدی امام صاحب کے ساتھ تکبیر تحریمہ کہہ کر ہاتھ باندھے اور ثناء یعنی سبحانک اللھم کو ولا الٰہ غیرک پڑھ کر خاموش رہے امام قرأت کرے تو خاموشی سے سنے اور و الضالین کے بعد آہستہ سے آمین کہے تکبیریں، رکوع اور سجدے کی تسبیحات خود پڑھے۔ امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے گا مقتدی صرف ربنالک الحمد کہتا ہوا کھڑا ہو۔ مقتدی دو رکعت کے آخر میں تشہد میں التحیات اور دیگر دعائیں خود پڑھے امام کے ساتھ سلام پھیرے۔

7۔ نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد دعا سے فارغ ہو کر چار سنتیں (مؤکدہ) اور پھر دو سنتیں، پھر دو نفل ادا کرے۔

☆☆☆

نمازِ جنازہ

نمازِ جنازہ فرضِ کفایہ ہے۔ اگر چند آدمی کسی کی نمازِ جنازہ پڑھ لیں تو باقی سب بری الذمہ ہو جائیں گے۔ اگر کوئی بھی نہ پڑھے تو سب گنہگار ہوں گے۔ اس کے لیے جماعت شرط نہیں۔ اگر ایک آدمی بھی پڑھ لے تو فرض ادا ہو جائے گا۔ نمازِ جنازہ واجب ہونے کی وہی شرائط ہیں جو اور نمازوں کے لیے ہیں، یعنی قادر عاقل بالغ مسلمان ہونا، جس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے اس کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔ میت کا جسم و کفن پاک ہونا چاہیے۔ جہاں نمازِ جنازہ ہو اس کے آگے جنازہ ہونا چاہیے۔ جنازے کو زمین پر رکھنا چاہیے۔ جنازہ مصلّی کے آگے قبلہ رخ ہونا چاہیے۔ میت کا وہ حصہ چھپا ہونا چاہیے جسے از روئے شریعت چھپانا ضروری ہے۔ میت کو امام کے متوازی ہونا چاہیے۔ نمازِ جنازہ میں دو فرائض ہیں یعنی چار مرتبہ اللہ اکبر کہنا اور کھڑے ہو کر نمازِ جنازہ پڑھنا۔ اس میں تین سنتِ مؤکدہ ہیں۔ اللہ کی حمد و ثنا کرنا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا اور میت کے لیے دعا کرنا۔ اگر کئی جنازے ایک وقت میں جمع ہوں تو سب کی نمازِ جنازہ ایک مرتبہ ہو سکتی ہے مگر افضل یہ ہے کہ علیحدہ علیحدہ پڑھی جائے۔ نمازِ جنازہ میں امام کو میت کے سینے کے سامنے کھڑا ہونا چاہیے۔ نمازِ جنازہ پڑھنے کا طریقہ حسب ذیل ہے۔

طریقہ نماز:

پہلے نیت کر کے امام و مقتدی کانوں تک ہاتھ اٹھائیں اور اللہ اکبر کہتے ہوئے ناف کے نیچے باندھ لیں اور ثناء پڑھیں "وَتَعَالٰی جَدُّکَ" کے بعد "وَجَلَّ ثَنَاؤُکَ وَلَآ اِلٰهَ غَیْرُکَ" پڑھیں، پھر بغیر ہاتھ اٹھائے تکبیر کہیں اور وہی نماز والا درود شریف پڑھیں، پھر بغیر ہاتھ اٹھائے تکبیر کہیں اور دعا پڑھیں، پھر ہاتھ چھوڑ کر سلام پھیر دیں۔ مقتدی تکبیریں آہستہ کہے اور امام زور سے۔

بالغ مرد و عورت کی دعا:

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَیِّنَا وَمَیِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَآئِبِنَا وَصَغِیْرِنَا وَکَبِیْرِنَا وَذَکَرِنَا وَاُنْثَانَا اَللّٰهُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَه مِنَّا فَاَحْیِه عَلَی الْاِسْلَامِ وَمَنْ تَوَفَّیْتَه مِنَّ فَتَوَفَّه عَلَی الْاِیْمَانِ ط

نابالغ لڑکے کی دعا:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ فَرَطاً وَّاجْعَلْهُ لَنَآ اَجْراً وَّذُخْراً وَّاجْعَلْهُ لَنَا شَافِعاً وَّمُشَفَّعاً ط

نابالغ لڑکی کی دعا:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْھَا لَنَا فَرَطاً وَّاجْعَلْھَا لَنَآ اَجْراً وَّذُخْراً وَّاجْعَلْھَا لَنَا شَافِعَۃً وَّمُشَفَّعَۃً ط

دعا کے بعد چوتھی تکبیر کہہ کر ہاتھ چھوڑ دیں اور سلام پھیر دیں۔

☆ ☆ ☆

تیمّم

اللہ تعالیٰ چونکہ خود انسان کا خالق ہے۔ اس لیے اس کی مجبوریوں اور ضرورتوں سے بھی خوب واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ انسان کو کبھی ایسے حالات سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے سامنے حاضر ہونے کے لیے پہلے ادب کا تقاضا بھی پورا نہیں کر سکتا۔ یعنی وضو کرنے سے معذور ہے۔

اللہ تعالیٰ ایسا کریم ہے کہ اس نے اپنے بندے کو ایک رعایت دے دی۔ کہ اسے یہ احساس نہ ہونے پائے کہ میں اپنے محبوب کی ملاقات سے محروم ہو گیا۔ اس رعایت کا نام تیمّم ہے۔ اب اس کے مسائل بیان ہوتے ہیں۔

تیمّم اور اس کے مسائل:

پاک مٹی یا کسی ایسی چیز سے جو مٹی کے حکم میں ہو بدن کو نجاست حکمیہ سے پاک کرنے کو تیمّم کہتے ہیں۔ اگر غسل اور وضو دونوں کی نیت کی ہو تو ایک بار تیمّم کرنا کافی ہے۔ باقی جو احکام وضو کے ہیں وہی تیمّم کے ہیں۔ ہاں جب عذر ختم ہو جائے تو تیمّم بھی ختم ہو جاتا ہے۔

تیمّم کے فرائض:

۱۔ نیت کرنا۔ ۲۔ دونوں ہاتھ مٹی پر مار کر سارے چہرے پر پھیرنا کہ بال برابر بھی جگہ خالی نہ رہے۔ ۳۔ دونوں ہاتھ مٹی پر مار کر دونوں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت ملنا۔

تیمّم کا طریقہ:

نیت کرے کہ میں ناپاکی دور کرنے اور نماز پڑھنے کے لئے تیمّم کرتا / کرتی ہوں۔ پھر دونوں ہاتھوں کو ایسی جگہ رکھے جو مٹی کی جنس سے ہو (مثلاً مٹی، ریت، پتھر وغیرہ) اس پر ہاتھ مار کر جھاڑ دے تاکہ فالتو مٹی اتر جائے۔ پھر دونوں ہاتھوں کو چہرے پر اس طرح پھیرے کہ کوئی جگہ رہ نہ جائے۔ ایک بال برابر جگہ بھی چھوٹ گئی تو تیمّم درست نہ ہوگا۔ پھر دوسری مرتبہ دونوں ہاتھ مٹی پر مارے اور انہیں جھاڑ کر پہلے بائیں ہاتھ کی چھنگلیا کی طرف سے تین انگلیاں دائیں ہاتھ کی تین انگلیوں کے سروں کے نیچے پشت کی طرف کھینچتا ہوا کہنی تک لے جا کر بازو کو موڑ دے تاکہ کہنیوں کا مسح بھی ہو جائے۔ پھر بائیں ہاتھ کی ہتھیلی بازو

کے اوپر کی طرف پھیرے اور بائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان آجائے اور بائیں ہاتھ کا انگوٹھا دائیں ہاتھ کی شہادت والی انگلی پر پھر جائے۔ اسی طرح دوسرے بازو کا تیمم مکمل کرے۔ آخر میں انگلیوں کے درمیان خلال کرے خواتین چوڑیاں، انگوٹھیاں وغیرہ اتار لیں تا کہ کوئی جگہ خالی نہ رہے۔

غسل

زندگی میں ایسے حالات بھی پیش آتے ہیں کہ انسان اس مختصری صفائی سے خود مطمئن نہیں ہوتا۔ فطرت تقاضا کرتی ہے کہ سارے بدن کی طہارت اور صفائی مکمل طور پر ہو۔ تو انسان کے اس فطری تقاضا کو پورا کرنے کے لیے فقہ میں ایک عمل پر بحث کی گئی ہے جس نام غسل ہے۔

غسل کے متعلق چند ضروری مسائل

غسل کب فرض ہوتا ہے:

ا۔ عورت سے صحبت کرنا۔ ۲۔ بدخوابی میں احتلام ہونا۔ ۳۔ جب عورت حیض ونفاس سے پاک ہو۔

غسل کے فرائض:

ا۔ کلی کرنا۔ ۲۔ ناک میں پانی ڈالنا۔ ۳۔ تمام بدن پر ایک مرتبہ پانی بہانا کہ کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے۔

غسل کی سنتیں:

ا۔ دونوں ہاتھ گٹوں تک دھونا۔ ۲۔ استنجا کرنا اور جہاں غلاظت لگی ہوا سے صاف کرنا۔ ۳۔ ناپاکی دور کرنے کی نیت کرنا۔ ۴۔ غسل سے پہلے وضو کرنا۔ ۵۔ تمام بدن پر تین بار پانی بہانا۔

چند شرعی اصطلاحات

جیسا کہ شروع میں بتایا گیا ہے کہ فقہ وہ علم ہے جو انسان کے فرائض اور حقوق کی تفصیل بتاتا ہے۔ جو اصولی طور پر بڑے اختصار سے قرآن وسنت میں بتائے گئے ہیں۔ یہ سارا کام دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ یعنی کرنے کے کام کونسے ہیں اور نہ کرنے کے کونسے۔

یہ ہمارا روزمرہ کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ مختلف کاموں کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ بعض نہایت ضروری ہوتے ہیں۔ بعض کی ضرورت نسبتاً کم ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہر علم وفن کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں۔ جب تک ان کا علم نہ ہو اس فن کے سمجھنے میں دقت

پیش آتی ہے اس لیے سب سے پہلے علم فقہ کی چند ضروری اصطلاحات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

ا۔فرض:

وہ عمل جو قطعی دلیل سے ثابت ہو۔فرض رہ جائے تو نماز نہیں ہوتی۔

۲۔واجب:

وہ عمل جو دلیلِ ظنی سے ثابت ہو۔نماز میں واجب رہ جائے تو سجدۂ سہو لازم آتا ہے۔

۳۔سنت:

وہ عمل جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہو۔ترک سنت گناہ ہے۔نماز میں غلطی سے سنت رہ جائے تو نماز ہو جاتی ہے۔

۴۔مستحب:

وہ عمل جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند ہو کبھی کیا ہو کبھی چھوڑا ہو، کرنے کا ثواب ہے۔نہ کرنے کا گناہ نہیں۔

۵۔مباح:

وہ عمل جس کی اجازت ہو۔کرنے نہ کرنے میں ثواب وگناہ نہیں۔

۶۔حرام:

وہ عمل جس کی ممانعت دلیلِ قطعی سے ثابت ہو۔ایسا عمل کرنے میں عذاب ہے اور حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے۔

۷۔مکروہ:

وہ ناپسندیدہ کام جس کی ممانعت ہو۔اس کی دو قسمیں ہیں۔

ا۔ مکروہِ تحریمی: جو حرام کے قریب ہو۔

ب۔ تنزیہی: اس سے بچنا بہتر ہے۔

۸۔مفسد:

وہ عمل جو کسی جائز عمل کو باطل یا بیکار کر دے۔

نوٹ: مزید مطالعے کے لیے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تصنیف ''مسائل نماز'' ملاحظہ فرمائیں۔

اسباق عربی

اَلدَّرْسُ الاوّل

کلمہ

ہر بامعنی لفظ کوکلمہ کہتے ہیں۔جیسے

قَلَمٌ مُحَمَّدٌ کِتَابٌ

اٰمَنَ (ایمان لایا) جَآءَ (آیا) دَخَلَ (داخل ہوا)

مِنْ (سے) عَلٰی (پر) هَلْ (کیا)

یعنی ہر وہ لفظ جو کوئی نہ کوئی مطلب رکھتا ہو۔کلمہ کہلاتا ہے۔

کلمہ کی اقسام

کلمہ کی تین اقسام ہیں:

1۔اسم 2۔فعل 3۔حرف

1۔اسم:

اسم وہ کلمہ ہوتا ہے جو کسی انسان،حیوان یا چیز کا نام ہو۔اسم کالفظی مطلب بھی (نام) ہے۔یعنی کسی بھی انسان حیوان یا چیز کو جس نام سے پکارا جائے اسے اسم کہتے ہیں۔مثلاً

خَالِدٌ هِرَّةٌ (بلّی) قَلَمٌ (قلم) کُرْسِیٌّ (کرسی)

2۔فعل:

فعل کا لفظی مطلب ہے کام یا عمل۔فعل وہ کلمہ ہے جس میں کسی کام کا کرنا یا ہونا کسی نہ کسی زمانے میں پایا جائے۔جیسے

ذَهَبَ (وہ گیا) ضَرَبَ (اس نے مارا) شَكَرَ (اس نے شکر کیا)

3۔حرف:

حرف وہ کلمہ ہے جو اسم یا فعل کے ساتھ مل کر استعمال ہوتا ہے۔حرف کا کوئی نہ کوئی مطلب ضرور ہوتا ہے۔مگر حرف اکیلا استعمال نہیں ہوتا۔مثلاً

مِنْ (سے) اِلٰی (تک) عَلٰی (پر)

مشق

س1۔ اسم کی کوئی سی پانچ مثالیں دیں؟

س2۔ فعل کی کوئی سی پانچ مثالیں دیں؟

س3۔ مندرجہ ذیل میں سے اسم، فعل، حرف الگ الگ کریں؟

اُمٌّ	(ماں)	دَجَاجَةٌ	(مرغی)	اَخَذَ	(اس سے پکڑا)
مُسْلِمُوْنَ	(سب مسلمان)	فِيْ	(میں)	ذَهَبَ	(وہ گیا)
عَلٰى	(پر)	اَلْقَلَمُ	(قلم)	اِلٰى	(طرف)

س4۔ مندرجہ ذیل فقرات میں سے اسم، فعل، حرف الگ کریں؟

ا . ذَهَبَ خَالِدٌ اِلَى الْمَسْجِدِ.	خالد مسجد کی طرف گیا۔
ب. كَتَبَ زَيْدٌ بِالْقَلَمِ	زید نے قلم سے لکھا۔
ج. اَلْقُرْاٰنُ مِنَ اللّٰهِ	قرآن اللہ کی طرف سے ہے۔
د. اَلنَّارُ لِلْكٰفِرِيْنَ	دوزخ (آگ) کافروں کے لیے ہے۔
ر . سِرْتُ مِنَ الْبَيْتِ اِلَى الْمَدْرَسَةِ.	میں گھر سے سکول کی طرف چلا۔

الدَّرْسُ الثَّانی

اسم کی اقسام

اسم کی دو اقسام ہیں۔

1۔اسم نکرہ 2۔اسم معرفہ

1۔اسم نکرہ:

اسم نکرہ وہ اسم ہے جو کسی خاص چیز یا جگہ کا نام نہ ہو۔ بلکہ ایک ہی قسم کی کئی چیزوں کا نام ہو۔جیسے

قَلَمٌ وَلَدٌ (بچہ) رَجُلٌ (مرد) اَسَدٌ (شیر)

مَدْرَسَۃٌ بَیْتٌ (گھر) جَمَلٌ (اونٹ)

اسم نکرہ کے شروع میں (اَلْ) لگایا جائے تو وہ اسم معرفہ بن جاتا ہے۔ جب اسم نکرہ پر الف لام (اَلْ) داخل ہو۔ تو اسم نکرہ کی تنوین بھی گر جاتی ہے۔جیسے

قَلَمٌ سے اَلْقَلَمُ

وَلَدٌ سے اَلْوَلَدُ

مَدْرَسَۃٌ سے اَلْمَدْرَسَۃُ

نوٹ: دو پیش دو زبر اور دو زیر کو تنوین کہتے ہیں۔

2۔اسم معرفہ:

خاص شخص، جگہ یا چیز کے نام کو اسم معرفہ کہتے ہیں جیسے

قُرْاٰنٌ فَاطِمَۃُ مُلْتَانُ دَارُالْعِرْفَان قُرَیْشٌ

مشق

أُخْتٌ سَلِيْمٌ كِتَابٌ اَلْقَلَمُ زَهْرَةٌ (پھول)

مَكَّةُ اَلْبَيْتُ مَسْجِدٌ اَلْمَدْرَسَةُ عَبْدٌ (بندہ)

مُسْلِمٌ خَالِدٌ دَرَّاجَةٌ (سائیکل)

(رَجُلٌ) (سَقْفٌ) (اَلْمَلِكُ وَ خَادِمٌ)

(اَلْمُعَلِّمُ وَ تِلْمِيْذٌ)

مشق

س 1۔ مندرجہ ذیل میں سے اسم نکرہ اور اسم معرفہ الگ کریں؟

اُخْتٌ	سَلِيْمٌ	كِتَابٌ	اَلْقَلَمُ.	زَهْرَةٌ (پھول)
مَكَّةُ	اَلْبَيْتُ	مَسْجِدٌ	اَلْمَدْرَسَةُ	عَبْدٌ (بندہ)

س 2۔ عربی میں ترجمہ کریں؟

کوئی ایک آدمی۔	ایک چھت۔	بادشاہ اور ایک نوکر۔
رَجُلٌ	سَقْفٌ	اَلْمَلِكُ وَخَادِمٌ

استاد اور ایک شاگرد	دودھ اور کچھ شہد
اَلْمعَلِّمُ وَتِلْمِيْذٌ	اَللَّبَنُ وَعَسَلٌ

اَلدَّرسُ الثَّالِثُ

فعل

فعل کی مشہور اقسام مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔فعل ماضی 2۔فعل مضارع 3۔فعل امر

1۔فعل ماضی:

ماضی گزرے ہوئے زمانے کو کہتے ہیں:

فعل ماضی سے مراد ہے کہ کام کا کرنا یا ہونا گزرے ہوئے زمانے میں پایا جائے۔یعنی کوئی کام جو گزرے ہوئے زمانے میں مکمل ہو چکا ہو۔جیسے

دَخَلَ	وہ داخل ہوا	شَرِبَ	اُس نے پیا
سَمِعَ	اس نے سنا	كَتَبَ	اس نے لکھا

نوٹ: کوئی فعل فاعل کے بغیر سرزد نہیں ہوتا۔ ہر فعل کا کوئی نہ کوئی فاعل ہوتا ہے۔کبھی فاعل نام کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔اسے اسم ظاہر کہتے ہیں،کبھی فاعل اسم ضمیر کی صورت میں ہوتا ہے۔جب فاعل اسم ضمیر ہوتو ہر فعل کے عربی میں چودہ صیغے استعمال ہوتے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فاعل مذکر ہے یا مؤنث ہے غائب یا حاضر ہے یا مُتکلم ہے اس طرح ان چودہ صیغوں سے پتہ چلتا ہے کہ فاعل کام کرنے والا واحد ہے تثنیہ (دو) ہے یا جمع ہیں۔

گردان فعل ماضی معروف مطلق

غائب:

غائب کے چھ صیغے ہوں گے۔تین مذکر کے لئے اور تین مؤنث کے لیے۔

1۔واحد مذکر غائب

2۔تثنیہ مذکر غائب مذکر

3۔جمع مذکر غائب

1۔واحد مؤنث غائب

2۔تثنیہ مؤنث غائب مؤنث

3۔جمع مؤنث غائب

حاضر:اسی طرح حاضر کے چھ صیغے ہوں گے۔

1۔واحد مذکر حاضر

2۔تثنیہ مذکر حاضر مذکر

3۔جمع مذکر حاضر

1۔واحد مؤنث حاضر

2۔تثنیہ مؤنث حاضر مؤنث

3۔جمع مؤنث حاضر

متکلم:

متکلم کا مطلب ہے کہ کلام کرنے والا،یعنی بات کرنے والے کی اپنی ذات،متکلم میں دو صیغے ہوتے ہیں۔ایک واحد اور دوسرا جمع.

1۔واحد متکلم مذکر مؤنث کے لیے ایک ہی صیغہ ہے۔

2۔جمع متکلم جمع متکلم مذکر مؤنث کے لیے ایک ہی صیغہ ہے۔

فعل ماضی کے کسی بھی فعل سے گردان بنانے کے لئے اوزان مندرجہ ذیل گردان کے مطابق ہوں گے۔ اعراب میں تبدیلی دوران تدریس بتائی جائے۔

غائب:

فَعَلَ	اس ایک مرد نے کام کیا۔	
فَعَلَا	ان دو مردوں نے کام کیا۔	مذکر
فَعَلُوْا	ان سب مردوں نے کام کیا۔	
فَعَلَتْ	اس ایک عورت نے کام کیا۔	
فَعَلَتَا	ان دو عورتوں نے کام کیا۔	مؤنث
فَعَلْنَ	ان سب عورتوں نے کام کیا۔	

حاضر:

فَعَلْتَ	تو ایک مرد نے کام کیا۔	
فَعَلْتُمَا	تم دو مردوں نے کام کیا۔	مذکر
فَعَلْتُمْ	تم سب مردوں نے کام کیا۔	
فَعَلْتِ	تو ایک عورت نے کام کیا۔	
فَعَلْتُمَا	تم دو عورتوں نے کام کیا۔	مؤنث
فَعَلْتُنَّ	تم سب عورتوں نے کام کیا	

فَعَلْتُ	میں نے کام کیا۔	(چاہے عورت نے یا مرد نے)
فَعَلْنَا	ہم نے کام کیا۔	(ہم سب عورتیں یا مرد)

- نوٹ: ماضی معروف کے صیغہ واحد مذکر غائب کے پہلے اور تیسرے حرف پر ہمیشہ زبر ہوتی ہے۔ لیکن درمیان کے حرف پر تینوں میں سے کوئی ایک حرکت آتی ہیں جیسے

حرف پر تینوں میں سے کوئی ایک حرکت آتی ہیں جیسے

كَتَبَ (اس نے لکھا) شَرِبَ (اس نے پیا) حَسُنَ (وہ خوبصورت ہوا)

درمیان والے حرف پر جو حرکت ہوگی پوری گرداں میں وہی حرکت استعمال ہوگی۔ جیسے

ضَرَبَ ضَرَبَا ضَرَبْتَ ضَرَبْتُمَا وغیرہ

ماضی قریب:

ماضی کی گردان کے شروع میں قَدْ لگا دیں۔ تو وہ فعل ماضی قریب بن جاتا ہے۔ جیسے

كَتَبَ اس نے لکھا

قَدْ كَتَبَ اس آدمی نے لکھا ہے۔

ماضی بعید:

فعل ماضی کے ساتھ کَانَ لگانے سے ماضی بعید بن جاتا ہے۔ جیسے

كَتَبَ سے كَانَ كَتَبَ اس آدمی نے لکھا تھا۔

نوٹ: کَانَ کی پوری گردان ہے۔ جو اپنے صیغوں کے مطابق آتی ہے۔ کَانَ کے بھی پورے چودہ صیغے ہیں جو اس طرح لکھے جاتے ہیں۔

غائب:

واحد مذکر غائب كَانَ

تثنیہ كَانَا

جمع كَانُوْا

واحد مؤنث غائب كَانَتْ

تثنیہ كَانَتَا

جمع كُنَّ

واحد مذکر حاضر كُنْتَ

تثنیہ كُنْتُمَا

جمع كُنْتُمْ

واحد مؤنث حاضر كُنْتِ

تثنیہ كُنْتُمَا

جمع كُنْتُنَّ

واحد متکلم كُنْتُ

جمع متکلم كُنَّا

مشق

س1۔ فَتَحَ سے فعل ماضی معروف مطلق کی گردان لکھیں؟

س2۔ شَرِبَ سے ماضی بعید کی گردان بنائیں؟

س3۔ عربی میں ترجمہ کریں افعال (فَتَحَ شَرِبَ أَكَلَ)

اس نے کھولا، میں نے کھولا، تم دونوں نے کھولا، تم دونوں نے پیا، ان دو لڑکوں نے کھایا، ہم نے کھایا۔

☆☆☆

الدرس الرَّابعُ

اسمائے اشارہ:

اسمائے اشارہ دو قسم کے ہیں۔ایک وہ قسم ہے جس سے نزدیک کی چیزوں کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔انہیں اسمائے اشارہ قریب کہا جاتا ہے۔وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

	واحد		تثنیہ		جمع	
مذکر	هٰذَا	یہ مذکر	هٰذَانِ	یہ دو	هٰؤُلَاءِ	یہ سب
مؤنث	هٰذِهٖ	یہ مؤنث	هَاتَانِ	یہ دو	هٰؤُلَاءِ	یہ سب

اسمائے اشارہ بعید:

یہ اسمائے اشارہ دور کی چیزوں کے لئے استعمال کیے جاتے ہیں۔

	واحد		تثنیہ		جمع	
مذکر	ذٰلِكَ	وہ	ذَانِكَ	وہ دو	أُولٰئِكَ	وہ سب
مؤنث	تِلْكَ	وہ	تَانِكَ	وہ دو	أُولٰئِكَ	وہ سب

یہ ایک ڈاکٹر ہے	هٰذَا طَبِيْبٌ	یہ ایک کتاب ہے	هٰذَا كِتَابٌ
یہ دو ڈاکٹر ہیں	هٰذَانِ طَبِيْبَانِ	یہ سب ڈاکٹر ہیں	هٰؤُلَاءِ أَطِبَّاءُ
وہ دو آدمی ہیں	ذَانِكَ رَجُلَانِ	وہ دو بلیں	ذَانِكَ اَكْبَرُ هَاتَانِ

الدرس الخامس،

ضمائر

ضمیر وہ اسم ہے جو غائب، مخاطب یا متکلم پر دلالت کرے۔

غائب:

	مذکر غائب		مؤنث
واحد	هُوَ	وہ (ایک) مرد	هِیَ، وہ ایک عورت
تثنیہ	هُمَا	وہ دو مرد	هُمَا، وہ دو عورتیں
جمع	هُمْ	وہ سب مرد	هُنَّ، وہ سب عورتیں

حاضر:

	مذکر حاضر		مؤنث حاضر	
واحد	أَنْتَ،	تو ایک مرد	أَنْتِ ،	تو ایک عورت
تثنیہ	أَنْتُمَا،	تم دو مرد	أَنْتُمَا،	تم دو عورتیں
جمع	أَنْتُمْ،	تم سب مرد	أَنْتُنَّ،	تم سب عورتیں

متکلم:

واحد	أَنَا	میں (مرد، عورت)
جمع	نَحْنُ	ہم (مرد، عورت)

أَنْتِ مُؤْمِنَةٌ۔	تو ایک مؤمن عورت ہے۔
هُوَ اشَقِيْقُکَ	وہ تمہارا حقیقی بھائی ہے۔
وَهُوَ اعَلٰی کُلِّ شَيٍ قَدِيْ	وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

أَنْتُمَا كَاذِبَانِ	تم دونوں جھوٹے ہو۔
أَنْتَ فِي ذِمَّةِ اللّٰهِ	تو خدا کے سپرد ہے۔
نَحْنُ مُسْلِمُوْنَ صَالِحُوْنَ	ہم نیک مسلمان (مرد) ہیں۔
اَنَامُسْلِمٌ صَالِحٌ	میں ایک نیک مسلمان ہوں۔
أَنْتِ بِنْتٌ صَغِيْرَةٌ	تو ایک چھوٹی بچی ہے۔

الدرس السادس

حروف استفہام

یہ وہ حروف ہیں جو سوالیہ جملوں میں استعمال ہوتے ہیں اور ابتداء ہی میں آتے ہیں۔ حروف استفہام مندرجہ ذیل ہیں۔

هَلْ ، کیا　همزه (اَ) کیا　مَنْ، کون　مَتٰی کب

أَيْنَ کہاں　اَنّٰی (کہاں سے)　مَا، کیا　مَاذَا، کیا

كَيْفَ کیسے، کس طرح

هَلْ عِنْدَكَ كِتَابٌ؟	کیا پاس کتاب ہے؟
أَنْتَ مُسْلِمٌ؟	کیا تم مسلمان ہو؟
أَنْتَ مُسَافِرٌ؟	کیا تو مسافر ہے؟
مَنْ مُعَلِّمُكَ؟	تیرا اُستاد کون ہے؟
مَنْ جَالِسٌ عَلَى الْكُرسِيِ؟	کرسی پر کون بیٹھا ہے؟
مَتٰى تَذْهَبُ اِلَى الْمَدْرسَةِ؟	تم سکول کب جاتے ہو؟
أَيْنَ الْمَدْرسَةُ؟	سکول کہاں ہے؟
اَنّٰى لَكَ هٰذَا؟	تیرے پاس یہ کہاں سے آیا؟
مَاذَ اتُرِيْدُ؟	تم کیا چاہتے ہو؟
مَافِي يدِكَ؟	تیرے ہاتھ میں کیا ہے؟

فہرست کتب

حضرت امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

1۔ غبار راہ اول
2۔ غبار راہ دوئم
3۔ ارشاد السالکین اول
4۔ ارشاد السالکین دوئم
5۔ لطائف اور تزکیہ نفس
6۔ دیار حبیب میں چند روز
7۔ نور و بشر کی حقیقت
8۔ کنز الطالبین
9۔ راہی کرب و بلا
10۔ رموز دل
11۔ حضرت امیر معاویہؓ
12۔ طریق نسبت اویسیہ
13۔ تعلیمات و برکات نبوت
14۔ خطبات امیر
15۔ کنوز دل

ادارہ نقشبندیہ اویسیہ ادارالعرفان منارہ ضلع چکوال

www.QuranTafseer.net

الحمدللہ کوشش کی گئی ہے کہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے حوالے سے تمام کتابیں اور آڈیو ویڈیو بیانات کو آپکی سہولت کے لیے ایک جگہ پر اکٹھا کر دیا جائے اور تازہ جمعہ بیانات بھی آپ فوراسن سکیں۔ ویب سائیٹ کی اینڈرائیڈ اپلیکیشن بھی موجود ہے آپ اپنے اینڈرائیڈ موبائل میں پلے سٹور سرچ میں جا کر نیچے دیئے گئے الفاظ لکھ کر آسانی سے یہ اپلیکیشن سرچ کر کے

انسٹال کر سکتے ہیں۔

اس ویب سائیٹ اور اپلیکیشن سے آپ یہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں۔

1- مفسّر، مترجّم ومفکّرِ قرآن حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمۃ اللہ علیہ کی آڈیو، وڈیو اور تحریری تینوں طرح کی مکمل 30 پارہ اردو تفسیر اور مکمل 30 پارہ پنجابی تفسیر آڈیو وڈیو۔ 2- مشکوۃ شریف احادیث کی تشریح آسان ترین انداز میں آڈیو اور وڈیو بیانات۔ 3- اگر آپ کو قرآن ناظرہ پڑھنا نہی آتا یا آپ نے قرآن پڑھنا بہت پہلے سیکھا مگر اب صحیح تلفظ سے نہی پڑھ سکتے تو اب آپ دس دس منٹ کی کچھ وڈیوز دیکھ کر ناظرہ قرآن روانی سے پڑھنا سیکھ سکتے ہیں۔ 4- اس زمانہ کے سب سے مشہور 4 قاری صاحبان قاری مشری صاحب قاری السدیس صاحب قاری عبد الباسط صاحب اور قاری عادل الکلبانی صاحب کی آواز میں پورے قرآن کی آڈیوز سن سکتے ہیں۔ 5- حضرت مولانا امیر محمد اکرم اعوان رحمۃ اللہ علیہ کا نعتیہ کلام 6- ذکر کرنے کا ایسا طریقہ جس سے آپ کا دل اور جسم کا ہر ذرہ اللہ کا ذکر کرنے لگے مکمل تفصیلات موجود۔ 7- پچھلے دس سال کے سالانہ اور ماہانہ روحانی اجتماعات آڈیو وڈیو بیانات کا خزانہ 8- اسلامی سوال جواب ٹی وی پروگرام المرشد کی تمام آڈیوز وڈیوز۔ 9- سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کی تمام کتابیں اور 1981 سے آج تک کے تقریبا تمام المرشد میگزین پی-ڈی-ایف میں ڈاؤن لوڈ کے لیے موجود۔ جلسوں، جمعہ بیان، سالانہ، ماہانہ اجتماعات کے بیانات کی تازہ آڈیوز فورا اپلیکیشن اور ویب سائیٹ پر آپ سن سکتے ہیں۔ آئی فون، ونڈوز موبائل اور کمپیوٹر والے حضرات یہ سب کچھ اوپر دی گئی ویب سائیٹ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

آپ کی سہولت کے لیے سلسلہ کی کوئی بھی کتاب یا کسی بھی پارہ کی تفسیر پی-ڈی-ایف میں آپ کو اپنے وٹس ایپ پر چاہیے ہو تو اس نمبر پر کتاب کا نام یا پارہ نمبر بتا کر اپنے وٹس ایپ سے میسج کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ 03235205255

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۲۲)

اور بلاشبہ ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کیلئے آسان کر دیا تو کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے

اکرم التراجم

قدرت اللہ کمپنی کے تیار کردہ دیدہ زیب قرآن پاک

شیخ المکرّم امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

کا تحریر کردہ آسان اور عام فہم زبان میں اردو ترجمہ

اب آپ ہماری ویب سائیٹ

www.naqashbandiaowasia.com پر بھی پڑھ سکتے ہیں

شیخ المکرّم کے تازہ ترین بیانات ہر جمعہ کی شام ہماری ویب سائیٹ

www.oursheikh.org پر سن سکتے ہیں